اولوالعزم انبیاء کے اسالیبِ دعوت

منتخب تفاسیر کی روشنی میں (تجزیاتی مطالعہ)

مقالہ نگار

کوثر شجاعت

ایم فل، علومِ اسلامیہ

نگران مقالہ

ڈاکٹر حافظ راؤ فرحان علی

لیکچرار، شعبہ علوم اسلامیہ،

نمل اسلام آباد

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

اکتوبر ۲۰۱۸ء

اولوالعزم انبیاء کے اسالیبِ دعوت

منتخب تفاسیر کی روشنی میں (تجزیاتی مطالعہ)

مقالہ نگار

کوثر شجاعت

ایم فل، علومِ اسلامیہ

نگران مقالہ

ڈاکٹر حافظ راؤ فرحان علی

لیکچرار، شعبہ علوم اسلامیہ،

نمل اسلام آباد

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

اکتوبر ۲۰۱۸ء

کوثر شجاعت ©

بسم الله الرحمن الرحيم

منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ

(Thesis and Defense Approval form)

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالہ کے دفاع کو جانچا ہے ،وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف سوشل سائنسز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالہ بعنوان: **اولوالعزم انبیاء کے اسالیب دعوت منتخب تفاسیر کی روشنی میں(تجزیاتی مطالعہ)**

(Preaching Methodologies of Resolute Prophets in the Light of Selected Tafaseer (Analytical Study)

نام ڈگری: ایم فل علوم اسلامیہ

نام مقالہ نگار: کوثر شجاعت

رجسٹریشن نمبر: 1025-MPhil/IS/S15

ڈاکٹر حافظ راؤ فرحان علی
(نگران مقالہ)
____
نگران مقالہ کے دستخط

پروفیسر ڈاکٹر صفیانہ خاتون ملک
(ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز)
____
ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز کے دستخط

بریگیڈئیر محمد ابراہیم
(ڈائریکٹر جنرل)
____
ڈائریکٹر جنرل کے دستخط

تاریخ: ________________

حلف نامہ فارم

(Candidate declaration form)

میں کوثر شجاعت ولد ملک محمد رمضان اعوان

رولنمبر: MP-S15-37 رجسٹریشن نمبر: 1025-MPhil/IS/S15

طالبعلم، ایم فل، شعبہ علوم اسلامیہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل) اسلام آباد حلفاً اقرار کرتی ہوں کہ مقالہ

بعنوان: اولوالعزم انبیاء کے اسالیب دعوت منتخب تفاسیر کی روشنی میں (تجزیاتی مطالعہ)

(Preaching Methodologies of Resolute Prophets in the Light of Selected Tafaseer (Analytical Study)

ایم فل علوم اسلامیہ کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے سلسلہ میں پیش کیا گیا ہے، اور **ڈاکٹر حافظ راؤ فرحان علی** کی نگرانی میں تحریر کیا گیا ہے، راقم الحروف کا اصل کام ہے، اور یہ کہ مذکورہ کام نہ تو کہیں اور جمع کروایا گیا ہے، نہ ہی پہلے سے شائع شدہ ہے اور نہ ہی مستقبل میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لئے کسی دوسری یونیورسٹی یا ادارے میں میری طرف سے پیش کیا جائے گا۔

نام مقالہ نگار: کوثر شجاعت

دستخط مقالہ نگار: ____________

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

فہرست موضوعات

نمبر شمار	ابواب فصول	موضوعات	صفحہ نمبر
۱.		منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ	iv
۲.		حلف نامہ فارم	v
۳.		فہرست موضوعات	vi
۴.		انتساب	viii
۵.		اظہار تشکر و امتنان	ix
۶.		مقدمہ	x
۷.	**باب اول**	**دعوت اور منتخب تفاسیر کا تعارف**	**۱**
۸.	فصل اول	دعوت کا معنی و مفہوم ضرورت و اہمیت	۲
۹.	فصل دوم	تفسیر کی ضرورت و اہمیت	۲۰
۱۰.	فصل سوم	منتخب تفاسیر کا تعارف اور خصوصیات	۳۳
۱۱.	**باب دوم**	**اولوالعزم انبیاء کے اسالیب دعوت (حصہ اول)**	**۵۸**
۱۲.	فصل اول	حضرت نوح علیہ السلام کے اسالیب دعوت تدبر قرآن کی روشنی میں	۵۹
۱۳.	فصل دوم	حضرت نوح علیہ السلام کے اسالیب دعوت تفہیم القرآن کی روشی میں	۷۹
۱۴.	فصل سوم	حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسالیب دعوت تدبر قرآن کی روشنی میں	۹۲
۱۵.	فصل چہارم	حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسالیب دعوت تفہیم القرآن کی روشنی میں	۱۲۴
۱۶.	**باب سوم**	**اولوالعزم انبیاء کے اسالیب دعوت (حصہ دوم)**	**۱۳۹**
۱۷.	فصل اول	حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسالیب دعوت تدبر قرآن کی روشنی میں	۱۴۰
۱۸.	فصل دوم	حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسالیب دعو تفہیم القرآن کی روشنی میں	۱۶۹
۱۹.	فصل سوم	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اسالیب دعوت تدبر قرآن کی روشنی میں	۱۸۱
۲۰.	فصل چہارم	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اسالیب دعوت تفہیم القرآن کی روشنی میں	۱۹۳
۲۱.	**باب چہارم**	**اولوالعزم انبیاء کے اسالیب دعوت (حصہ سوم)**	**۲۰۱**
۲۲.	فصل اول	حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسالیب دعوت تدبر قرآن کی روشنی میں	۲۰۱

۲۳.	فصل دوم	حضرت محمد ﷺ کے اسالیب دعوت تفہیم القرآن کی روشنی میں	۲۳۲
۲۴.	**باب پنجم**	**داعیان کرام کے اوصاف وذمہ داریاں**	**۲۵۲**
۲۵.	فصل اول	داعیان کرام کے اوصاف	۲۵۳
۲۶.	فصل دوم	داعیان کرام کی ذمہ داریاں	۲۷۵
۲۷.	فصل سوم	عصر حاضر میں داعیان کرام کو درپیش مسائل اور ان کا حل	۲۹۰
۲۸.		نتائج	۲۹۹
۲۹.		دور حاضر میں دعوت کی ترویج واشاعت کے لئے تجاویز واقدامات	۳۰۱
۳۰.		فہرست آیات قرآنی	۳۰۵
۳۱.		فہرست احادیث مبارکہ	۳۱۶
۳۲.		فہرست اعلام	۳۱۷
۳۳.		مصادر ومراجع	۳۱۸

انتساب

معلم اعلیٰ اور مبلغ اعظم

محمد رسول اللہ ﷺ

کی ذات گرامی کے نام

اظہار تشکر و امتنان

بے پناہ حمد و ثنا اللہ جل جلالہ کے لئے جس کی رحمت و برکت اور عظیم تر شفقت نے ہر لمحہ مجھے اپنے حصار میں رکھا ہے اور ہزاروں درود و سلام محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کے آل اطہار علیہم السلام اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر جن کی محبت و تکریم مسلمان کے دین کی بنیاد ہے میں صمیم قلب سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے اپنے خاص فضل و کرم سے مجھے دعوت و تبلیغ کے موضوع پر قلم اٹھانے کی توفیق بخشی اور میں یہ تحقیقی مقالہ لکھنے کے قابل ہوئی۔

مقالہ نگار شکر گار ہے اپنے تمام اساتذہ کرام کا جن کی دعاؤں رہنمائی اور تعاون نے ہر لمحہ میرے لئے نشان منزل کا کام کیا ہے۔ خصوصاً صدر شعبہ علومِ اسلامیہ ڈاکٹر سید عبدالغفار بخاری صاحب کا اور اپنے استاد محترم ڈاکٹر نور حیات خان صاحب کا اور ڈاکٹر سمیہ رفیق صاحبہ کا جنھوں نے اپنی خصوصی شفقت و محبت سے موضوع کے انتخاب اور اس پر تحقیق کے کئی عقدے میرے لئے حل کر دیئے۔ میں تہہ دل شکر گزار ہوں نگران مقالہ جناب حافظ ڈاکٹر حافظ راؤ فرحان علی صاحب کی جن کی شفقت اور مہربانی نے مجھے راہ تحقیق پر انگلی پکڑ کر چلایا ان کا شکریہ ادا کرنا الفاظ میں ممکن نہیں۔

استاد محترم نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود مسودہ کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں جس طرح میری رہنمائی فرمائی ان کی معاونت اور انتہائی قیمتی ہدایات میرے لئے بہت بڑا اعزاز اور سرمایہ افتخار ہے۔ نیز میرے شکریے کے مستحق ہیں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لنگویجز شعبہ علوم اسلامیہ کے وہ تمام اساتذہ جن سے میں نے ایک سال تک مختلف مضامین پڑھے ڈاکٹر سید عبد الغفار بخاری، ڈاکٹر نور حیات خان، ڈاکٹر حافظ اللہ یار مرحوم، ڈاکٹر حافظ راؤ فرحان علی، میڈم عافیہ مہدی صاحبہ ، پروفیسر ڈاکٹر عطااللہ فیضی صاحب ان تمام اساتذہ نے جس فراغ دلی سے استفادہ علم کے مواقع فراہم کئے ان کی مثال نہیں، گویا میرے اساتذہ کرام نے حق تدریس ادا کر دیا یہ میرے ان تمام اساتذہ کی تربیت کا کمال ہے کہ ان کو دیکھتے ہی آنکھیں خود بخود جھک جاتیں ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ میں شکر گزار ہوں اپنی والدہ محترمہ اور اپنی ساس کی جن کی دعائیں ہر قدم پر میرے ساتھ رہیں اور اپنے خاوند اور بچوں کی بھی جنہوں نے مجھے مکمل تعاون فراہم کیا۔ مقالے کی کمپوزنگ کے سلسلے میں جناب قاری محمد ابرار صدیقی کا تعاون بھی قابل ذکر ہے کہ جنہوں نے ہر مرحلے پر میرا ساتھ دیا اور وقت نکالا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں ان سب کو بہترین اجر عطا فرمائے اور مجھے اور تمام اہل اسلام کو دین کو پھیلانے والے بنادے۔

آمین ثم آمین

مقدمہ

۱)موضوع کا تعارف

دعوت الیٰ اللہ ایک ایسا جامع پروگرام ہے جو تعلیم و تعلم، تربیت نفس، اصلاح انسانیت اور دفع ضرر پر مشتمل ہے تبلیغ و دعوت امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلام کے جسم کی ریڑھ کی ہڈی ہے اس پر اسلام کی بنیاد، اسلام کی قوت ،اسلام کی وسعت اور اسلام کی کامیابی منحصر ہے مسلمان صرف اسی وجہ سے بہترین امت کہلاتے ہیں کہ وہ دعوت و تبلیغ کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ﴾[1]

ترجمہ: تم بہترین امت ہو تم لوگوں کے لئے نکالے گئے ہو تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو۔

انبیاء علیھم السلام اس دنیا اور آخرت کی وہ نورانی ہستیاں ہیں جو انسانی زندگی کے معیار ہیں ان کی بنیادی حیثیت اور فرض منصبی ہی (دعوت الیٰ اللہ) ہے تمام انبیاء کرام کی ذات گرامی داعیان حق کے لئے مشعل راہ ہیں در حقیقت دعوت الیٰ اللہ کی حیثیت ایک کہکشاں کی ہے جس میں لاتعداد ستارے چمک رہے ہیں تاریخ دعوت کا آغاز انبیاء سے ہوتا ہے اور اسی کو نقطہ عروج پر سرکار دوعالم سرور انبیاء حضور ﷺ پہنچاتے ہیں۔

دعوت و تبلیغ کا کام ہر دور میں کسی نہ کسی صورت میں جاری رہتا ہے اور انشاءاللہ تا قیامت جاری رہے گا تاہم انبیاء کرام دعوت الیٰ اللہ روشنی کے وہ مینار ہیں جن کے اسالیب دعوت سے آج کے داعیان کرام رہنمائی حاصل کرسکتے ہیں دور حاضر کے مسائل اور مسلمان قوم کا تشخص برقرار رکھنے کے لئے یہ بہت ضروری ہے بلکہ ناگزیر ہے کہ دعوت الیٰ اللہ کے کام کو اولوالعزم انبیاء کے اسالیب دعوت کی روشنی میں پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے تاکہ انسان انسانیت کی معراج کو پاسکے۔

---

(۱)سورۃ آل عمران ۳/۱۱۰

خود اللہ تعالیٰ سورۃ العصر میں زمانے کی قسم کھا کر فرماتے ہیں:

﴿ وَٱلۡعَصۡرِ ۝١ إِنَّ ٱلۡإِنسَٰنَ لَفِي خُسۡرٍ ۝٢ إِلَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ وَتَوَاصَوۡاْ بِٱلۡحَقِّ وَتَوَاصَوۡاْ بِٱلصَّبۡرِ ۝٣ ﴾[1]

ترجمہ: قسم ہے زمانے کی: بے شک انسان خسارے میں ہے مگر وہ لوگ نہیں جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اور آپس میں ایک دوسرے کو حق بات اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

میری زیر نظر تحقیق میں اس بات کی کوشش کی جاے گی اولوالعزم انبیا میں سے حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اسالیب دعوت کو منتخب تفاسیر کی روشنی میں سمجھا جائے تاکہ مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علما کرام کی رائے کو سمجھا جا سکے اور منشاے خداوندی کو بہتر طور پر جانا جا سکے اور دعوت کے کام کو اسالیب انبیا کی روشنی میں انجام دیا جا سکے

۲)موضوع کی ضرورت اوراہمیت:

دعوت الٰہی حق بات ہے یہی انبیا کی بعثت کا مقصد اور یہی امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اولین فرض ہے

اسکے بڑے فضائل میں بطور نمونہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پاک ہے جو انہوں نے حضرت علیؓ سے فرمایا

((فوا الله لان يهدى الله بک رجلا واحداً خير لكم حمر النعم))[2]

قسم بخدا! تمہارے ذریعے سے اللہ کا کسی ایک شخص کو ہدایت دے دینا تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

آیت مبارکہ اوراحادیث طیبہ سے ثابت ہوتا ہے کہ دعوت اور تبلیغ کی اہمیت اورداعیان حق کا مقام محتاج بیان نہیں

دور حاضر میں مسلمانوں کو آج سب زمانوں سے بڑھ کر اسکی ضرورت ہے کیونکہ آیات قرآنی کی روشنی میں مسلمان امت لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے جو نیکی کا حکم دیتی ہے اور برائی سے منع کرتی ہے اوراسی وجہ سے وہ بہترین امت کہلاتی ہے اور موجودہ دور میں جب برائیاں معاشرے میں سرائیت کرچکی ہیں اس

---

(۱)سورۃ العصر:۱۰۳/۱-۳

(۲) صحیح بخاری، ابوعبداللہ بن اسماعیل، دار ابن کثیر بیروت، طبع چہارم ۱۶۰۸ھ، حدیث نمبر ۲۱۰۸

کے تناظر میں اگر یہ کہا جائے کہ آج غیر مسلم کو مسلمان بنانے سے زیادہ اہم کام مسلمانوں کو مسلمان بنانا، پھر نام کے مسلمانوں کو کام کا مسلمان بنانا اور قومی مسلمانوں کو دینی مسلمان بنانا ضروری ہے کہ آج مسلمانوں کی حالت دیکھ کر قرآن کی یہ ندا:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ ءَامِنُوا۟﴾

پورے زور و شور سے بلند کرنا عصر حاضر کے مسائل کا واحد حل ہے کیونکہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جس کی اصل تعلیمات اور روح سے ہم مسلمان بھی غافل ہو چکے ہیں۔

دور حاضر میں جہاں فتنہ پرستی، لاقانونیت، فحاشی اور عریانی کا دور دورہ ہے ہر طرف مادہ پرستی اور جاہ پرستی کا عفریت اپنے پرَ پھیلا رہا ہے اور انسانیت سائنس اور ترقی کی آڑ میں تنزلی کے عمیق اندھیروں میں ڈوب رہی ہے اور اپنی پیدائش کے مقصد اور خالق کائنات کے احکامات سے دور ہو رہی ہے ایسے میں دنیا کو راہ راست پر لانے اور دنیا و آخرت کی ابدی کامیابیوں سے روشناس کروانے کا واحد اور حتمی راستہ دعوت دین کی سمجھ اور دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرنا ہے گویا یہ دعوت امت مسلمہ کے لئے لازمی ہے اس کے بغیر نہ مسلمان کی نجات ہے اور نہ ہی امت مسلمہ کی۔

دعوت الی اللہ کی تاریخ طویل بھی ہے اور صبر آزما بھی کیونکہ اسلام اس امر پر اکتفا نہیں کرتا کہ مسلم بذات خود ہدایت یافتہ اور صالح ہو بلکہ اسلام کی نظر میں اس کا مصلح اور ہادی ہونا بھی ضروری ہے یہی اس کی نجات کا اور کامیابی کا واحد ذریعہ ہے اور یہی امت محمدیہ ﷺ کی پیدائش کا مقصد بھی ہے۔

۳) بیان مسئلہ:

دعوت الی اللہ کا کام زمین پر تخلیق آدم سے ہی شروع ہو گیا تھا پھر ہر زمانے اور حالت کے تحت انبیاء کرام مبعوث کیے جاتے رہے یہاں تک کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے اور سب کا مقصد دعوت تبلیغ دین تھا۔ انبیاء کرام کے تاریخی حالات و واقعات پر بہت تفصیل سے لکھا جا چکا ہے اور "انبیاء کرام کی دعوت اور مخالفین کے طرز عمل" محمد عقیل بشیر صاحب نے (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی) میں کام کیا ہے تاہم عقیل صاحب نے صرف مخالفین کے طرز عمل کو بنیاد بنایا ہے اسی طرح عصر حاضر میں دعوت و تبلیغ میں ذرائع ابلاغ کے کردار پر عابدہ اقبال صاحبہ نے (نمل یونیورسٹی) میں کام کیا ہے جناب محمد شاہد رفیر صاحب نے پی ایچ۔ڈی کی سطح پر ۲۰۱۲ء میں دور حاضر میں "دعوت دین کی حکمت عملی" کے لیے پنجاب یونیورسٹی میں تحقیقی مقالہ لکھا ہے لیکن اس مقالے میں دعوت دین کی اہمیت اور مختلف دعوتی

تنظیموں کو زیر بحث لایا گیا ہے اس کے علاوہ دعوت کے موضوع پر مختلف کتابیں بھی لکھی گئیں۔ جیسا کہ "اسلام کی دعوتی قوت" لیاقت علی صاحب نے لکھی اسلام کی دعوت "مولانا سید جلال الدین صاحب" نے لکھی وغیرہ وغیرہ۔ میری اس زیر نظر تحقیق میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اولوالعزم انبیا کے اسالیب دعوت کا منتخب تفاسیر کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ عصر حاضر میں داعی حضرات میں کن اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے نیز دور حاضر کے داعیان کرام کو دعوتی کام میں کن مسائل کا سامنا ہے؟ لہذا میری یہ تحقیق انشاءاللہ عصر حاضر کے داعیان کرام کے لیے الوالعزم انبیاء کے اسالیب دعوت کو سمجھنے کے لیے روشنی کا ادنی سا نشان ثابت ہو گی۔

۴)سابقہ تحقیقات کا جائزہ:

دعوت الیٰ اللہ کا کام زمین پر تخلیق آدم ؑ سے ہی شروع ہو گیا تھا پھر ہر زمانے اور حالات کے تحت انبیاء کرام معبوث کئے جاتے رہے یہاں تک کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے اور سب کا مقصد دعوت تبلیغ دین تھا انبیاء کرام کے تاریخی حالات وواقعات پر لکھا جا چکا ہے اور" انبیاء کرام کی دعوت اور مخالفین کا طرز عمل" کے بارے میں محمد عقیل بشیر صاحب نے (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں) کام کیا ہے تاہم عقیل بشیر صاحب نے مخالفین کے طرز عمل کو بنیاد بنایا اس کے علاوہ عصر حاضر میں "دعوت و تبلیغ اور ذرائع ابلاغ کے کردار" پر بھی (نمل یونیورسٹی عابدہ اقبال صاحبہ) نے کام کیا ہے اسکے علاوہ جناب محمد شاہد رفیع صاحب نے پی ایچ ڈی کی سطح پر ۲۰۰۲ء میں دور حاضر میں دعوت دین کی حکمت عملی کے لئے پنجاب یونیورسٹی میں کام کیا لیکن اس مقالہ میں دعوت دین کی اہمیت اور عمومی حکمت عملی اور مختلف دعوتی تنظیموں کو زیر بحث لایا گیا ہے اس کے علاوہ "تبلیغ اسلام میں خواتین کے مبلغ انہ کردار" کے بارے میں حسینہ خان نے نمل یونیورسٹی میں اور یاسمین کوثر صاحبہ پنجاب یونیورسٹی میں ۱۹۹۰ء میں کام کیا دعوت کے موضوع پر مختلف کتابیں بھی لکھی گئیں "دعوت وارشاد" محمد عین الحق صاحب نے لکھی اسلام کی دعوت مولانا سید جلال الدین، "اسلام کی دعوتی قوت "لیاقت علی صاحب نے لکھی میری اس زیر نظر ادنی سی تحقیق میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اولوالعزم انبیاء کے طرز دعوت کا منتخب تفاسیر کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے لہذا میری تحقیق انشاءاللہ عصر حاضر کے مسائل کے حل کے لئے اولوالعزم انبیاء کے اسالیب دعوت کی روشنی میں عصر حاضر کے داعیوں کے لئے روشنی کا ادنیٰ سا نشان ثابت ہو گی۔

۵)مقاصد تحقیق:

اس موضوع پر تحقیق کے درج ذیل مقاصد ہیں

ا۔ اولوالعزم انبیاء کرام کے اسالیب دعوت کو جاننا۔

ب۔اولوالعزم انبیاءکے اسالیب دعوت کامنتخب تفسیری رجحانات کی روشنی میں جائزہ لینا ۔

ج-دعوتی نقطہ نگاہ سے قرآن فہمی کاشعور حاصل کرنا

۶) تحقیقی سوالات:

ا-اولوالعزم انبیاءکے اسالیب دعوت کوتدبر قرآن اور تفہیم القرآن پر دوتفاسیر میں کس طرح بیان کیاگیاہے؟

ب-عصرحاضر کے داعیان کرام کودعوت الی اللہ میں کس دعوتی منہج کوکیونکراپنانے کی ضرورت ہے؟

ج-داعیان کرام کودرپیش مسائل کیاہیں؟اوران کاحل کیونکرممکن ہے؟

۷)تحدید:

تمام انبیاءکرام چونکہ داعی بھی تھےاورمبلغ بھی ان میں سےہرایک امت کے لئےروشنی کامینارہیں تاہم مقالہ ہذامیں اولوالعزم انبیاء کرام حضرت نوح علیہ السلام،حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام،حضرت عیسیٰ علیہ السلاماورحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن کی دعوت کے بارےمیں قرآن پاک میں جابجا ذکر کیا گیا ہے چنانچہ صرف انہی تک محدودرہ کرمنتخب تفاسیر کی روشنی میں مطالعہ کیاجائے (انشاءاللہ)۔

۸)اسلوب تحقیق:

ا-اسلوب تحقیق بیانیہ اورتجزیاتی اختیارکیاگیاہے۔

ب۔ آیات کاترجمہ متعلقہ تفسیرسے لیاگیاہے۔جو آیات تدبر قرآن کی فصول میں لکھی گئی ہیں ان کاترجمہ تدبر قرآن سے لیاگیاہے اوار یہی طرز تفہیم القرآن میں اپنایاگیاہے۔

ج۔احادیث کے ترجمہ میں مترجم احادیث کی کتب سے استفادہ کیاگیاہے۔

Abstract

The title of my thesis is "Preaching Methodologies Resolute Prophets in the Light of selected Tafseer (Tafheem ul Quran & Tadabur e Quran (Analytical Study).

Preaching of Islam "Dawah" is a great and noble task of Prophets, which result in unity and congregation in presell. Message of Allah "Dawah" can be succeeded when preachers impact the message according to the course and custom of Prophets.

For the purpose of define famous Tafseer (Tafheem ul Quran) interpretation and Explanation of Quran and Tafseer (Tadabur e Quran) because of both of these interpretations are in rationale style. The method of Research is qualitative and descriptive.

In first chapter of thesis I defined the meaning and importance of "Dawah" and short introduction of selected Tafseer. In second chapter of thesis methods of resolute Prophets Hazrat Nooh (عليه السلام) and Harzat Ibrahim (عليه السلام) are explained in the light of exegesis of Quran. In third chapter strategies of resoluite Prophets Hazrat Musa (عليه السلام) and Hazrat Muhammad (صلى الله عليه وسلم) are described accordingly to Tafheem ul Quran, Tadabur e Quran as well. In the last chapter attributes of the preachers in present times, their responsibilities the problems they are facing and solutions to those problems are defined in the end suggested are presented to promote preaching of Islam.

Everyone should play his role individually and collectively in "Dawah". Government should take part in this regard.

باب اوّل

دعوت اور منتخب تفاسیر کا تعارف

فصل اول	دعوت کا معنیٰ و مفہوم ضرورت واہمیت
فصل دوم	تفسیر کا معنیٰ و مفہوم ضرورت واہمیت
فصل سوم	منتخب تفاسیر کا تعارف اور خصوصیات

فصل اوّل

دعوت کا معنی و مفہوم ضرورت واہمیت

دعوت کالغوی مفہوم:

لفظ دعوۃ کامادہ د-ع-و ہے۔ اور باب نَصَرَیَنْصُر سے ہے۔

i. **الازہری** [1] لکھتے ہیں کہ الدعا کے معنیٰ "مدد کرنا" بھی ہیں جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے

﴿وَٱدۡعُواْ شُهَدَآءَكُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ إِن كُنتُمۡ صَٰدِقِينَ﴾ [2]

ترجمہ: اور بلالو اپنے حمایتیوں کو اگر تم سچے ہو۔

ii. **امام راغب اصفہانی** [3] لکھتے ہیں کہ "الدعاء" اگر "الیٰ شیء" کے ساتھ آئے تو اس کے معنیٰ کسی چیز کا قصد کرنے پر رغبت دلانے اور اکسانے کے ہیں [4]

iii. **المعجم الوسیط کے مطابق**

دعوت کے لفظی معنیٰ پکارنا یا بلانا ہے اسکی جمع دعوات ہے۔ [5]

iv. **انگلش ڈکشنری** کے مطابق

Carring the message of Islam to non-believers.[6]

v. **لسان العرب میں دعوت کے معانی:**

لسان العرب میں اس کے معانی پکار، اعلان، بلانا، منادی کرانا کے ہیں۔ [7]

دعوت کا اصطلاحی مفہوم:

---

(۱) الزہری (۱۲۴-۵۰) ابو بکر محمد بن عبد اللہ بن شہاب، زہرہ بن قلاب کی طرف سے منسوب ہیں جو ان کے جد اعلیٰ ہیں۔ اس لیے زہری

(۲) البقرۃ: ۲/۲۳

(۳) آپ کا نام ابو القاسم محمد بن راغب اصفہانی ہے۔ آپ کا شمار گراں قدر علماء میں ہوتا ہے۔ آپ کی تصانیف میں سے کتاب مفردات القرآن کو علمی حلقوں میں بہت شہرت حاصل ہے۔۔ (تاریخ و تدوین تفسیر، ذاکر شاہ، زاویہ پبلشرز، اچھرہ، لاہور، ۱۹۹۸، ص ۳۱۲)

(۴) راغب، المفردات فی غریب القرآن، امام راغب اصفہانی، ۱/۳۳۲، ۳۳۳

(۵) المعجم الوسیط، ابراہیم مصطفیٰ، مئی ۱۹۷۲ء، ص ۱۷۰۶

(6)Oxford English dictionary page no.212

(۷) لسان العرب، ابن منظور، دار صادر بیروت، ۱۹۵۲، ص ۶۰۳

اصطلاح میں دعوت وہ پیغام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعے انسان کو دیا ہے وہ دین حق کو پہچانے اور سچا مانے اور اسے لوگوں کو پہنچادے۔

i. اس سلسلے میں **دائرہ معارف الاسلامیہ** میں درج ذیل تعریف پائی جاتی ہے،

"دعوۃ" وہ پیغام ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسولوں کے توسط سے انسانوں کو دیا ہے کہ دین کو سچا مانو۔ [۱]

ii. **ڈاکٹر احمد غلوش[۲] رقمطراز ہے۔**

"دعوت سے مراد اسلام کی طرف عملی و قولی کوششوں سے بلانا ہے تاکہ لوگوں کو اس کی طرف مائل کیا جاسکے۔"[۳]

iii. **شیخ علی محفوظ[۴] لکھتے ہیں:**

"دعوت لفظ "الدعاء" سے ماخوذ ہے اس کے معنی کسی چیز کی طرف بلانا یا کسی چیز کے حاصل کرنے پر ابھارنا ہے تاکہ وہ دنیا اور آخرت کی سعادت سے مستفیض ہو سکے۔"[۵]

iv. دعوت و تبلیغ کے حوالے سے پروفیسر **T.W Arnold**[۶] کہتے ہیں:

دعوت و تبلیغ ایمان والوں کے دلوں میں سچائی کا وہ جوش ہے جو ان کو اطمینان سے نہیں رہنے دیتا جب تک کہ وہ اپنا پیغام ہر فرد و بشر تک نہ پہنچادیں اور تمام بنی نوع انسان اس چیز کو تسلیم نہ کریں جسے وہ برحق یقین کرتے ہیں۔[۱]

---

(۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، زیر اہتمام دانشگاہ پنجاب لاہور، طبع اول ۱۹۷۲ء، ۹/ ۳۳۴

(۲) ڈاکٹر احمد غلوش اکتوبر ۱۹۳۶ء میں منیۃ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق مصر سے ہے۔ جامعہ الازہر مصر سے اصول دین کی ڈگری حاصل کی ہے۔ وزارت اوقاف میں ملازمت حاصل کی اور امامت و خطاب کے عہدے پر فائز رہے۔

(www./ahaon/ine.com/articles/view/55515.htm)

(۳) دعوۃ الاسلامیہ اصولھا وسائلھا، ڈاکٹر احمد عبد اللہ، دار الاشاعت، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۳۱۲

(۴) شیخ علی محفوظ کا تعلق مصر کے مشہور شہر طنطہ سے تھا۔ ۱۳۰۶ھ میں جامع احمدی میں تجوید قرآن کے حصول کے لیے داخلہ لیا۔ ۱۳۱۷ھ میں جامعۃ الازہر میں تحصیل علم کے لیے تشریف لے گئے اور مذہب حنفی کو اختیار کیا اگرچہ پہلے آپ شافعی المذہب تھے۔ ۳۲۴میں شھادہ العالمیہ جو کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے برابر ہے، حاصل کی ۱۳۶۱ھ کو آپ کی وفات ہوئی۔

(www.a/ukah.net/auihors/view./home/696/)

(۵) ھدایۃ المرشدین، شیخ علی محفوظ، دار الاعتصام مصر ۱۳۔

(۶) تھامس واکر ارنلڈ: (۱۹۳۰، ۱۸۶۲) مشہور مغربی فلاسفر ہیں، لندن میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی اور سنسکرت زبان بھی سیکھی۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ اور بعد ازاں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ علامہ اقبال کے فلسفے کے استاد تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں پریچنگ آف اسلام اور دین انسانیت بہت مشہور ہیں۔ (www.lahaonline.com/articles/view/55515.htm)

الغرض دینی اصطلاح میں دعوت وہ پیغام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے توسط سے انسانوں کو دیا ہے، انبیاء کرام نے یہ پیغام بغیر کسی ردّوبدل کے پہنچایا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد اسکی تجدید تھا۔

دعوت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اسے چند اعمال پہ منحصر نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک دعوت کے اطلاق کی بات ہے تو اس سے مراد ہے لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلانا۔ یہ بلانا خواہ قلم سے ہو خواہ زبان کے ذریعے ہو۔ مقرر اپنی زبان سے لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہے۔ مجاہد اپنی تلوار سے۔ موذن اپنی اذان سے اور سخی اپنے مال سے۔

دعوت کی ضروت اور اہمیت:

پورا قرآن دعوت:

دعوت کا بنیادی ماخذ

قرآن پاک سراسر دعوت ہے۔ سارے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت اور اپنی دعوت کا تذکرہ کیا ہے۔ ان تذکروں کا مقصد اللہ تعالیٰ کی ہم سے چاہت ہے کہ میرے بندے خاص داعی بن جائیں خود بھی عمل کریں اور میرے احکامات کو دور دور پہنچائیں۔ اس وجہ سے پورے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دعوت کا تذکرہ کیا ہے۔ جن کا سرسری اور مختصر جائزہ پیش خدمت ہے

i. سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو دعوت دی ہے۔

ii. سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کو دعوت دیتے ہوئے فرمایا کہ

"﴿الٓمٓ ۝١ ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ﴾" خدا ایک ہے تین نہیں۔

iii. اس کے بعد سورۃ المائدہ، سورۃ النساء ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے قبائل عرب کو دعوت دی۔

iv. اس کے بعد سورۃ الانعام میں ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے مجوسیوں کو دعوت دی جو یہ کہتے تھے خدا دو ہیں ایک نیکی کا ایک بدی کا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ وَجَعَلَ ٱلظُّلُمَٰتِ وَٱلنُّورَ﴾(۲)

(۱) دعوت اسلام، ٹی ڈبلیو ارنلڈ، مترجم شیخ عنایت اللہ، وزارت مذہبی اوقاف، لاہور پنجاب ۲۰۰۳، ص ۲۳۔

(۲) سورۃ انعام: ۶ / ۱

یعنی بدی اور نیکی کا خالق بھی میں ہی ہوں۔

v. اس کے بعد سورۃ الاعراف ہے

اس میں اللہ تعالیٰ نے اقوام عالم کو دعوت دی ہے کہ اے پوری دنیا کے انسانو! میں تمہیں اپنی طرف بلاتا ہوں۔

vi. اس کے بعد سورۃ الانفال ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے دعوت کے ۱۱۴ اصول بتائے۔ دعوت بھی دی اصول بھی بتائے۔

vii. اس کے بعد سورۃ التوبہ ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے اعلان جنگ کیا ہے کہ یا تو میری دعوت کو مانو یا پھر اعلان جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔[1]

غرض کہاں تک بیان کیا جائے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ پورا قرآن دعوت ہے۔

دعوت الی اللہ منصب انبیاء:

تمام رسولوں اور جملہ انبیاء نے اللہ کی جانب بلانے اور دعوت کا فریضہ سر انجام دیا ہے انکی دنیا میں آمد کا مقصد ہی دعوت و تبلیغ تھا۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنے ہادی اور رسول بھیجے اور محض اس کے لیے کہ لوگوں پر حق پوری طرح آشکار ہو جائے کفر و شرک اور گمراہی پر باقی رہنے کے لیے لوگوں کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کے اندر نبی اور رسول بھیجے جنھوں نے اپنی قوم کو ان کی زبان میں تبلیغ کی۔ تاکہ لوگوں پر حق اچھی طرح واضح ہو سکے۔

"انبیاء کرام نے اپنی زندگیاں اسی مقصد میں صرف کر دیں۔ جن باتوں کی دوسروں کو دعوت دی انھیں خود بھی کر کے دکھایا۔ اور انکے ساتھیوں نے بھی اپنی عملی زندگی میں ان کا مظاہرہ کیا۔ یہ سارا اہتمام محض اس غرض کے لیے کیا گیا کہ خلق کو خالق کی رضا حاصل کرنے اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جو کچھ جاننا چاہیے۔ اس کے بتانے میں کسی پہلو سے کوئی کسر نہ رہ جائے اور لوگ قیامت کے دن اپنی شرارتوں اور بدعملیوں کا الزام اللہ سبحانہ تعالیٰ پہ نہ ڈال سکیں"۔[2]

دعوت انبیاء کا مشن ہے اور یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ کی جو حیثیت ان کی تمام حیثیتوں سے زیادہ نمایاں اور ممتاز ہے وہ داعی الی الحق کی حیثیت ہے۔ اسلام ایک دعوت ہے جو انسانوں کو اللہ کے دین کی طرف بلاتا ہے اور ان کی زندگیوں کو نور الٰہی سے منور کرتا ہے۔ اسلام ایک مکمل دین مکمل ضابطہ حیات ہے۔ انبیاء علیہم السلام وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جو اس عظیم دعوت

---

(۱) تبلیغ بالیقین کارِ نبوت ہے، حافظ فضل الرحیم، سید نفیس حسن شاہ، نوید پبلیشرز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۰۸

(۲) دعوت دین اور اس کا طریق کار، امین احسن اصلاحی، لاہور، فاران فاونڈیشن ۲۰۰۸، ص ۳۰، ۳۹

کے داعی اور اس تحریک کے قائد ہیں جن کی رہنمائی میں یہ اصلاحی جدوجہد برپا ہوئی اور جس سلسلہ مذہب کی آخری کڑی حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم ہیں۔

دعوت منصب انبیاء ہے کیونکہ دین وہ الہامی ضابطہ حیات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ اور منتخب بندوں کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا ہے۔ جس طرح اللہ نے انسانوں کی جسمانی ربوبیت کے لیے اس دنیا میں ہر قسم کی چیزیں پیدا کی ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی روحانی ربوبیت کے لیے سلسلہ انبیاء علیہم السلام جاری کیا پھر حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم پر اس سلسلہ نبوت کو ختم کر دیا گیا۔ اب دنیا میں کوئی نبی کوئی پیغمبر نہیں آئے گا اب یہ کام امت محمدیہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا ہے اور ہمیں دعوت و تبلیغ میں انبیاء کرام علیہم السلام کے طریقہ دعوت کو مشعل راہ بنانا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی[1] اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں:

"ہماری عقل تو ان ہی برگزیدہ بندوں کی روشنی کے بغیر بے کار ہے اور ہمارا سچ انکی تقلید کے بغیر ذلیل و خوار ہے عقل اگرچہ حجت ہے لیکن ناتمام اور نابالغ ہے۔ حجت بالغہ صرف انبیاء کی نبوت اور ان کا طریقہ دعوت ہے۔"[2]

غرض تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دی ہے اور اس ذات واحد کے سوا ہر ایک شے کی عبادت سے برات کا اظہار کیا ہے، اور اللہ کے یہ منتخب بندے ہمیشہ دعوت الی اللہ کے فرائض انجام دیتے رہتے ہیں۔

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾[3]

ترجمہ؛ اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔

اولوالعزم انبیاء اور منہاج دعوت و تبلیغ:

اولوالعزم کا لفظ العزم سے ہے جس کے معنی ہیں تہیہ، پختہ ارداہ، ضبط و تحمل۔

اولوالعزم انبیاء اللہ کے وہ پیغمبر ہیں جنہوں نے دعوت الی اللہ کی راہ میں کمال ضبط و تحمل سے کام لیا۔[1]

(۱) حضرت مجدد الف ثانی ۹۷۱ھ یعنی ۲۶ جون ۱۵۶۴ء میں سرہند میں پیدا ہوئے۔ آپ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ نے اس سلسلہ میں تصوف کی اشاعت کی جو شریعت سے قریب ترین ہے۔ آپ نے رد بدعت کی پوری کوشش کی جس کے نتیجے میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ آپ ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ بمطابق ۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء کو انتقال فرما گئے۔

(۲) سیرت سید البشر صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم، چوہدری غلام رسول، مکتبہ علم و عرفان، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۸۸

(۳) سورۃ النحل: ۱۶/ ۳۶

دنیامیں حضرت آدم علیہ السلام سے جو رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اس کو اولوالعزم انبیاء آگے بڑھاتے ہیں یہاں تک کہ اس کو نقطہ کمال تک پہنچا دیتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ انسانی کمالات خواہ کتنے ہی بلند کیوں نہ ہوں حوادث زمانہ کے زیر اثر انحطاط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں اسکی طرف اشارہ ملتا ہے کہ کسی تجدیدی کوششوں کے بغیر طویل زمانے کا گزرنا دلوں کی سختی کا باعث بن جاتا ہے۔ اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے پے در پے انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیجا تاکہ یہ اپنی تعلیمات سے حق و باطل کو واضح کر دیں۔ سورۃ احزاب میں ارشاد ہے،

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ مِيثَٰقَهُمْ وَمِنكَ وَمِن نُّوحٍ وَإِبْرَٰهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ٱبْنِ مَرْيَمَ ۖ وَأَخَذْنَا مِنْهُم مِّيثَٰقًا غَلِيظًا﴾ (۲)

ترجمہ: اور جب ہم نے تمام پیغمبروں سے ان کا اقرار لیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اور نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام اور عیسی ابن مریم علیہ السلام سے بھی۔ اور ہم نے ان سب سے خوب پختہ عہد لیا۔

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں امین احسن اصلاحی صاحب لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر خوف و اندیشے سے بے پرواہو کر وحی الہی کی پیروی اور اسکی دعوت کی جو ہدایت کی گئی ہے اس کو اولوالعزم انبیاء کی تاریخ سے مزید موثق کر دیا گیا ہے، مطلب یہ کہ جو ہدایت ہم تمہیں کر رہے ہیں اسکی ہدایت ہم نے اپنے تمام انبیاء کو بھی کی کہ وہ خود بھی اسکی پیروی کریں اور اس پیغام کو بے کم و کاست لوگوں تک پہنچائیں، فرمایا کہ یہ میثاق ہم نے تم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی لیا، نوح علیہ السلام سے بھی ابراہیم علیہ السلام سے بھی اور موسیٰ علیہ السلام سے بھی اور عیسی ابن مریم علیہم السلام سے بھی۔ یہاں پر جلیل القدر اولولعزم انبیاء کا حوالہ دے کر انبیاء کی تاریخ سامنے رکھ دی گئی۔ (۳)

اور یہی وہ اولولعزم انبیاء ہیں جنکی دعوت و تبلیغ اور جنکی آفاقی تعلیمات نے دنیا کو رشد و ہدایت کی نئی جہتوں سے روشناس کروایا۔ ان انبیاء کا مختصر تعارف یہ ہے:

حضرت نوح علیہ السلام:

(۱) المعجم الوسیط، ابراہیم مصطفیٰ، ص۱۰۷۹

(۲) سورۃ الاحزاب: ۳۳/۷

(۳) تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، فاران فاونڈیشن، لاہور، ۶/۱۷۷

حضرت نوح علیہ السلام کو آدم ثانی کہا جاتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلے نبی ہیں جن کو رسالت سے سرفراز کیا گیا۔

حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ قرآن پاک میں ۴۳ مختلف مقامات پر آیا ہے۔ تاریخ دعوت میں نوح علیہ السلام کی ذات بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ نوح علیہ السلام اولین اولوالعزم رسول ہیں جنھیں قرآن نے بطور ماڈل پیش کیا۔

﴿فَٱصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُو۟لُوا۟ ٱلْعَزْمِ مِنَ ٱلرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ﴾ (۱)

پس ثابت قدم رہے جس طرح صاحب عزم رسول ثابت قدم رہے اور ان کے لیے جلدی نہ کرو۔

ان آیات مبارکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر واستقامت کی تلقین کی گئی ہے کہ جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہمارے اولوالعزم رسولوں نے عزم وہمت کا مظاہرہ کیا اس طرح آپ بھی کریں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی شخصیت اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ نسل آدم علیہ السلام کے بگاڑ پر پہلی تنبیہ انہی کے ذریعے ہوئی۔

حضرت نوح علیہ السلام کی شخصیت اس لیے بھی اہم ہے کہ آپ علیہ السلام نے دنیا کو دعوت و تبلیغ کے جس اعلی منہاج سے روشناس کروایا وہی کم وبیش وقت اور زمانے کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے تمام دعاۃ نے اسکی پیروی کی۔ تاریخ انسانی میں حضرت نوح علیہ السلام کا کردار دعوت کے کام اور عمل میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ علیہ السلام پہلے رسول اور اولین داعی الی اللہ ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام بین الاقوامی دعوت کے علمبردار:

دعوت الی اللہ کے سلسلے میں حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جس شخصیت کو نمایاں مقام حاصل ہے وہ حضرت ابراھیم علیہ السلام ہیں۔ قرآن مجید کی ۲۵ سورتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔ (۲)

چونکہ اسلام، عیسایئت اور یہودیت تینوں الہامی مذاہب ہیں۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے یہ تینوں مذاہب آگے چلے اور بڑھے جسکی وجہ سے آپکو بین الاقوامی دعوت کے علمبردار کہا جاتا ہے۔

حضرت ابراھیم علیہ السلام کی اولاد میں نبوت اور حکومت قائم رہی لیکن دعوتی نقطہ نظر سے حضرت ابراھیم علیہ السلام کی شخصیت ان کے پروگرام اور دعوت کی کامیابی اور شخصیت کی عظمت کے لحاظ سے اگر کوئی اس معیار پر پورا اترتا ہے تو وہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے۔ اس لیے تعمیر کعبہ کے وقت آپ علیہ السلام نے ذریتہ اسماعیل علیہ السلام کے سلسلے میں جو دعا کی تھی وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے متعلق تھی وہ دعا گویا ابراھیم علیہ السلام کی امامت کی تکمیل اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کا اہتمام تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام:

---

(۱) سورۃ الاحقاف: ۴۶ / ۳۵

(۲) دعوت وارشاد، محمد عین الحق، ایورنیو بک پیلس، اردو بازار لاہور، ص ۹۸

قرآن پاک نے جن انبیاء کو اولوالعزم کہا ہے ان میں موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت نمایاں مقام رکھتی ہے۔ قرآن پاک کی ۳۶ سورتوں میں ان کا ذکر آیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت ایک معجزانہ شخصیت ہے۔ قرآن کریم میں اتنا تذکرہ کسی نبی کا نہیں جتنا کہ موسیٰ علیہ السلام کا ہے کہ ۱۳۰ جگہ پر آپ علیہ السلام کا نام آیا ہے۔

یوں تو تمام انبیاء کار دعوت میں اللہ تعالیٰ کی خصوصی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام کو اس توجہ کا کچھ زیادہ ہی حصہ نصیب ہوا جسکی وجہ سے انکی ذاتی زندگی اور ان کے کار دعوت میں نصیحت وہدایت کا بڑا سامان موجود ہے۔ جو آج کل کے داعیان کرام اور آئندہ آنے والے داعیان کرام کے لیے مشعل راہ ثابت ہو گا۔ قرآن مجید نے موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا مقصد ہی عبرت ونصیحت اور دعوت وارشاد ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام دریائے نیل کے کنارے مصر میں اسی قسم کے مادہ پرستانہ معاشرے میں مبعوث ہوئے اس قوم کے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس مقدس فریضے کو قبول کر کے اپنی قوم کو دوبارہ بلندیوں کی طرف اٹھانا شروع کیا اگرچہ آپ علیہ السلام کا مخاطب دنیا کی اکھڑ ترین قوم تھی۔ جسکی رہنمائی اور جسے دعوت حق کی طرف بلانے کے لیے آپ علیہ السلام کو بہت سے مصائب برداشت کرنا پڑے تاہم آپ علیہ السلام کے پایہ استقلال میں لغزش نہ آئی۔ آپ علیہ السلام کے اسالیب دعوت میں عزم واستقلال نمایاں ہے۔

دعوت وتبلیغ کا نقطۂ عروج

دعوت وتبلیغ کی معراج سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم :

امام الانبیاء سرور کائنات نے دعوت وتبلیغ کو اسکی معراج تک پہنچایا۔ اور صرف ۲۳ سال کے عرصے میں دعوت وتبلیغ سے ایک جاہل قوم کی کایاپلٹ دی۔ پیر کرم شاہ الازہری[1] لکھتے ہیں۔

"اپنے رب کا یہ حکم ملتے ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کمر ہمت باندھ لی، حق کا علم بلند کرنے۔ ظلمت کدہ عالم کو نور توحید سے منور کرنے باطل کو ہر میدان میں شکست فاش دینے کے لیے یتیم مکہ نے عزم مصمم کر لیا۔ بادیہ ضلالت میں صدیوں سے بھٹکنے والے قافلہ انسانیت کو منزل مراد تک پہنچانے کے لیے جو قدم اٹھا وہ ہمیشہ آگے ہی بڑھتا گیا۔ مخالفت کا کوئی طوفان اسکی برق رفتاری کو متاثر نہ کر سکا، عداوت وحسد کے کتنے ہی آتش کدے بھڑکائے گئے لیکن اس بشیر ونذیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

(۱) پیر کرم شاہ جولائی ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا شجرہ بہاء الدین زکریاؒ سے ملتا ہے۔ آپ نے جامعۃ الازہر مصر سے ایم۔ فِل کی ڈگری حاصل کی۔ پاکستان میں وفاقی شرعی عدالت کے جج رہے۔ ان کو پاکستان کی طرف سے ستارہ امتیاز اور مصر سے حسن کارکردگی کا میڈل ملا۔ ضیاء القرآن کے مصنف ہیں اور ضیائے حرم کے ایڈیٹر بھی رہے۔ (ماہنامہ ضیائے حرم، ضیائے امت، ص ۴۷۷)

مبارک قدموں کی برکت سے وہ گلستانوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ تند و تیز آندھیاں اس کے روشن کیے ہوئے چراغوں کو بجھانہ سکیں۔ اس کے جاں نثاروں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے لیکن انکی حوصلہ مندیوں میں ذرا فرق نمایاں نہ ہوا"۔ (۱)

حضور ﷺ کے اپنے ارشادات میں تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی بڑی فضیلت آئی ہے اور آپ ﷺ نے اپنے پیروؤں کو تبلیغ کا حکم دیا ہے۔

((فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:مَنْ دَلَّ عَلَى خَيْرٍ فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهِ)) (۲)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے بھلائی کی طرف رہنمائی کی اسے بھلائی کرنے والے کے برابر ثواب ملتا ہے۔

(۲) نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ:وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ المُنْكَرِ أَوْ لَيُوشِكَنَّ اللَّهُ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِنْهُ ثُمَّ تَدْعُونَهُ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُم) (۳)

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے تمھیں نیکی کی ضرور ہدایت کرنی ہوگی اور برائی سے ضرور روکنا ہوگا ورنہ عین ممکن ہے کہ اللہ تم پر اپنی طرف سے عذاب بھیجے پھر تم اسے پکارو اور تمہیں جواب نہ آئے گا"۔

حضور ﷺ نے دعوت و تبلیغ کو مزید ان الفاظ مبارک سے اجاگر کیا۔

((قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ:فِتْنَةُ الرَّجُلِ فِي أَهْلِهِ وَمَالِهِ وَجَارِهِ، تُكَفِّرُهَا الصَّلاَةُ، وَالصَّدَقَةُ، وَالأَمْرُ بِالْمَعْرُوفِ، وَالنَّهْيُ عَنِ المُنْكَر)) (۴)

رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا آدمی سے بیوی مال اولاد اور پڑوسی کے متعلق احکامات کو پورا کرنے کے سلسلے میں جو کوتاہیاں اور گناہ ہو جاتے ہیں ان کا نماز صدقہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کفارہ بن جاتے ہیں۔

غرض نبی کریم ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں دعوت و تبلیغ کا فریضہ نہ صرف انجام دیا بلکہ اسے نقطہ عروج تک پہنچایا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے:

---

(۱) ضیاء النبی، پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن پبلشرز، لاہور، ۲/۳۱۸۔

(۲) صحیح مسلم، ابو الحسن مسلم بن حجاج القشیری النیشاپوری، کتاب الامارۃ، باب فضل اعانۃ الغازی، حدیث نمبر ۱۸۹۳

(۳) سنن ترمذی، ابو عیسی ترمذی، ابواب الفتن، ماجاء فی الامر بالمعروف، دار احیاء التراث العربی، بیروت، حدیث نمبر ۲۱۶۹

(۴) صحیح بخاری، ابو عبد اللہ بن اسماعیل، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ والاسلام، حدیث نمبر ۳۵۸۶

﴿ قُلْ هَٰذِهِۦ سَبِيلِيٓ أَدْعُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا۠ وَمَنِ ٱتَّبَعَنِيۖ وَسُبْحَٰنَ ٱللَّهِ وَمَآ أَنَا۠ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ﴾(۱)

آپ کہہ دیجئے یہ میری راہ ہے میں اور میری اتباع کرنے والے پورے یقین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دے رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں۔

تفسیر طبری میں آیت مبارکہ کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ

"آپ ﷺ کے ہر اتباع کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ اسی کی طرف دعوت دے جس کی طرف آپ ﷺ نے دعوت دی۔ قرآن کے ساتھ وعظ و نصیحت کرے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے کاموں سے منع کرے۔(۲)

(۴) حضور ﷺ کا فرمان ہے:

(قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا، وَيُوَقِّرْ كَبِيرَنَا، وَيَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ)) هَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ)(۳)

رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ شخص ہماری اتباع کرنے والوں میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے ہمارے بڑوں کا احترام نہ کرے نیکی کا حکم نہ کرے اور برائی سے منع نہ کرے۔

((عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: إِيَّاكُمْ وَالْجُلُوسَ بِالطُّرُقَاتِ»فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! مَا لَنَا بُدٌّ مِنْ مَجَالِسِنَا نَتَحَدَّثُ فِيهَا، فَقَالَ: رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «فَإِذَا أَبَيْتُمْ إِلَّا الْمَجْلِسَ فَأَعْطُوا الطَّرِيقَ حَقَّهُ» قَالُوا: وَمَا حَقُّ الطريق يا رسو الله، قَالَ: «غَضُّ الْبَصَرِ، وَكَفُّ الْأَذَىٰ، وَرَدُّ السَّلَامِ وَالْأَمْرُ بِالْمَعْرُوفِ، وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ))(۴)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم راستوں میں نہ بیٹھا کرو صحابہ کرامؓ نے فرمایا یا رسول اللہ ﷺ ہمارے لئے ان راستوں میں بیٹھنا ضروری ہے ہم وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمایا اگر بیٹھنا ہے تو راستے کے حقوق ادا کیا کرو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ راستے کے

(۱) سورۃ یوسف: ۱۲/۱۰۸

(۲) تفسیر الطبری، امام محمد بن جریر طبری، مکتبہ دانیال پبلشرز، ۱۹۹۸ء، ۲/۲۹۰

(۳) سنن ترمذی، محمد بن عیسیٰ ترمذی، داراحیاء القرآن العربی، ابواب البر الصلہ، باب ماجائی رحمۃ البیان، حدیث نمبر ۱۹۲۱

(۴) صحیح مسلم، ابوالحسین مسلم بن حجاج القشیری النیشاپوری، کتاب الباس والزینۃ، باب عن الجلوس، حدیث نمبر ۲۱۲۱

حقوق کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا نگاہوں کو نیچے رکھنا تکلیف دہ چیزوں کو راستے سے ہٹا دینا، سلام کا جواب دینا نیکی کی نصیحت کرنا اور برائی سے روکنا۔

دعوت و تبلیغ امت محمدیہ ﷺ کا فرض اولین:

دعوت و تبلیغ وہ فریضہ رسالت ہے جسکی وجہ سے اس امت کو "خیر امت" کہا گیا ہے۔ اگر خدانخواستہ مسلمان اس فرض منصبی کو بھلا دیں تو اس صورت میں یہ دنیا کی قوموں میں اس سے بس ایک قوم ہیں۔ دعوت و تبلیغ امت محمدیہ ﷺ کا فرض ہے اگر وہ اس فرض کو فراموش کر دیتے ہیں تو وہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک معتوب قوم بن جائیں گے جس طرح دنیا کی دوسری قومیں جو اللہ کی طرف سے کسی منصب پر سرفراز کی گئی تھیں اور اپنا فرض انجام نہ دینے کی وجہ سے معتوب ہو گئیں مسلمانوں کے اخیر امت ہونے کا جس آیت مبارکہ میں ذکر کیا گیا ہے اسی میں ان کی ذمہ داری بھی واضح کر دی گئی ہے،

﴿ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ﴾ [۱]

تم بہترین امت ہو لوگوں کے لیے مبعوث کیے گئے ہو معروف کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

قرآن حکیم نے امت مسلمہ کی تعریف کو دو الفاظ میں بیان کر دیا امر بامعروف و نہی عن المنکر یعنی امت مسلمہ ایک تعمیری مثبت اور متحرک جماعت کا نام ہے جو تطہیر معیشت، تطہیر سیاست، تطہیر معاملات کی دعوت دینے اور قیام حق وعدل کے فریضہ پر مامور ہے۔ [۲]

مندرجہ بالا نصوص سے یہ واضح ہوتا ہے دعوت و تبلیغ امت مسلمہ کا اولین فریضہ ہے کہ جو پیغام رسالت اس تک پہنچا ہے اسے آگے پہنچانا اس کے فرائض میں ہے۔

رسالت کی جانشینی کا بنیادی تقاضا ہے کہ امت اسی طرح دین کی تبلیغ کرتی رہے جس طرح حضور اکرم ﷺ اپنے زمانے میں کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی حیات طیبہ کا اسوہ ہمارے سامنے ہے۔ [۳]

---

(۱) آل عمران: ۳/ ۱۱۰

(۲) اسالیب دعوت اور مبلغ کے اوصاف، مولف محمد فتح اللہ گولن، مترجم محمد اسلام، ہارمنی پبلیکیشنز، ڈبل روڈ ایف ٹین، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۵

(۳) اسلام کا معاشرتی نظام، ڈاکٹر خالد علوی، مکتبہ قدسیہ، ۱۹۹۷ء، ص ۳۳۸

حضور ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں۔ آپ ﷺ پر نبوت کو ختم کر دیا گیالہذا خلق کی رہنمائی اور اتمام حجت کی پوری ذمہ داری ہمیشہ کے لیے آپ ﷺ کی امت پر ڈال دی گئی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دین کو صحیح حالت میں محفوظ رکھنے کے لیے دو خاص انتظام فرمائے ایک یہ کہ قرآن پاک کو محفوظ اور ہر طرح کی تحریف سے پاک کر دیا تاکہ اللہ کی منشا جاننے کے لیے کسی نئے نبی کی ضرورت باقی نہ رہے دوسرا یہ کہ اس امت کے اندر جیسا کے احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ ایک گروہ کو ہمیشہ کے لیے حق پر قائم کر دیا اس جماعت کی تعداد کتنی ہی تھوڑی کیوں نہ ہو اس امت میں ہمیشہ باقی رہے گی جو امر بامعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتی رہے گی۔

چنانچہ شہادت علی الناس یا تبلیغ دین محض بطور ایک نیکی اور دین داری کے کام کے طور پر مطلوب نہیں اور نہ ہی یہ مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کے لیے ہے بلکہ حضور ﷺ کی بعثت کا جو مقصد اس امت کے ہاتھوں پورا ہونا ہے یہ اس کا مطالبہ ہے جو اللہ کے ہر اس بندے کو ادا کرنا ہے جو حضور ﷺ کی امت میں داخل ہے یہ فریضہ رسالت ہے جو حضور ﷺ کے بعد اس امت پہ ڈالا گیا۔

دعوت و تبلیغ انفرادی اصلاح کے لیے:

دعوت و تبلیغ کسی فرد اور قوم کے لیے زندگی کی علامت ہے تبلیغ کے بغیر انفرادی تشخص کا برقرار رہنا ناممکن ہے تبلیغ و دعوت کے دو دائرے ہیں: ایک دائرے میں یہ کسی قوم کے افراد کو اندرونی بگاڑ سے بچانے کا ذریعہ ہے اور دوسرے دائرے میں عام انسانوں کو کسی خاص نظریے اور نظام کا قائل کرنا ہے۔ ایک اعتبار سے یہ تحفظ ہے تو دوسرے لحاظ سے توسیع۔ تبلیغ و دعوت کسی فرد اور قوم کا اندرونی داعیہ ہے جس کے تحت وہ دوسروں کو اپنی بات منوانے کی سعی و جدوجہد کرتا ہے۔ دنیا کے تمام مصلحین و بانیان مذاہب اس داعیہ کے تحت فریضہ تبلیغ انجام دیتے ہیں اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حق و صداقت کی آواز کو عام کیا جائے اور فساد کو رد کیا جائے۔[1]

حضور ﷺ نے مکی زندگی میں انفرادی اصلاح سے دعوت و تبلیغ کے کام کا آغاز کیا اور پھر مدینہ میں بھی یہ طریقہ رائج رہا۔ حضور ﷺ لوگوں کے پاس نفس بنفیس تشریف لے جاتے اور انھیں اسلام کی دعوت دیتے جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیتے وہ دین و دنیا میں اعلی درجات پر فائز ہوئے اور جنھوں نے انکار کیا انہوں نے اپنے لیے گمراہی اور تباہی کے دروازے کھول دیئے۔

---

(۱) رسول اکرم ﷺ کا منہاج دعوت، ڈاکٹر خالد علوی، دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۳

انفرادی برائیاں ہی اجتماعی انتشار کو جنم دیتی ہیں لہذا دعوت و تبلیغ کے ذریعے انفرادی اصلاح ہی اجتماعی اصلاح کے لیے بنیاد کا کام دیتی ہے۔ اس لیے دعوت دین کی ذمہ داری ہر مسلمان مرد اور عورت پر عائد ہوتی ہے کہ وہ معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو روکے اور ہر شخص تک اسلام کی تعلیمات کو پہنچائے۔

"اسلام مطالبہ کرتا ہے کہ مسلم بذات خود یافتہ اور صالح ہونے کے ساتھ مصلح اور ہادی بھی ہو۔"

دعوت و تبلیغ انفرادی زندگی کی بقا کی ضامن ہے۔ یہ انفرادی دعوت و تبلیغ ہی کی برکت تھی کہ اسلام کو خلفائے راشدین جیسی اعلیٰ ہستیاں ملیں جنھوں نے ایک طرف تو اپنی ذہانت کی وجہ سے اصل دعوت کی فکری روح کو اس طرح اپنے اندر جذب کر لیا کہ وہ بذات خود اصل دعوت کے شارح و مفسر بن گئے اور دوسری طرف اپنے کردار کی بلندی کی وجہ سے اپنے اندر وہ ایسی ہمت مردانہ رکھتے تھے کہ اسی دعوت کی اساس پر انہوں نے ایک پورا نظام اجتماعی مرتب کر کے چلایا اور دنیا کو دکھایا کہ اسلام عملی حیثیت سے یہ ہی چاہتا ہے۔(۱)

دعوت و تبلیغ اجتماعی اصلاح کی ضامن:

افراد سے مل کر معاشرہ بنتا ہے اور اجتماعیت وجود میں آتی ہے۔ اگر افراد کی اصلاح کر دی جائے تو خود بخود صالح معاشرے کا قیام وجود میں آتا ہے۔ اجتماعی دعوت و تبلیغ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص بڑے مجمع کے سامنے دین کی بات کے لیے ان کے سامنے وعظ و تقریر کرے ان کو دین کی باتیں بتائے امر بالمعروف و نھی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے۔ اور افراد معاشرہ کو صالح زندگی کی طرف راغب کرے یوں معاشرہ امن کا گہوارہ بن جائے گا جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے احکامات کے مطابق زندگی گزاری جائے گی تو پھر تمام مسائل کا قلع قمع ہو جائے گا اجتماعی تبلیغ فرض عین نہیں بلکہ فرض کفایہ ہے۔ فرض کفایہ ہونے کا مطلب ہے کہ اگر کچھ لوگ وہ کام کر رہے ہوں تو باقی لوگوں سے وہ فریضہ ساقط ہو جاتا ہے اگر کوئی شخص بھی انجام نہ دے تو سب گناہگار ہوں گے جیسے نماز جنازہ۔ لہذا اجتماعی دعوت فرض کفایہ ہے فرض عین نہیں۔(۲)

آج اگر ہم نے اپنی اجتماعی زندگی کی اصلاح کرنی ہے تو اس کا واحد ذریعہ دعوت و تبلیغ دین ہے کیونکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ ایک عالمگیر نظام ہے جس میں ہماری انفرادی زندگی کی بقا کے اصول بھی ہیں اور معاشرتی زندگی کی اصلاح کا لائحہ عمل بھی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ خدا کے رسول ﷺ نے دین کی اشاعت اور اقامت کے لیے انفرادی کوششیں بھی کیں اور الگ منظم جماعت بھی تشکیل دی اور کندھے سے کندھا ملا کر باطل کے خلاف جنگ بھی کی اور عربوں کے جاہل اور اجڈ

---

(۱) دعوت دین اور اس کا طریقہ کار، امین احسن اصلاحی، ص ۵۰۳

(۲) اخلاقی خطبات، مفتی تقی عثمانی، میمن اسلامک پبلشرز، لیاقت آباد، کراچی، جنوری ۱۹۹۸ء، ۸/ ۲۹-۳۳

معاشرے کی ایسی اصلاح کی کہ جس پر اقوام عالم آج بھی ورطۂ حیرت میں مبتلا ہے۔ اور آج ہم مسلمانوں کا وجود بھی نبی ﷺ آخر الزماں کا مرہون منت ہے۔

"دنیا میں اگر آج ہم مسلمانوں کا وجود ہے تو یہ اس ہستی کی جاں فشانیوں کے طفیل ہے آج اگر سچائی اور نیکی کا کلمہ ہمارے سینوں میں نور افگہاں ہے تو اس مقدس وجود کا فیضان ہے آج اگر زندگی کی اصلاح و فلاح کے لیے اصول وضوابط انسانیت کے سامنے موجود ہیں تو یہ آپ ﷺ کی جدوجہد کا ثمرہ ہے۔ آج اگر ہم اسلامی انقلاب برپا کرنے کے اندازواسلوب سیکھ سکتے ہیں تو اس خدائی رہنما کی کشش کی رواداری سے سیکھ سکتے ہیں۔ آج اگر ابنائے آدم کو حقیقت سے شعور افزا کرنے، اخلاق کی لازوال قدریں اور زندگی کی فلاح کے اصول وضوابط ہاتھ آسکتے ہیں تو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بارگاہ سے ہی ہاتھ آسکتے ہیں۔ محسنِ انسانیت جیسا داعی اور مسلم اور عربی قائد اگر مبعوث نہ ہوا ہوتا تو کبھی وہ کار عظیم اس دور ظلمت وجہل میں سرانجام نہ پاسکتا۔ حضور ﷺ ہی سارے انقلاب کی روح تھے۔"(۱)

آج بھی ہماری انفرادی اور اجتماعی اصلاح صرف اسلام کی اعلیٰ تعلیمات پر عمل کرنے سے ممکن ہے۔ جس معاشرے میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی اور نافرمانی بر سرعام ہونے لگے اور دینی حس رکھنے والے اس سے منع نہ کریں تو اس نافرمانی کے نتیجے میں ان پر خدائی عذاب آئے گا توسب اس عذاب میں مبتلا ہوں گے۔اس کی مثال قصہ اصحاب السبت ہے:

> "درحقیقت اسلام مجاہدوں، غازیوں، شہیدوں اور داعیوں کا دین ہے یہ راہبوں، جوگیوں اور صرف اپنی ذات کے گرد گھومنے والے زاہدوں کا دین نہیں ہے اس میں انفرادی اصلاح اجتماعی اصلاح اور معاشرتی اصلاح ساتھ ساتھ جاری رہتی ہے۔"(۲)

دعوت و تبلیغ امن وسلامتی کے لیے:

اسلام امن وسلامتی کا مذہب ہے۔ ہر طرح کی بے سکونی اور انتشار کا علاج دین اسلام کی آفاقی تعلیمات پر عمل کرنے میں ہے۔ طلوع اسلام سے قبل جنگ وجدل، قتل وخون، انتہا پسندی اور عدم برداشت کی کئی مثالیں ہمیں نظر آتی ہیں۔

> "ایام العرب کا ایک سلسلہ ہے جو خون کی موجوں کی طرح سارے جزیرہ میں پھیلا ہوا تھا"۔(۳)

اسی معاشرے میں حضور ﷺ نے علم حق بلند کیا اور صرف ۲۳ سال کی مختصر مدت میں اسے اوج کمال تک پہنچا دیا۔

---

(۱) محسن انسانیت، نعیم صدیقی، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۵۹۶

(۲) ماہنامہ دعوت، قرآن مجید اور دعوت و تبلیغ، مولانا امیر الدین مہر، جلد نمبر ۲، شمارہ ا، جون ۱۹۹۵ء، دعوۃ اکیڈمی، ادارہ تحقیقات اسلامی پریس، اسلام آباد

(۳) نقوش رسول نمبر، پیغمبر اسلام کا پیغام امن وسلام، زین العابدین میرٹھی، جلد سوم، اسلامک ریسرچ سینٹر، اسلام آباد

آج ہمارے موجودہ معاشرے میں بھی بدامنی اور انتشار کا دور دورہ ہے۔ ہم ایٹمی طاقت ہونے کے باوجود انتہائی ذلت وخواری اور افلاس میں مبتلا نظر آتے ہیں نہ زور قوت ہے نہ زور دولت نہ شان وشوکت نہ باہمی اخوت والفت نہ اخلاق وکردار۔ ہر برائی ہم میں موجود اور ہر بھلائی ہم سے دور۔ اس کی واحد وجہ اسلامی تعلیمات سے دوری ہے۔

> ہمارا اصل فرض روح اسلامی اور حقیقت ایمانی ضعف اور اضمحلال کا شکار ہے۔ ہماری ایمانی قوت زائل ہو چکی ہے اور حب اصل میں انحطاط آگیا تو اس کے ساتھ جتنی خوبیاں اور بھلائیاں وابستہ تھیں ان کا انحطاط پذیر ہونا بھی ضروری تھا۔ پس ہمارا علاج صرف یہ ہے کہ ہم فریضہ تبلیغ کو اسی طرح لے کر کھڑے ہوں جس سے ہم میں قوت ایمانی بڑھے اور اسلامی جذبات ابھریں۔ (۱)

دنیا میں انتشار بے سکونی اور بدامنی کی فضا اس وقت پیدا ہوتی ہے جب افراد ایک دوسرے کی حق تلفی کرنے لگے اور ایسا صرف اسلامی تعلیمات سے لاعلمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر آفاقی مذہب کی آفاقی تعلیمات سے لوگ آگاہ ہوں تو انھیں پتہ چل جاتا ہے کہ یہ مذہب تو انسان تو انسان جانوروں کے حقوق بھی متعین کرتا ہے۔ یہ تو حالت جنگ میں بھی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے یہاں تک کہ حالت جنگ میں بھی درختوں اور املاک کو نقصان پہنچانے سے روکتا ہے۔ ایسا مذہب کیسے بدنامی اور انتشار کو پسند کر سکتا ہے؟ کیسے دہشت گردی کی پشت پناہی کر سکتا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ دین اسلام کی تعلیمات سے آگاہی حاصل کی جائے اور دوسروں کو بھی اس کی آفاقی تعلیمات سے روشناس کروایا جائے۔

دعوت و تبلیغ کے ذریعے اشاعت اسلام میں اضافہ:

اشاعت اسلام کی تاریخ میں دعوت و تبلیغ کا کردار بہت اہم ہے مکہ مکرمہ میں نبی کریم ﷺ نے کامل تیرہ سال اور مدینہ منورہ میں دس سال تک اسلام کی دعوت و تبلیغ کی۔ جزیرہ عرب اور اس کے گردونواح سے باہر پوری دنیا میں اشاعت اسلام صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین اور بزرگان دین کی دعوت و تبلیغ سے ہوئی۔ یہ دعوت و تبلیغ کا کرشمہ ہے کہ جب تاتاری فوجیں بغداد میں مسلمانوں کا قتل عام کر رہی تھیں تو دوسری طرف سماٹرا میں اسلام کی حکومت قائم ہو رہی تھی۔ ایک طرف قرطبہ اور اندلس سے اسلام مٹایا جا رہا تھا تو دوسری جانب جاوا میں اسلام کا علم بلند ہو رہا تھا۔ دعوت و تبلیغ کے باعث وہ تاتار جو اسلام کو مٹانے کے درپے تھے وہی اسلام کے پاسبان بن گئے۔ اور اسلام نے ان کے دلوں کو فتح کر لیا۔ (۲)

---

(۱) فضائل اعمال، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا، مکتبہ خلیل یوسف، لاہور، اشاعت ۱۹۹۸ء، ص ۷۵۷

(۲) دعوت و تبلیغ کی حکمت عملی، ڈاکٹر محمد سلیم دین، مقالات سیرت کانفرنس ۲۰۰۲ء، شعبہ تحقیق وزارت مذہبی امور، حکومت پاکستان، اسلام آباد

دعوت اسلام عصر حاضر کی ضرورت:

موجوہ دور مادیت پرستی کا دور ہے ہر طرف بدامنی اور انتشار ہے ہر شخص مذہب سے دور اور دنیا کے قریب ہے ہر شخص ایک دوسرے کا دشمن ہے، افراتفری ان کا خاصہ ہے۔ والدین اولاد سے نالاں اور اولاد والدین پر برہم ہے، ایک طرف مادی ترقی عروج پر ہے دنیا گلوبل ویلج بن گئی ہے، ہر آسائش حاصل ہے لیکن پھر بھی عجیب کشمکش ہے کہ نہ قوانین کو تحفظ حاصل ہے تو نہ کسی کو کوئی حقوق حاصل ہیں۔

"امت اسلامیہ کی موجودہ ذلت اور پستی کا ایک اہم سبب امت کا اپنی اصل حیثیت کو فراموش کرنا ہے۔ امت اسلامیہ تو امت دعوت تھی جس کو اللہ نے تمام کائنات کے لوگوں کو پیغام حق پہنچانے کے لیے پیدا فرمایا۔"(۱)

ہمارے تمام مسائل کی جڑ ہماری اسلام سے دوری ہے۔ اور ہماری اسلام سے دوری کا سبب یہ ہے کہ ہم نے اسلام کو چند عقائد و رسومات کا مجموعہ سمجھ لیا ہے ان کی انجام دہی کا ہم اہتمام بھی کرتے ہیں اس کی ناموس پر جان کے نذرانے تک پیش کرتے ہیں مگر اس کے مطابق زندگی کے شب و روز نہیں گزارنا چاہتے اور ہندوؤں اور عیسائیوں کی طرح چند عقائد پر اکتفا کر لیتے ہیں۔(۲)

اگر ہم اسلام کی تعلیمات پر عمل کریں اور دنیا میں اس کے لازوال قوانین کا پرچار کریں تو دنیا آج بھی امن کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ مسلمان دنیا آج جمود انتشار اور خوف کے دوراہے پر کھڑی ہے آج مسلمانوں کو ان کا کھویا ہوا مقام اگر حاصل ہو سکتا ہے تو وہ صرف دعوت و تبلیغ کی برکت اور محنت کی وجہ سے ہی ہو سکتا ہے۔

اسلام محبت کا دین ہے اور امن کا علمبردار ہے۔ سکون کا پیغام ہے۔ یہی وہ شاہراہ ہے جس پر چل کر سب ہدایت پا سکتے ہیں۔ "افریقہ میں ایک عرب کو موت کی سزا دی تھی۔ جب ایک پادری اس کے پاس روحانی تسکین کی غرض سے گیا تو اس عرب نے اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں اس پادری کو اسلام کی دعوت دینے اور اسے مسلمان کرنے کی کوشش میں صرف کیں جس کے نتیجے میں اس نے اسلام قبول کیا اور روحانی سکون پایا"۔(۳)

الغرض عصر حاضر کے مسائل ہوں یا دین و دنیا کی کامیابی اور سکون کی بات نجات اور فلاح کا واحد ذریعہ اسلام کی

---

(۱) دعوت دین کیسے دیں، پروفیسر ڈاکٹر فضل الہی، قدسیہ اسلامک پریس، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۳۰

(۲) ماہنامہ دعوۃ، مضمون، نوجوان نسل کو اسلام کے قریب کیسے لایا جائے، صفیہ سلطانہ صدیقی، شمارہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۵ء، جلد نمبر ۲

(۳) دعوت اسلام، مصنف پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ، مترجم ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، ص ۳۸۹، ۳۹۰

دعوت و تبلیغ ہے بقول سید سلیمان ندوی[۱]، "دعوت و تبلیغ اسلام کے جسم کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس پر اسلام کی بنیاد، اسلام کی قوت، اسلام کی وسعت اور اسلام کی کامیابی منحصر ہے۔ اور عصر حاضر میں سب زمانوں سے بڑھ کر اسکی ضرورت ہے۔"[۲]

(۱) سید سلیمان ندوی: ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے انہیں ان کی خدمات کی بدولت ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ وہ مؤرخ، نثر نگار اور سیرت نگار ہیں۔ ان کی مشہور تصانیف میں سیرت النبی ﷺ اور خطبات مدراس ہیں۔ انہوں نے ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو وفات پائی۔ ندوۃ العلماء کے جید طلباء میں اِن کا شمار ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے انہیں اُستاد الکل کا خطاب دیا۔ (تاریخ اسلام، بشیر احمد تمنا، ایورنیو بک پیلس، اردو بازار لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۳۳۸)

(۲) پیغامبر، قوم اور اس کے اصول دعوت، سید سلیمان ندوی، مکتبہ سید ابوالحسن علی ندوی، کراچی، ص ۲۸

فصل دوم
تفسیر کی ضرورت واہمیت

تفسیر کا لغوی مفہوم:

تفسیر عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ فَسَرَ (ف-س-ر) ہے۔ لفظ تفسیر باب تفعیل سے مصدر ہے جس کے معنی ہیں ظاہر کرنا، واضح کرنا، بند چیز کو کھول کر بیان کرنا، کسی عبارت کے مفہوم کو واضح بیان کرنا ہے۔ [1]

لسان العرب میں لفظ تفسیر کے معنی:

لسان العرب میں تفسیر کے معنی اظہار بیان ہے اس کا فعل باب ضَرَبَ ونَصَرَ دونوں سے آتا ہے تفسیر کا مفہوم بھی یہی ہے مزید لکھتے ہیں کہ لفظ تفسیر کے معنی بے حجاب کرنا کے ہیں چنانچہ تفسیر کرتے وقت بھی مشکل الفاظ کے معنی و مفہوم کو بے حجاب کر دیا جاتا ہے۔ [2]

المعجم الوسیط:

فَسَرَ پردہ ہٹانا، ننگا کرنا، کھولنا، تشریح کرنا۔ فَسَّرَ الشَّيي اچھی طرح ظاہر کرنا، کھول کر بیان کرنا، مراد بتانا۔ فَسَّرَ آيَاتَ القُرآنِ الحَكِيمِ، آیات قرآنی کے احکام و مطالب اور اسرار و حکم بیان کرنا، لغوی و معنوی تحقیق کرنا، مراد باری تعالیٰ بیان کرنا۔ [3]

قاموس مترادفات:

تفسیر کے معنی تشریح، توضیح، تعبیر کرنا، تفصیل بنیان کرنا، صراحت تصریح کے ہیں۔ [4]

فیروز اللغات:

تفسیر کے معنی واضح کرنا، شرح کرنا، سمجھانا، بیان کرنا، کھولنا کے ہیں۔ [5]

تفسیر کا اصطلاحی مفہوم:

اصطلاح میں تفسیر کے معنی میں قرآن مجید کی تشریح و توضیح اور تفصیل بیان کرنا اس کے مشکل الفاظ اور جملوں کے مفہوم و مطلب کو ظاہر کرنا۔

---

(۱) القاموس الوحید، وحید الزمان قاسمی کیرانوی، ادارہ اسلامیات، لاہور، کراچی، ص ۱۶۳

(۲) لسان العرب، ابن منظور، ۲/ ۳۲۱

(۳) المعجم الوسیط، ابراہیم مصطفی، مکتبہ رحمانیہ، اقراء سنز، غزنی سٹریٹ لاہور، مئی ۱۹۷۲ء، ص ۷۰۶

(۴) قاموس مترادفات، وارث سرہندی، اشفاق احمد اردو سائنس بورڈ اپر مال، اگست ۱۹۸۶ء، ص ۳۰۵

(۵) فیروز اللغات، الحاج مولوی فیروز الدین، فیروز سنز لمیٹڈ، ص ۳۱۶

البرھان فی علوم القرآن میں تفسیر کے معنی درج ذیل بیان کیئے گئے ہیں:

" تفسیر ایک ایسا علم ہے جس کی مدد سے رسول اکرم ﷺ پر نازل ہونے والے قرآن کے معنی سمجھے جاتے ہیں اور اس کے احکام و مسائل اور اسرار و حکم سے بحث کی جاتی ہے"۔[۱] نیز تفسیر ایک ایسا علم ہے جس میں قرآنی آیات کے نزول کے واقعات، متعلقہ اسباب نزول، نیز مکی و مدنی، محکم و متشابہ، ناسخ و منسوخ، خاص وعام مجمل و مفسر، حلال و حرام، وعد و عید، امر و نہی اور عبرت و امثال وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔

البحر المحیط میں تفسیر کی تعریف درج ذیل الفاظ میں کی گئی ہے:

" تفسیر وہ علم ہے جس میں الفاظ قرآن کی کیفیت اور ان کے مولولات اور ان کے منفرد اور مرکب ہونے کے احکامات حالت ترکیبی میں ان کے معانی اور تتمات سے بحث کی جاتی ہے"۔[۲]

اس تعریف میں علم کا لفظ جنس کی حیثیت رکھتا ہے جس میں سب علم داخل ہو سکتے ہیں۔

الفاظ قرآن کی کیفیت نطق کی کیفیت نطق سے مراد "علم قرات" ہے۔

الفاظ قرآن کے مدلولات سے مراد ان الفاظ کے معنی ہیں اور اس کا تعلق اہل لغت سے ہے۔

مفرد اور مرکب کے احکام سے مراد علم صرف، علم نحو (عربی گرائمر) علم بیان اور علم بدیع ہے۔

حالت ترکیبی میں الفاظ قرآن کے معنی سے مراد یہ ہے کہ کبھی لفظ کے ظاہری معنی مراد لیے جاتے ہیں اس کا تعلق علم بیان اور معانی سے ہے۔ تفسیر تتمات سے ناسخ و منسوخ کی معرفت آیات کا شان نزول اور قرآن کا بیان ہے"۔[۳]

الغرض تفسیر کا مفہوم یہ ہے کہ کلام اللہ کے مدلول و مفہوم کے ساتھ یہ بھی بیان کرنا کہ

← نزول قرآن کا سبب کیا ہے؟

← احوال نزول و زمانہ نزول اور واقعات متعلقہ کیا ہیں؟

← آیات مبارکہ مکی ہیں یا مدنی، محکم ہیں یا متشابہ، ناسخ ہیں یا منسوخ، خاص ہیں یا عام، مطلق ہیں یا مقید، مجمل ہیں یا مفصل؟

← حلال اور حرام کے احکامات کس طرح مستنبط ہو رہے ہیں؟

---

(۱) البرھان فی علوم القرآن، علامہ بدرالدین زرکشی، ۱/ ۳۰-۳۱

(۲) البحر المحیط، ابو حیان محمد بن یوسف، دار الفکر، بیروت، ۱۹۸۳ء، ۱/ ۲۶

(۳) منازل العرفان فی علوم القرآن، مولانا محمد مالک کاندھلوی، ص ۲۰۹

← آیات کی دلالت حلت پر ہے یا حرمت پر ہے یا کراہت واستجاب پر، مضمون وعید پر مشتمل ہے یا وعدے پر۔ مضمون امثال وغیرہ کا ہے یا واقعات اور قصص کا۔"[1]

تفسیر کے معنی قرآن کے ادبی مطالعے کے ہیں جو ٹھیک طریقے کے ساتھ ہو اور تمام ادبی پہلوؤں پر پورا حاوی ہو اور اس کی تقسیم یا ترغیب منظم ہو۔[2]

تفسیر کی ضرورت واہمیت

تفسیر کی اہمیت آیات قرآنی کی روشنی میں:

ارشاد ربانی ہے:

﴿ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ ٱلْقُرْءَانَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَآ ﴾[3]

ترجمہ: یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے کیاان کے دلوں پر تالے پڑے ہیں۔

﴿ أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا۟ ٱلْقَوْلَ أَمْ جَآءَهُم مَّا لَمْ يَأْتِ ءَابَآءَهُمُ ٱلْأَوَّلِينَ ﴾[4]

ترجمہ؛ کیاانہوں نے بات پر غور نہیں کیا۔

﴿ وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَٰكَ بِٱلْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ﴾[5]

ترجمہ: جو بھی مثال آپ کی خدمت میں لائیں گے ہم اس (مثال) کے عوض آپ ﷺ کے پاس حق اور بہترین تفصیل لائیں گے۔

اس آیت مبارکہ میں "تفسیر" کا لفظ تشریح اور وضاحت کے لیے استعمال ہوا ہے۔

﴿وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴾[6]

ترجمہ: اور ہم نے قرآن آپ ﷺ پر اتارا تاکہ آپ ﷺ لوگوں کے سامنے وہ باتیں وضاحت سے بیان فرمادیں جو ان کی طرف اتاری ہیں تاکہ وہ غور وفکر کریں۔

---

(۱) منازل العرفان فی علوم القرآن، مولانا محمد مالک کاندھلوی، ص۲۰۹

(۲) اصول تفسیر وتاریخ تفسیر، فقیر محمد، ایورنیو بک پیلس، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۷

(۳) سورۃ محمد ۴۷/۲۴

(۴) سورۃ المومنون ۲۳/۶۸

(۵) سورۃ الفرقان ۲۵/۳۳

(۶) سورۃ النحل ۱۶/۴۴

﴿لَقَدْ مَنَّ ٱللَّهُ عَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُواْ عَلَيْهِمْ ءَايَٰتِهِۦ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلْكِتَٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ وَإِن كَانُواْ مِن قَبْلُ لَفِى ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ﴾(۱)

ترجمہ: بلاشبہ اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان فرمایا جبکہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے، انہیں پاک صاف کرتا ہے اور اللہ کی کتاب اور دانائی کی باتوں کی تعلیم دیتا ہے۔

ان آیات میں فرائض نبوت میں سے ایک فرض تعلیم قرآن ہے اور تعلیم صرف الفاظ سے پڑھنے کا نام نہیں بلکہ تشریح و تفسیر مراد ہے۔ حضور ﷺ صحابہ کرامؓ کو صرف قرآن کریم کے الفاظ نہیں سکھاتے تھے بلکہ تفسیر بھی بیان فرمایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کو ایک سورت پڑھنے میں کئی کئی سال لگ جاتے۔

تفسیر اور احادیث نبویہ ﷺ:

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اللہ کی مرضی اور منشاء کو اللہ تعالیٰ کے آخری اور محبوب پیغمبر ﷺ ہی بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ یوں قرآن پاک کے پہلے مفسر اور شارح خود نبی کریم ﷺ ہیں۔ حضور ﷺ خود صحابہؓ کو قرآن پاک کی تعلیم دیتے اور اس کے معنی مفہوم اور احکامات کی تشریح و توضیح کرتے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: ضَمَّنِي النَّبِيُّ ﷺ الكِتَابَ، وَقَالَ: «اللَّهُمَّ عَلِّمْهُ الحِكْمَةَ»

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور دعا فرمائی "اے اللہ! اسے کتاب (قرآن مجید) کا علم عطا فرما"۔(۲)

قرآن مجید کی کسی آیت کی تشریح حضور ﷺ کے قول و فعل یا تقریر سے کرنے کا عمل تفسیر القرآن بالحدیث کہلاتا ہے حضور ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی قرآن پاک کی تشریح و توضیح ہے۔

ارشاد ربانی ہے

﴿وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾(۳)

ترجمہ: اور ہم نے قرآن نازل کیا تاکہ آپ اسے لوگوں کے لیے واضح کر دیں تاکہ وہ غور و فکر کریں۔

---

(۱) سورۃ آل عمران: ۳/ ۱۶۴

(۲) صحیح بخاری، کتاب العلم، باب ذکر ابن عباسؓ، حدیث نمبر ۳۸۵۶

(۳) سورۃ النحل ۱۶/ ۴۴

حضور ﷺ نے فرمایا :

((مَثَلُ المُؤْمِنِ الَّذِي يَقْرَأُ القُرْآنَ ويعمل به كَمَثَلِ الأُتْرُجَّةِ، رِيحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا طَيِّبٌ، وَمَثَلُ المُؤْمِنِ الَّذِي لاَ يَقْرَأُ القُرْآنَ ويعمل به كَمَثَلِ التَّمْرَةِ، لاَ رِيحَ لَهَا وَطَعْمُهَا حُلْوٌ، وَمَثَلُ المُنَافِقِ الَّذِي يَقْرَأُ القُرْآنَ مَثَلُ الرَّيْحَانَةِ، رِيحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا مُرٌّ، وَمَثَلُ المُنَافِقِ الَّذِي لاَ يَقْرَأُ القُرْآنَ كَمَثَلِ الحَنْظَلَةِ،لَيْسَ لَهَا رِيحٌ وَطَعْمُهَا مُرّ))[۱]

نبی کریم ﷺ نے فرمایا"جو صاحب ایمان قرآن پڑھے اور اس کے مطابق عمل کرے تو اس کی مثال سنگترے جیسی ہے جس کا ذائقہ اچھا اور خوشبو بھی اچھی ہے۔ جو مومن قرآن مجید کی تلاوت نہ کرے لیکن اس کے مطابق عمل کرے گویا وہ کھجور کی طرح ہے جس کا ذائقہ اچھا ہے لیکن خوشبو اچھی نہیں۔ منافق جو قرآن کریم پڑھتا ہے اس کی مثال گل ریحان جیسی ہے کہ اس کی خوشبو تو اچھی ہوتی ہے لیکن ذائقہ کڑوا ہے اور جو قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثال اندرائن جیسی ہے جس کا ذائقہ کڑوا یا خراب ہوتا ہے اور بو بھی کڑوی ہوتی ہے"۔

غرض اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں قرآن پاک کے ترجمے اور تفسیر کی اہمیت اجاگر ہو جاتی ہے۔

تفسیر کی اہمیت ازروئے تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم:

رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد تفسیر قرآن کے اہم فریضہ کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے انجام دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مختلف مقامات پر حلقہ ہائے درس قائم تھے مثلاً مدینہ میں حضرت زید رضی اللہ عنہ اور ان کے تلامذہ اور کوفہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ قرآن مجید کی تفسیر اور تشریح کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے اور اپنے تلامذہ کو تفسیر قرآن مجید پر غور و فکر اور تفسیر و تشریح کرنے کا ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا"جو شخص قرآن مجید پڑھتا ہے اور اس کی تفسیر اچھی طرح نہیں کر سکتا اس کی مثال اس اعرابی کی ہے جو شعر کو بے سوچے سمجھے اور غیر موزوں پڑھتا ہے"۔[۲]

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں"بے شک مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ میں قرآن کی کسی آیت کی تعریب(تفسیر) کروں بہ نسبت اس بات کہ کے میں ایک آیت حفظ کر لوں"۔[۳]

---

(۱) صحیح بخاری، باب اقراء القرآن، حدیث نمبر ۳۷۰۳

(۲) فضائل القرآن، ابوزہراوی، ص ۱۳۱

(۳) اصول تفسیر و تاریخ تفسیر، محمد عبد اللہ صدیقی، زمزم پبلیشرز، لاہور، ص ۲۵

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کا علم حاصل کیا تھا وہ نزول وحی کے وقت بنفس نفیس موجود رہے اور انہوں نے نزول قرآن کے پورے ماحول اور پس منظر کا بذات خود مشاہدہ کیا تھا اس لیے ان کے اقوال تفسیر کا مستند ذخیرہ ہیں۔ احادیث کی کتابوں میں قرآن مجید کی بعض آیات اور الفاظ وغیرہ کے معانی صحابہ کرامؓ کے حوالے سے بیان کیے گئے ہیں۔

قرآن صحابہ کا اوڑھنا بچھونا تھا

صحابہ فہم قرآن میں ممتاز ترین تھے۔ وہ قرآن کو حفظ کرتے مگر حفظ کرنے سے پہلے اس کے معنی کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور پھر دل و جان سے اس کی پیروی کرتے تھے اور پوری مستعدی سے اس کی بتائی ہوئی راہ پہ گامزن ہو جاتے تھے کیونکہ اتباع قرآن کی صورت میں ان کی روحیں پاک صاف ہو گئیں ان کے نفوس پاکیزہ اور ان کے اثار میں عظمت پیدا ہو گئی اور آخر کار وہ دنیا کے امام ٹھہرائے گئے۔(۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اپنی مجلس میں پہلے قرآن پڑھتے پھر اس کی تفسیر کرتے پھر احادیث بیان کرتے۔(۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے پوچھا کہ "یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿ إِذَا جَآءَ نَصۡرُ ٱللَّهِ وَٱلۡفَتۡحُ ﴾ "تو یہاں فتح سے کیا مراد ہے؟" انہوں نے کہا "شہروں اور مکانوں کا فتح ہونا"۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا "اے ابن عباس! تو کیا کہتا ہے؟" میں نے کہا "اس سے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات مراد ہے یا ایک مثال ہے گویا آپ کو موت کی خبر دی گئی ہے"۔(۳)

غرض عہد صحابہ میں ہی تفسیر کی طرف رجحان بڑھ گیا تھا۔ اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ مشہور مفسرین صحابہ کرام میں شامل ہیں۔ صحابہ کرامؓ قرآن پاک کو صرف پڑھتے ہی نہیں تھے بلکہ اس کے معانی و مطالب پر غور کرتے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔

"جو لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور اس کی تفسیر کو نہیں جانتے وہ ان لوگوں کی طرح ہیں جن کے پاس اندھیری رات میں بادشاہ کا مکتوب آیا ان کے پاس چراغ نہ ہو ان کو پتہ نہ چل سکے کہ اس میں کیا لکھا ہے نہ وہ اس کی وجہ جانتے ہوں۔ جو لوگ قرآن مجید کی تفسیر جانتے ہیں ان کی مثال ان لوگوں کی طرح ہے جن کے پاس رات کے وقت بادشاہ کا مکتوب آیا ہو اور اس کو پڑھنے کے لیے ان کے پاس چراغ موجود ہو"۔(٤)

---

(۱) تاریخ تفسیر و مفسرین، پروفیسر غلام احمد حریری، ملک سنز اینڈ پبلشرز، ص ۶۳

(۲) المحرر الوجیز، از ابو حیان اندلسی، ۱/۱۶

(۳) اصول تفسیر و تاریخ تفسیر، فقیر محمد، ایور نیو بک پیلس، اردو بازار، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۶

(۴) ایضاً

غرض قرآن پاک کی تفسیر کا کام عہد صحابہؓ میں ہی شروع ہو گیا تھا۔

تفسیر قرآن کی ضرورت ازروئے عقل:

قرآن مجید اصول وکلیات کی ایک جامع کتاب ہے ان اصول وکلیات کو اللہ تعالیٰ نے اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان اصول وکلیات کو سمجھانے کے لیے تشریح وتوضیح ازحد ضروری ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر رسول کریم ﷺ نے ان کی تشریح فرمائی اگر آپ ﷺ تشریح نہ فرماتے تو قرآن مجید ایک معلق کتاب بن جاتی اس لیے عقل اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ قرآن مجید لوگوں کو سمجھانے کے لیے اس کے مشکل مقامات کی تشریح کی جائے۔ امام راغب اصفہانی نے اپنی تفسیر کے مقدمے میں لکھا ہے کہ

"انسان جو فنون (علم) حاصل کرتا ہے ان میں سب سے بہترین فن (علم) قرآن مجید کی تفسیر و تاویل ہے۔ کیونکہ کسی فن کو تین وجوہ کی وجہ سے فضیلت حاصل ہے۔

- ← اگر کسی علم کا موضوع شرف و فضیلت والا ہے تو وہ علم بھی فضیلت رکھتا ہے جیسا کہ زرگری کا فن کھالوں کی صفائی سے بہتر ہے زرگری کا موضوع سونا اور چاندی ہے جبکہ دباغت کا موضوع مردار اور جانوروں کی کھال سے ہے۔
- ← یا اس کی شکل وصورت کے اچھا ہونے کی وجہ سے کہا جاتا ہے جیسا کہ تلواروں کی دھلائی کا فن زنجیریں ڈھالنے کے فن سے بہتر ہے یعنی تلوار کی صنعت بیڑیاں بنانے کی صنعت سے افضل ہے۔
- ← یا اس کے اغراض و مقاصد کے اچھا ہونے کی وجہ سے کسی علم کو برتری حاصل ہوتی ہے جیسا کہ ڈاکٹری کا فن خاکروبی کے فن سے بہتر ہے کیونکہ ڈاکٹری کا مقصد بیماروں کی صحت و تندرستی بحال کرنا ہے اور خاکروبی کا مقصد فرش کی صفائی"۔(۱)

پس ثابت ہوا کہ فن تفسیر کو ان تینوں وجوہ سے فضیلت اور برتری حاصل ہے کیونکہ اس کا موضوع اللہ کا کلام ہے جو کہ حکمت کا سرچشمہ اور ہر فضیلت کی کان ہے۔ اور تفسیر کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی صورت ان مخفی رازوں کا اظہار ہے جنہیں اس قرآن کو نازل کرنے والے نے رکھا ہے۔ تفسیر کا مقصد ہی (اللہ تعالیٰ) کی اس مضبوط رسی اور کڑے کو پکڑنا ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا اور ایسی حقیقی سعادت تک پہنچنا ہے جس کو فنا نہیں۔

---

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، امام راغب اصفہانی، ص ۷

منشائے الٰہی کو جاننے کے لیے تفسیر ناگزیر:

منشائے الٰہی کو جاننے کے لیے علم تفسیر ایک ناگزیر ضرورت ہے اگر ہم قرآن پاک کی تفسیر سے آگاہ نہیں ہیں تو ہم خالقِ کائنات کے احکامات کو سمجھ نہیں سکیں گے کیونکہ لفظی ترجمے سے منشائے الٰہی کو مکمل طور پر نہیں سمجھا جاسکتا مثلاً قرآن پاک میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلَا تَجۡعَلۡ يَدَكَ مَغۡلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبۡسُطۡهَا كُلَّ ٱلۡبَسۡطِ﴾[۱]

ترجمہ: اور اپنے ہاتھوں کو گردن سے نہ باندھو اور نہ ہی بالکل کھلا چھوڑ دو۔

ظاہر ہے اس لفظی ترجمے سے اللہ تعالیٰ کی مرضی کو نہیں جانا جاسکتا۔ اس کے برعکس اس کا تفسیر و ترجمہ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت مبارکہ میں خدائے رحمان نے اپنے بندوں کو بخل اور امساک سے کام لینے سے منع فرمایا ہے۔

تفسیری ترجمہ اشاعت اسلام میں ناگزیر:

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کو دنیا میں پھیلانے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن پاک کا مختلف زبانوں میں تفسیری ترجمہ شائع کیا جائے تاکہ دیگر اقوام کو بھی قرآن پاک کی تعلیمات کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملے اور وہ دین اسلام کی آفاقی تعلیمات کو جانے۔ تفسیری ترجمے کے ذریعے سے ہی غیر مسلموں کے دلوں میں موجود شبہات کو دور کیا جاسکتا ہے مزید برآں اسی کے ذریعے ملحدین کے مکر و فریب سے اسلامی عقیدے کی حمایت اور حفاظت کی جاسکتی ہے۔

قرآن فہمی کے لیے تفسیر کی ضرورت:

"قرآن حکیم اللہ کا کلام ہے جس کے ذریعے اللہ نے اپنے بندوں سے خطاب فرمایا۔ یقیناً اللہ کا کلام لامحدود عظمتوں کا مظہر ہے۔ ہر کس و ناکس کے لیے اس کی عظمتوں اور حقائق کا ادراک ممکن نہیں اور بغیر شرح و تفسیر کوئی شخص اس کی رضا کو کیسے سمجھ سکتا ہے لہذا قرآن کو سمجھنے کے لیے تفسیر لازمی ہے کیونکہ قرآن کے مضامین کو کھول کھول کر بیان کرنے اور اس کے معنی و مطالب کو سامعین کے فہم سے قریب کر دینے کا نام ہی تفسیر ہے"۔[۲]

قرآن پاک ہی مسلمانوں کے لیے راہ ہدایت ہے یہ معلومات و معارف کا بے بہا خزانہ ہے۔ اپنی فصاحت و بلاغت میں یہ ایک معجزہ عظیم ہے۔ مسلمانوں کے لیے صرف قرآن پاک کی تلاوت کافی نہیں بلکہ اس کے ایک ایک لفظ کے معنی کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ تاکہ ہم راہ ہدایت پاسکیں۔ امت کے لیے فہم قرآن اور ضروری ہے کیونکہ قران ہی خدا کی مضبوط رسی ہے۔ وہی ذکر حکیم اور وہی صراط مستقیم ہے۔ اس میں نہ خواہش کچھ پیدا کر سکتی ہے نہ زبانیں شک ڈال سکتی ہیں۔

---

(۱) سورۃ الاسراء ۱۷/ ۲۹

(۲) تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرائے، ڈاکٹر محمد میاں صدیقی، مکتبہ الحسن، نوید پبلشرز، اردو بازار، لاہور، ستمبر ۱۹۹۰ء، ص ۸۶

بار بار دہرانے سے وہ پرانا نہیں ہوتا اس کے عجائب ختم نہیں ہوتے جو کوئی اس کی طرف بلاتا ہے وہ صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔[1]

قرآن پاک کے معنی و مفہوم سے آگاہی حاصل کیے بغیر تعلیمات قرآنی کو سمجھنا اور پھر عملی زندگی میں ان سے رہنمائی حاصل کرنا ناممکن ہے۔ لہذا فہم قرآن کے لیے تفسیر قرآن کو پڑھنا اور سمجھنا لازم ہے۔

انفرادی اور اجتماعی مسائل کے حل کے لیے تفسیر:

قرآن مجید فرقان حمید بنی نوع انسان کے لیے کتاب ہدایت ہے اور دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ قرآن مجید وہ عظیم الشان کتاب ہے جس کی آیات وقت اور زمانے کے ہر مسئلے ہر انفرادی اور اجتماعی ضرورت کا تسلی بخش حل اپنے اندر پنہاں رکھے ہوئے ہیں۔ اور یہ کتاب اور اس کی تعلیمات سعادت دنیا اور فلاح دارین کی ضامن ہیں۔

قرآن پاک میں انسان کے انفرادی مسائل کا حل بھی ہے اور اجتماعی زندگی کا لائحہ عمل بھی ہے۔ آج کا انسان چاند پر پہنچنے کے باوجود اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بے شمار مسائل کا شکار ہے۔ اس لیے ان مسائل کا کما حقہ حل سمجھنے اور اس سے ہر زمانے کی ضرورت اور مشکل کا حل تلاش کرنے کے لیے ہے۔ انسانی علم و فنون کی روشنی میں مسلسل غور و فکر اور تدبر و تفکر کی ضرورت رہتی ہے اور یہی ضرورت تفسیر نویسی کا اہم محرک ہے۔ اسی بنا پر ابتدائے زمانہ اسلام سے لے کر اب تک ہر دور میں اور ہر عصر میں تفسیر نویسی کا سلسلہ بلا انقطاع جاری رہا ہے۔ اور ان شاء اللہ قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی کامیابی کا انحصار صرف اس پر ہے کہ ہم اپنی زندگی کو قرآن پاک کی آفاقی تعلیمات کو سمجھ کر اس کے مطابق گزاریں صرف یہی ہماری اصلاح اور کامیابی کا واحد ذریعہ ہے۔

ترقی کا راز قرآنی تعلیمات میں:

امت مسلمہ کی ترقی کا راز قرآنی تعلیمات کی پیروی میں پنہاں ہے۔ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کو عطا ہونے والی آخری کتاب اور مکمل صحیفہ ہدایت ہے جو انسانی زندگی کے جملہ پہلوؤں کا مکمل احاطہ کیے ہوئے ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب ملت اسلامیہ قرآنی ہدایت کے زیر اثر رہی اور قرآنی ہدایت کی روح کو ملت اسلامیہ نے اپنے پیش نظر رکھا تو عروج اور غلبہ ان کا مقدر رہا لیکن جب اس ہدایات ربانی کو ترک کیا تو انکی عظمت تاریخ کے صفحات کی زینت بن گئی۔ جب تک مسلمان قوم نے قرآنی تعلیمات کو پڑھا سمجھا اور اس پر غور و فکر کیا تب تک دنیا کی زمام اقتدار ان کے ہاتھ میں رہی۔ ملت اسلامیہ کا یہ زوال بھی دراصل قرآن حکیم کے حق ہونے اس کی ہدایات کے اثر انگیز ہونے کی محکم دلیل ہے کہ اس امت کا تمام عروج قرآنی ہدایات سے وابستگی میں مضمر ہے۔ قرآن کریم سے غور و فکر کا تعلق ہی

---

(۱) اصول تفسیر، شیخ الاسلام احمد بن الحلیم ابن تیمیہ، المکتبہ السلفیہ، لاہور، فروری ۲۰۰۱ء، ص ۱۳

ہدایت خیزی کا باعث ہے اور غور وفکر تب ہی ممکن ہے اور تعلیمات کی پیروی تب ہی ممکن ہے جب ہم تفسیر قرآن کو پڑھیں سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ غرض امت مسلمہ کی بقا اور ترقی کا راز صرف تعلیمات قرآنی پر عمل پیرا ہونے میں ہی ممکن ہے۔

"افراد اور اقوام کی ترقی کا راز تعلیمات قرآنی کی پیروی اور اس کی حکیمانہ نظم وترتیب میں مضمر ہے قرآن حکیم انسانوں کی فلاح وبہبود کے جملہ اجزاء وعناصر پر مشتمل ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآنی تعلیمات کی تعمیل قرآن مجید کے فہم وتدبر کے بعد ہی ممکن ہے قرآن مجید جس رشد وہدایت کے ذخیرے اپنی اندر سموئے ہوئے ہے اور اس کا معجزانہ اسلوب جن حکمتوں کا جامع ہے جب تک ان سے واقفیت حاصل نہ کی جائے تب تک اس کی پیروی کا کوئی امکان نہیں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم قرآنی الفاظ کے معانی و مطالب کو سمجھنے کی کوشش کریں اور علم تفسیر اس سلسلے میں معاون ثابت ہوتا ہے"۔[۱]

عصر حاضر اور تفسیر کی اہمیت :

عصر حاضر کے مسلمانوں کی غالب اکثریت قرآن حکیم کو گھروں، مجلسوں اور قبرستانوں میں خوش الحانی کے ساتھ تلاوت کرنے پر اکتفا کرتی ہے یا حصول برکت وتقدس کے لیے اسے گھروں میں رکھتے ہیں جبکہ مسلمان یہ بات بھول گئے ہیں کہ قرآن کی اصل برکت اس امر میں پوشیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام واوامر پر عمل کیا جائے اور اس کے بتائے ہوئے سانچے میں زندگیوں کو ڈھالا جائے۔ عصر حاضر کے مسلمان نے قرآن کو صرف تلاوت تک محدود کر رکھا ہے نہ اس نے معنی ومفہوم پر غور کیا نہ انھیں سمجھا اور پھر نہ ہی ان پر عمل کیا۔

حضرت عبد الرحمن سلمی کا قول ہے کہ "جن لوگوں نے ہمیں قرآن پڑھایا یا مثلاً عثمان بن عفانؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ وغیرہ نے وہ ہم سے کہتے تھے کہ جب ہم نبی ﷺ سے دس آیات کی تعلیم حاصل کر چکے ہوتے تو آپ ﷺ اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ہم ان آیتوں کے علم و عمل کو مکمل نہ کر لیں اس طرح انہوں نے آیتوں کے علم و عمل دونوں کی تعلیم حاصل کی"۔[۲]

عصر حاضر میں امت مسلمہ اگر کامیابی چاہتی ہے اور دنیا میں سر اٹھا کر جینا چاہتی ہے تو اس کا واحد حل اور واحد راستہ تعلیمات قرآنی پر عمل پیرا ہونا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم خود قرآن کے معنی ومفہوم سے آگاہی حاصل کریں اور

(۱) تاریخ تفسیر ومفسرین، غلام احمد حریری، ملک سنز پبلشرز، ۱۹۹۸ء، ص ۳۱

(۲) تفسیر ابن جریر، محمد بن جریر طبری، المصطفی البابی، مصر، ۱۳۷۳ھ، ۱۹۵۳ء، ۱/ ۳۶

اپنی آنے والی نسلوں کو بھی اس کے ترجمے اور تفسیر کی طرف راغب کریں تا کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں اس ابدی ہدایت ربانی سے رہنمائی حاصل کریں۔

"دور حاضر میں کائنات میں آئے دن بے شمار سائنسی انکشافات ہو رہے ہیں اور وہ تمام جن کا تعلق انسانی تہذیب وتمدن سے ہے، ترقی کے لیے نئے نئے انداز اختیار کر رہے ہیں۔ قرآن کریم چونکہ ان تمام علوم کا معدن و مخزن ہے اس میں تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق اشارات موجود ہیں۔ اس لیے دور جدید کا تقاضا ہے کہ قرآن مجید کو بنیاد بنا کر ان علوم کی اس نقطہ نظر سے توضیح کی جائے کہ وہ عہد حاضر کے مسائل کو حل کر سکیں اور جدید اذہان کے شکوک وشبہات کو دور کر سکیں ظاہر ہے کہ یہ کام تفسیر ہی کے ذریعے ممکن ہے"۔(۱)

غرض دور حاضر میں تفسیر کی ضرورت واہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ آج یہودیت اور عیسائیت کے پیروکار دن رات اپنے مذہب کی اشاعت و تبلیغ میں مصروف ہیں اور مسلمانوں کے خلاف سیاسی اور دینی محاذ پر پروپیگنڈہ کر رہے ہیں اور ہماری نوجوان نسل کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اپنے مذاہب کی تحریف شدہ تعلیمات کو پھیلانے کے لیے وہ اسلام کی تعلیمات کو موڑ توڑ کر پیش کرتے ہیں خود کو امن کا داعی اور اسلام اور اہل اسلام کو دہشت گرد قرار دے رہے ہیں۔ ان حالات میں یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کو دنیاوی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ انھیں قرآن کی طرف راغب کریں تا کہ اغیار کی سازشوں کا منہ توڑ جواب دیا جا سکے۔

ہمارا یہ دعوی ہے کہ ہماری شریعت ایک مکمل قانون الہی ہے جو ہماری دینی اور دنیوی فلاح وبہبود کا تا قیام قیامت ضامن ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم خود ہی اپنا مرض تشخیص کریں اور خود ہی اس کا علاج شروع کر دیں بلکہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم قرآن حکیم سے اپنا اصل مرض معلوم کریں اور اسی مرکز رشد وہدایت سے طریقہ علاج معلوم کر کے اس پر کاربند رہیں۔ جب قرآن حکیم قیامت تک کے لیے مکمل دستور العمل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس نازک حالت میں ہماری رہبری سے قاصر رہے۔ مالک ارض وسماء کا سچا وعدہ ہے کہ روئے زمین کی خلافت وبادشاہت مومنوں کے لیے ہے"۔(۲)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِلَّهِ ٱلۡعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِۦ وَلِلۡمُؤۡمِنِينَ﴾(۳)

ترجمہ: اور عزت صرف اللہ، اس کے رسول ﷺ اور مسلمانوں کے لیے ہے۔

غرض اس وقت دنیا میں مسلمانوں کے مصائب وصعوبات باہمی فسادات و جھگڑوں میں مبتلا ہونے کا سبب قرآن پاک کے رہنما اصولوں سے ناواقفیت ہے ان اصولوں کی مکمل معرفت صرف اور صرف قرآنی آیات کی تشریح سے حاصل ہو سکتی ہے جو کہ کتب تفسیر کی صورت میں موجود ہے۔

---

(۱) مفسرین عظام اور ان کی تفسیری خصوصیات، عبدالعزیز بلوچ، الفور اکیڈمی، سرگودھا س۔ن، ص ۱۳

(۲) فضائل اعمال، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا، مکتبہ خلیل، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۴۱

(۳) سورۃ المنافقون ۶۳/ ۸

الغرض "امت مسلمہ کے اس آخری دور کی اصلاح اسی طرح ہو سکتی ہے جیسے خیر القرون میں ہوتی تھی اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ کتاب الہی سے رشد وہدایت کا پیغام اخذ کیا جائے اور زندگی کے آداب و اطوار کو اس سانچے میں ڈھالا جائے ہمارے اسلاف مساجد میں گھروں میں فرضی و نفلی تہجد کی نمازوں میں جبکہ لوگ سو رہے ہوتے ہیں تدبر و تفکر کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ نتیجہ کے طور پر اس کے عمدہ اثرات ان کے نفوس میں ظاہر ہونا شروع ہوئے اور اخلاق کی اعلی بلندیوں پر فائز ہوئے۔ اخلاق و آداب اور اصلاح وارشاد میں مہارت حاصل کرنے کے بعد وہ علوم وفنون اور مختلف صنعتوں میں ماہر ہو گئے بالآخر دنیا کی تمام اقوام پر سبقت لے گئے۔[1]

پس امت مسلمہ کی بقا اور کامیابی کا انحصار قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے میں ہے جس کے لیے تفسیر ناگزیر ہے۔

---

(۱) مناھل العرفان فی علوم القرآن، علامہ زرقانی، ناشرین قرآن لمیٹڈ، لاہور، س۔ن / ۱۱

فصل سوم

منتخب تفاسیر کا تعارف اور خصوصیات

تدبر قرآن کا تعارف اور خصوصیات
تفہیم القرآن کا تعارف اور خصوصیات

تدبر قرآن کا تعارف اور خصوصیات

مفسر تدبر قرآن کا تعارف:

تفسیر "تدبر قرآن" کے مصنف مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ہیں۔ مولانا اصلاحی ۱۹۰۴ء میں ہندوستان میں پیدا ہوئے۔

مولانا اصلاحی کی مفسرانہ شخصیت کی تعمیر و تشکیل مولانا حمید الدین فراہی[۱] کے ہاتھوں ہوئی جو ماہر علوم قرآن اور مجتہدانہ شان کے مالک تھے۔ حمید الدین صاحب نے تفسیر میں قدماء کی تفسیری روایات کی تقلید کی بجائے اپنے مجتہدانہ ذوق و نظر سے غور و فکر کے ذریعے قرآن کے اسرار و رموز کو جاننے کی کوشش کی ہے۔ ان کے شاگرد امین احسن اصلاحی پر اپنے استاد محترم کا گہرا اثر تھا۔ اصلاحی صاحب نے اپنے استاد سے قرآن و حدیث، فقہ، علم الکلام، اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبان میں مہارت حاصل کی تاکہ تحقیق کی عمیق گہرائیوں سے علم و حکمت کے موتی چن سکیں۔[۲]

اور خصوصاً عربی زبان و ادب میں تو امین صاحب کو مہارت تامہ حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و علوم سے متعلق مولانا کی تصانیف سے ان کی قرآن فہمی، تبحّر علمی، وسعت مطالعہ اور مجتہدانہ شان کا اندازہ ہوتا ہے۔[۳]

مولانا صاحب ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی تاسیس کے بعد اس جماعت سے منسلک ہو گئے۔ بہت جلد آپ کا شمار جماعت اسلامی کے بانیوں میں ہونے لگا اور مودودی صاحب کی عدم موجودگی میں کئی دفعہ جماعت اسلامی کے امیر بھی رہ چکے ہیں بعد ازاں مودودی صاحب کے ساتھ ان کے اختلافات اس بات پر پیدا ہو گئے کہ آیا امیر وقت ارکان شوریٰ کے سامنے جوابدہ ہے یا نہیں؟ طویل بحث کے بعد ۱۸ جنوری ۱۹۵۸ء میں جماعت اسلامی سے مستعفی ہو گئے۔[۴]

تفسیر تدبر قرآن کا خاکہ:

۱۹۵۳ء میں جب شیخ اصلاحی صاحب جماعت اسلامی سے وابستہ تھے تو قادیانیوں کے خلاف تحریک چلانے کی پاداش میں آپ کو جیل بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے ڈیڑھ سال گزارا اس دوران انہوں نے اپنی تفسیر "تدبر قرآن" کا اجمالی خاکہ ترتیب دیا۔[۵]

---

(۱) شیخ حمید الدین فراہی: (۱۹۳۰ء۔۱۸۶۳ء) مولانا امین احسن اصلاحی کے اُستاد محترم تھے۔ آپ مفسر قرآن تھے آپ کی مشہور تفسیر نظام القرآن ہے۔ آپ نے مفردات القرآن بھی لکھی۔ ماہر علوم قرآن اور مجتہدانہ شخصیت کے مالک تھے۔ (ماہنامہ اشراق، ص۲۹)

(۲) شیخ امین احسن، حیات و افکار، ڈاکٹر اختر حسین رضوی، فاران فاؤنڈیشن، ص۷۷-۷۸

(۳) ماہنامہ اشراق، تاریخ اسلام کا منفرد مفسر قرآن، عطاالرحمن، جنوری ۱۹۹۸ء، ص۳۹

(۴) ایضاً

(۵) ماہنامہ تدبر، امین احسن اصلاحی، طباعت اپریل ۱۹۹۸ء، جلد ۵، شمارہ ۶، ص۹۹

تفسیر تدبر قرآن کی کتابت:

امین احسن صاحب نے تفسیر تدبر قرآن کی کتابت کی ابتدا ۱۹۵۸ء میں کی جب وہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ پہلے انہوں نے اسے قسط وار انداز میں مشہور رسالے "منبر" اور پھر ۱۹۵۹ء میں رسالہ "میثاق" میں شائع کروایا۔ ۱۹۲۵ء سے ہی اصلاحی نے شیخ حمید الدین فراہی کی شاگردی کے زمانے سے ہی تفسیر کی کتابت کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ اپنے استاد سے فن تفسیر کی گہرائی اور معلومات اکٹھی کرتے رہتے۔

شیخ امین احسن اصلاحی صاحب اپنی تفسیر کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

"میں اس تفسیر کی کتابت میں ۵۵ سال تک مستغرق رہا۔ جن میں سے ۲۳ سال اس کتاب کی تحریر و تسوید کی نظر ہوئے۔ اگر اس کے ساتھ وہ مدت بھی ملا دی جائے جو استاد محترم نے قرآن کے غور و فکر پر صرف کی اور جس کو میں نے اس کتاب میں سمونے کی کوشش کی ہے تو یہ کم و بیش ایک صدی کا قرآنی فکر ہے جو تفسیر تدبر قرآن کی صورت میں سامنے آیا ہے۔"[1]

مولانا صاحب کی تفسیر ۱۲ اگست ۱۹۸۰ء کو پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اس طویل زمانے میں شیخ امین کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، وہ خود فرماتے ہیں،

"میں اس تفسیر کی کتابت سے نہیں تھکا میرا دل اور میرا ذہن میرے ساتھ منسلک رہے اگر اللہ کی مدد اور نصرت نہ ہوتی تو میں اسے لکھنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا۔ میں اس کرم پر اللہ کا بہت شکر ادا کرتا ہوں"۔

تدبر قرآن کا منہج واسلوب

تدبر قرآن کے بارے میں بیشتر مفسرین کا خیال ہے کہ یہ تفسیر ابتدا سے انتہا تک شیخ حمید الدین فراہی کی تفسیر "نظام القرآن" کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ چونکہ شیخ حمید الدین امین احسن صاحب کے استاد تھے تو شاگرد کی تربیت میں ان کا اثر نمایاں نظر آتا ہے اور تدبر قرآن بھی کسی حد تک اسی مسلک کی نمائندگی کرتی ہے۔ جیسا کہ شیخ اصلاحی خود اقرار کرتے ہیں "میں فخر سے کہتا ہوں کہ یہ تفسیر فراہی کے فرمودات کا نتیجہ ہے لیکن احتیاط کے پیش نظر میں اسے ان سے منسوب نہیں کرتا کیونکہ اگر اس میں کوئی خطا ہے تو وہ میری طرف سے ہے اگر آپ اس کلام کو مستحکم اور دلائل سے مزین پاتے ہیں تو یہ فراہی کا فیضان ہے اور اگر اس میں ضعف و خطا ہے تو یہ میرے علم و فہم کی کمی ہے"۔[2]

---

(۱) تفسیر تدبر قرآن، دیباچہ، امین احسن اصلاحی، فاران فاونڈیشن، ۱/ ۲

(۲) تدبر قرآن، ۱/ ۴۱

"تدبر قرآن کو مولانا فراہی کے خیالات کا اعادہ قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ قرآن پر غور و فکر اور تدبر میں گزارا ہے، اور اسی طویل غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ ان کی تفسیر قدما کی تفسیر کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک انفرادی شان کی مظہر ہے۔ جس میں مولانا نے آیات کی تاویل و تشریح میں نئے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے اور ایسے نکات پیش کیے ہیں جن تک کسی مفسر کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی"۔ (۱)

امین احسن صاحب نے تدبر قرآن میں جس سنجیدہ علمی انداز میں قرآن کی ترجمانی کی ہے اور ہر طرح کے معہودات ذہنی اور فقہی و جماعتی عصبیت سے بچ کر مفہوم قرآن کو واضح کیا اور اکیسویں صدی کے نوجوانوں کے دماغ کی گرہیں کھولنے کی کوشش کی ہے اس سے مولانا کی مفسرانہ شخصیت کھل کر سامنے آتی ہے اور فکری بلندی عیاں ہوتی ہے۔ اس تفسیر میں وہ ایک ایک لفظ پر غور و فکر کرتے ہیں۔

تفسیر "تدبر قرآن" تدریس کے مراحل میں:

۱۹۶۲ء میں جب اصلاحی نے مدرسہ اصلاحیہ میں "تدبر قرآن" کے درس کا سلسلہ شروع کیا تو طلبہ کی ایک کثیر تعداد نے ان سے کسب فیض کیا۔ اصلاحی صاحب نے درس تفسیر قرآن کے ساتھ حدیث کو بھی شامل کیا۔ اصلاحی صاحب اپنے شاگردوں کو قرآن پاک کی آیات پہ غور و فکر اور تدبر کی طرف متوجہ کرتے۔ آپ خود فرماتے ہیں قرآن سے حقیقی استفادے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر قرآن مجید کے تقاضوں کے مطابق اپنے ظاہر اور باطن کو بدلنے کا مضبوط ارادہ موجود ہو۔ ایک شخص جب قرآن مجید کو گہری نگاہ سے پڑھتا ہے تو وہ ہر قدم پر یہ محسوس کرتا ہے کہ قرآن کے تقاضے اور مطالبے اس کی اپنی خواہشوں اور چاہتوں سے مختلف ہیں۔ (۲)

نیز غور و فکر اور تدبر قرآن در حقیقت صحابہ کرام کی روش تھی یہی وجہ تھی کہ قرآن مجید کے فہم میں وہی ممتاز تھے جو تدبر کرتے تھے جو قرآن کو صحیفہ ہدایت سمجھتے تھے۔ جب لوگوں نے قرآن کو محض تبرک کے طور پر برکت کے لیے گھروں میں صرف رکھنا شروع کیا۔ مفہوم قرآن سے رشتہ کمزور ہوا تو زندگی کے مسائل سے مضبوط ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے قرآن حکیم کی ایک ایک سورۃ پر ڈیرے ڈالے ہیں۔ ایک ایک آیت پر غور و فکر کا یہ عالم تھا کہ دنوں تک فکری مراقبے میں مصروف رہے اور ہر لفظ پر تحقیق اور غور و فکر اور نحوی مسائل کے حل کے لیے وہ کوشش کی ہے جس سے کسی سراغ کے ملنے کی امید تھی۔

مولانا اصلاحی زبان وادب کی باریکیوں اور اس کے وسیع اشارات و کنایات سے پوری طرح آگاہی رکھتے تھے لہذا اپنی

---

(۱) قرآن مجید کی تفسیریں چودہ سو برس میں، فخر اسلام اعظمی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء، ص ۳۷۷

(۲) مبادی تدبر قرآن، امین احسن صلاحی، فاران فاونڈیشن، لاہور، اگست ۱۹۹۹ء، ص ۱۹

تفسیر میں ان اشارات وکنایات سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ اور انھیں یوں کھول کر واضح کرتے ہیں کہ اصل منظر کی قاری کے سامنے تصویر کھینچ جاتی ہے یوں مولانا الفاظ کی لغوی تحقیق اور صحیح معنی کے تعین میں بڑی عرق ریزی سے کام لیتے ہیں۔ مثلا سورۃ بقرۃ کی آیت نمبر ۴۹ میں مستعمل لفظ "آل" کی لغوی تحقیق کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ "آل" سے مراد کسی شخص کی صرف اولاد نہیں ہوا کرتی بلکہ یہ لفظ آل واولاد، قوم وقبیلہ اور اتباع وانصار سب پر حاوی ہے

اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں جو تدبر قرآن کے مطالعے کے نتیجے کے طور پر سامنے آتی ہیں۔

تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن مجید کے مطالعے پر غور اور اس کی مشکلات حل کرنے کے لیے براہ راست غور direct approach کا طریقہ اختیار کیا گیاہے اور اسلوب بیان سادہ اور عام فہم ہے تفسیر کا اصل ماخذ قرآن کی زبان اس کی آیات کے نظام اور اس کے اندرونی نظائر اور شواہد کو قرار دیا گیا ہے۔ کسی قول کو مجرد اس دلیل پر اختیار نہیں کیا گیا کہ وہ اگلے اصحاب تاویل سے منسوب ہے چنانچہ اس میں اقوال کی کثرت کی بجائے دلائل کی روشنی میں ہر آیت کی ایک معین تاویل سامنے رکھی گئی ہے۔

"تدبر قرآن" کے بارے میں علماء کے تاثرات:

i. امت کی پوری تاریخ اس تفسیر کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ فہم قرآن کا یہ طریقہ جس کی ابتدا حمید الدین فراہی سے ہوئی تھی اور مولانا اصلاحی مرحوم نے جس کی بنا پر "تدبر قرآن" جیسی تفسیر لکھی ہے علم کی دنیا میں وہ انقلاب ہے جس نے حدیث وسیرت، فقہ وحکمت ہر موضوع پر موجود علم کو از سر نو ترتیب دینا لازم ٹھہرا دیا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کا یہ کام معارف اسلامی کی تشکیل جدید کی طرف ایک ٹھوس قدم ہے وہ قدم جس نے ہمارے علمی سفر کا رخ بالکل متعین اور نشان منزل بالکل واضح کر دیا۔[1]

ii. تفسیر تدبر قرآن کے مصنف مولانا امین احسن صاحب چونکہ جماعت اسلامی میں رہ چکے ہیں اور بعد میں اختلافات کی بنیاد پر الگ ہو گئے جب وہ جماعت میں تھے تو ان کے بارے میں جماعت کے لوگ یہ تاثر دیتے تھے کہ فہم قرآن میں ان کا رتبہ مودودی صاحب سے بلند ہے اور جماعت سے علیحدگی کے بعد یہ دعوی کیا جانے لگا کہ وہ فہم قرآن سے محروم ہیں۔ بس مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن کی چھ جلدوں کو پھیلا کر نو جلدوں میں نئی تفسیر بنا دی ہے اور ان کی تفسیر تدبر قرآن دراصل تفہیم القرآن کی کاربن کاپی ہے۔ مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن اور امین صاحب کی تدبر قرآن میں فرق یہ ہے کہ مودودی صاجب نے اپنی تفسیر میں زیادہ تر احادیث بیان کی ہیں جو اکثر ضعیف ہیں لیکن اس کے برعکس اصلاحی صاحب نے احادیث کی بجائے بائبل کے زیادہ حوالے دیئے ہیں اور انھیں معتبر قرار دیا ہے۔[2]

---

(۱) ماہنامہ اشراق، تصنیفات اصلاحی کا اجمالی تعارف، مفتی محمد رفیع، جنوری ۱۹۹۸ء، جلد ۱۰، شمارہ ۲، ص ۸۷

(۲) احکام القرآن میں تحریف، ناقدانہ جائزہ، رفیع اللہ شہاب، الفور پرنٹر پبلشرز، جولائی ۱۹۹۱ء، ص ۵۶

iii. تدبر قرآن کے ترجمے اور تفسیر کو پڑھتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ مولانا نے اس ذمہ داری کو بطریق احسن نبھایا ہے۔ ترجمہ میں نہ تو قدیم ترجموں کی بے کیفی اور سپاٹ پن ہے اور نہ ہی ایسی آزاد ترجمانی کہ ترجمے میں اپنی طرف سے کچھ ملا دینے کا گمان گزرے اس ترجمے کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک بہترین خطیب ہونے کی وجہ سے مولانا قرآن کے خطیبانہ انداز اور اس کے اتار چڑھاؤ سے آگاہ ہیں یہی وجہ ہے کہ ترجمے کی زبان سادہ دلکش اور دل میں اتر جانے والی ہے۔ تدبر قرآن کو دوسری تفاسیر کے مقابلے میں اس وجہ سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ وہ بہترین عصری اسلوب میں پیش کی گئی ہے۔ (۱)

طباعت "تدبر قرآن":

تفسیر تدبر قرآن پہلی مرتبہ ۸ جلدوں میں طبع کی گئی۔ لیکن حجم میں عدم تناسب کی وجہ سے پہلی چار جلدوں کو پانچ میں تقسیم کر دیا گیا اور باقی چار کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے اس طرح اب یہ ۹ جلدوں میں چھپ رہی ہے۔

ان نو جلدوں کے علاوہ اب "توضیحی اشاریہ" کی صورت میں دسویں جلد بھی آگئی ہے۔ اس توضیحی اشارے میں فہرست اماکن، فقہی اشارات، مشکلات قرآن، نظام القرآن، تحریفات تورات، الفاظ وتراکیب، اسماء الحسنیٰ، اسالیب کلام الٰہی اور سوالات وغیرہ کے بارے میں تفصیلات بیان کی گئی ہیں جو کہ ایک جامع اور مکمل انڈیکس ہے۔ یہ ریسرچ کے حوالے سے بہترین کام ہے۔

تفسیر کے اجزاء	سورتوں کی ترتیب	عدد الصفحات
جلد اول	مقدمہ و تفسیر سورۃ فاتحہ تا سورۃ بقرۃ (۱)تا(۲)	۱ -۶۷۱
جلد دوم	سورۃ آل عمران تا سورۃ مائدہ (۳)تا(۵)	۱-۶۳۳
جلد سوم	سورۃ انعام تا سورۃ توبہ (۶)تا(۹)	۶۹۱
جلد چہارم	سورۃ یونس تا سورۃ مریم	
جلد پنجم	سورۃ طٰہٰ تا سورۃ قصص (۲۰)تا(۲۸)	۷۴۵
جلد ششم	سورۃ عنکبوت تا سورۃ زمر (۲۹)تا(۳۹)	۶۳۱

(۱) قرآن مجید کی تفسیریں چودہ سو برس میں، فخر الاسلام اعظمی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء، ص ۳۸۶

جلد ہفتم	سورۃ مومن تا سورۃ ذاریات (۴۰)تا(۵۱)	۶۴۶
جلد ہشتم	سورۃ طور تا سورۃ جن (۵۲)تا(۷۲)	۶۴۰
جلد نہم	سورۃ مزمل تا سورۃ ناس (۷۳)تا(۱۱۳)	
توضیحی اشارات	عرض مرتب، اسالیب کلام الٰہی، استفادہ کے ماخذ، اسماء الحسنیٰ، اعتراضات الفاظ و ترکیبات، امکن، تحریف تورات ،ذات باری تعالیٰ ، رسالت مآب ﷺ، سنن الٰہی، سوالات، شخصیات، اقوام، فقہی اشارات، کتب، مشکلات قرآن، موجودہ مسلمانوں سے خطاب، موضوعات، نظام القرآن، نقطہ نظر۔	۷۰۷

خصوصیات تفسیر "تدبر قرآن"

۱) قرآن کی زبان پر خصوصی توجہ:

قرآن پاک کی زبان عربی ہے۔ عربی زبان فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے۔ تفسیرِ قرآن کے مفسر امین احسن اصلاحی عربی زبان پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔ وہ الفاظ کے معنی و مفہوم، اتار چڑھاؤ، پس منظر کے بارے میں گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ امین احسن صاحب نے تدبر قرآن لکھنے سے پہلے ادب جاہلی کے تمام ذخیرے کو اچھی طرح پڑھا ہے کیونکہ قرآن جس عربی میں نازل ہوا ہے وہ عربی دوسری مختلف جگہ بولی جانے والی عربی سے مختلف ہے۔ مفسر خود تدبر قرآن کے دیباچے میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں؛

"قرآن جس عربی میں نازل ہوا وہ نہ تو حریری اور متنبی کی زبان ہے اور نہ ہی مصر اور شام میں بولی جانے والی عربی زبان میں ہے بلکہ قرآن اس ٹکسالی زبان میں ہے جس کے آگے عرب کے لبید جیسے عظیم شاعر نے سر تسلیم خم کیا تھا"۔(۱)

تفسیر کے لیے صاف اور شستہ اردو زبان کو چنا گیا ہے تاکہ ہر طبقے کے لوگ اس سے استفادہ کر سکیں نیز اس میں مشکل الفاظ اور تصریحات کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔

---

(۱) تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، ۱/۸

۲) تفسیر میں احادیث سے استفادہ:

مولانا اصلاحی ان علماء میں سے ہیں جو حجیت حدیث کے حامیوں میں سے ہیں لیکن ہم ان کے ہاں حدیث کی حجیت کے بارے میں کچھ تردد دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں،

" تفسیر کے ظنی ماخذ میں سے حدیث کو سب سے زیادہ شرف حاصل ہے اگر اس کی صحت کا اطمینان حاصل ہو جائے تو تفسیر میں اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے جیسا کہ سنت متواترہ کی اہمیت مسلم ہے لیکن جب تک اس سے یقینی علم حاصل نہ ہو جائے۔ اس لیے حدیث جو مذکورہ قطعی اصولوں سے موافقت رکھتی ہو اسی سے استفادہ کیا جا سکتا ہے "۔[۱]

یہی وجہ ہے کہ مصنف نے تفسیر میں احادیث متواترہ اور مشہورہ سے ہی زیادہ استفادہ کیا ہے۔

۳) لسان العرب[۲] سے استفادہ:

مولانا صاحب نے تفسیر مذکورہ میں لسان العرب سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے قرآن فہمی کے لیے زبان کے مسئلے کو محدود مفہوم میں نہیں لیا کیونکہ زبان کو سمجھے بغیر محض لغت کی ورق گردانی سے قرآن کے محاسن کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس بات کا خود اقرار کرتے ہیں۔

" میں نے جس لغت سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے وہ لسان العرب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب لسان استعمالات اور شواہد و نظائر کے ذریعے سے اکثر الفاظ کے مختلف پہلو واضح کر دیتے ہیں یہ چیز بہت مفید ہے میرے نزدیک لسان کی اہمیت اس پہلو سے ہے اور اس مقصد کے لیے کہ اس کی مراجعت کرنی چاہیے۔ بعض اوقات قرآن کے کسی لفظ کے تحت اہل تاویل کے اقوال جو وہ نقل کر دیتے ہیں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن عام لوگ اس کو بڑی تحقیق سمجھتے ہیں "۔[۳]

تفسیر القرآن بالقرآن:

مولانا اصلاحی قران مجید کو قرآن مجید ہی کی مدد سے سمجھنا اور سمجھانا چاہتے تھے اگرچہ جمہور علماء نے بھی اس کو اول اصول تفسیر کے طور پر قبول کیا ہے اور یہی خصوصیت تدبر قرآن میں بھی موجود ہے۔ اس لیے اس تفسیر میں نہ صرف آیات کے نظم اور تاویل کے بارے میں اعتماد قرآن کے شواہد و نظائر پر کرتے ہیں بلکہ الفاظ کی مشکلات میں بھی قرآن سے استفادہ کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں تیسری چیز جو اس تفسیر میں میں نے بطور اصول پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن

---

(۱) تدبر قرآن، ۱/ ۳۰

(۲) لسان العرب، ابن منظور

(۳) تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، ۱/ ۱۱

کی مدد سے کی جائے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں میں بطور تحدیث نعمت کے یہ تحریر کرتا ہوں کہ مجھ پر قرآن کی مشکلات خود قرآن سے واضح ہوتی ہیں دوسری کسی بھی چیز سے واضح نہیں ہوتیں۔ مزید رقمطراز ہیں،

"میں نے نہ صرف آیات کے نظم اور ان کے تاویل کے تعین میں اصل اعتماد قرآن کے شواہد و نظائر پر کیا ہے بلکہ الفاظ و اسالیب کی مشکلات میں بھی قرآن سے ہی استفادہ کیا ہے"۔ (۱)

مولانا خود تفسیر کے مقدمے میں بیان کرتے ہیں،

"اس تفسیر کی بنیاد مروجہ طریقہ تفسیر کی طرح تفسیر کی کتابوں پر نہیں ہے۔ بلکہ براہ راست فہم قرآن کے اصل وسائل اور ذرائع پر ہے۔ اور قرآن پر تدبر کرنے والے جانتے ہیں کہ قرآن مجید تکرار محض سے پاک ہے۔ اس میں ایک بات جو بار بار آتی ہے تو بعینہ ایک ہی پیش و عقب اور ایک ہی قسم کے لواحق اور تضمات کے ساتھ نہیں آتی بلکہ ہر جگہ اس کے اطراف و جوانب اور اس کے تعلقات و روابط بدلے ہوئے ہوتے ہیں"۔ (۲)

سنت اور حدیث کے معاملے میں تو امین صاحب پر اعتراض کیا جا سکتا ہے تاہم تفسیر القرآن بالقرآن کے اصول کو اس تفسیر میں مکمل طور پر منضبط کیا گیا ہے۔

منطقی اور کلامی مباحث سے اجتناب:

تفسیر تدبر قرآن میں امین احسن صاحب منطقی و کلامی مسائل سے اجتناب برتتے ہیں اور گزشتہ انبیاء کے صحائف اور کتب سے استفادہ کرتے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مصنف کتب سابقہ پر زیادہ نظر رکھتے ہیں تو بے جا نہ ہو گا۔ اس تفسیر میں ہر آیت کے تحت اس حد تک بحث کی گئی ہے کہ جس حد تک اس کا اصل مدعا واضح کرنے کے لیے مناسب خیال کیا ہے۔ اور آیت سے متعلقہ دوسرے ضمنی ماخذ میں پڑنے سے احتراز کیا گیا ہے۔

غیر مقلدانہ تفسیر:

امین احسن صاحب اپنی اس تفسیر میں فقہی مسلک کے لحاظ سے آزاد خیال نظر آتے ہیں کسی خاص فقہی یا کلامی مسلک کے پیروکار نہیں ہیں۔ وہ عام حدیث سے استدلال کرنے کی بجائے صرف حدیث متواترہ اور مشہورہ کو ہی قرآن فہمی کا بہت بڑا خارجی وسیلہ جانتے ہیں۔ (۳)

---

(۱) تدبر قرآن، مقدمہ، امین احسن اصلاحی، ۱/۲۷

(۲) ایضاً، ۱/۲۸

(۳) تیسیر القرآن، حافظ احمد رضا اعظمی، مکتبہ دانیال، لاہور ۱۹۹۴ء، ص ۲۱۶

دعوت غور و فکر اور تدبر:

تفسیر "تدبر قرآن" کے نام سے ہی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مفسر قرآن مجید میں غور و فکر اور تدبر کی دعوت دینے کا خواہاں ہے۔ مولانا خود فرماتے ہیں،

"یہ حقیقیت ہمیشہ پیش نظر رکھیے کہ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے امتیازات کے لیے ایک کسوٹی کے طور پر ہاتھوں میں دیا ہے۔ اگر یہ کسوٹی ہمارے پاس نہ رہے یا ہم اس کے استعمال سے نا آشنا ہوں تو پھر حق و باطل میں امتیاز کے لیے ہمارے پاس کوئی روشنی باقی نہ رہ جائے۔ میں نہایت صدمے کے ساتھ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ اس وقت قرآن تو موجود ہے لیکن اس کا علم ہمارے اندر موجود نہیں ہے . اس امت کو اگر بحیثیت امت مسلمہ زندہ رکھنا ہے تو یہ کام محض وحدت امت کی مالا جپنے سے یا قرآن کا وظیفہ پڑھتے رہنے سے حاصل نہیں ہو گا بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کے معنی و مفہوم پر غور و فکر کیا جائے۔ اس لیے کے جن کے اندر قرآن پاک کا صحیح عمل پیدا ہو گا۔ اور اس بات کی جب بھی اصلاح ہو گی انھی کے مبارک ہاتھوں سے ہو گی لہذا غور و فکر اور تدبر ضروری ہے تا کہ اس وقت کے آخر دور کے لوگ بھی اس چیز سے اصلاح پذیر ہوں جس سے اس کے دور اول کے لوگ اصلاح پذیر ہوئے۔[۱]

شعری وسائل سے استفادہ:

تفسیر میں انداز بیان کو خوبصورت بنانے کے لیے شعری وسائل سے بھی مدد لی گئی ہے۔ جو کسی تفسیر کی ادبی خصوصیات میں اضافہ ہے اگر چہ اس کا جابجا استعمال نہیں کیا گیا تاہم بہت سی جگہوں پر شعروں کا استعمال کیا گیا ہے ان میں فارسی و اردو دونوں شعر شامل ہیں۔ اس چیز نے بھی انداز بیان کی چاشنی میں اضافہ کیا ہے مثلا

"سب سے زیادہ عالی مقام اور صاحب قرب حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں لیکن ان کی رسائی کی بھی ایک حد مقرر ہے۔ وہیں سے وہ انوار و تجلیات سے بہرہ یاب ہوتے ہیں اگر اس سے ذرا آگے قدم بڑھائیں تو:

مولانا نے اردو کے شعر بھی بہت سی جگہوں پر استعمال کیے ہیں چنانچہ مولانا تفسیر میں سورۃ یونس کی آیت ۶۱- ۶۵ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"اس آیت میں مومنین کو تسلی و تشفی دی گئی ہے کہ تم کسی کی مخالفت کی مطلق پروانہ کرنا بلکہ تن من دھن میں ہر چیز سے بے پرواہو کر خدا کے کلمہ کی سر بلندی کی جدوجہد میں لگے رہو تو ہم تمہارے پیچھے تمہاری حفاظت و نگرانی میں مصروف ہوتے ہیں"۔ اس کے بعد انہوں نے مولانا محمد علی جوہر کا یہ شعر نقل کیا ہے:

---

(۱) ماہنامہ اشراق، تدبر قرآن، جاوید احمد غامدی، جنوری ۱۹۹۸ء، ص ۱۴۸

کیا غم ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے [1]

تعصب سے پاک تفسیر:

مولانا نے تدبر قرآن میں جابجا عقلی استدلال کیا ہے۔ اس بارے میں خود مولانا کا بھی کہنا ہے کہ میرا مقصد ایک ایسی تفسیر لکھنا ہے کہ میں ہر قسم کے بیرونی لوث ولگاؤ سے اور ہر قسم کے تعصب و تحریف سے آزاد اور پاک ہو کر آیت کا وہ مطلب سمجھوں اور سمجھاؤں جو فی الواقع اور فی الحقیقت اس آیت سے نکلتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بیرونی لگاؤ اور تعصب سے پاک ہو کر یہ تفسیر لکھی ہے۔ اور اس تفسیر کا دارو مدار عقل پر رکھا ہے اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

تدبر قرآن میں یہ عقلی استدلال اتنا واضح اور عام فہم انداز میں کیا گیا ہے کہ ایک عام آدمی بھی اسے آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ تفسیر میں اس عقلی استدلال میں بھی کہیں ایسی بات نہیں کی گئی جو عام آدمی کی سمجھ سے بالاتر ہو۔

مولانا عقلی استدلال سے مخالفین کے اعتراضات کا رد کرتے ہیں جیسا کہ خاندانی منصوبہ بندی کو انہوں نے اپنے مدلل عقلی انداز میں رد کیا ہے۔ حالانکہ امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ بھی خاندانی منصوبہ بندی کے قائل تھے اور انہوں نے اس کا جواز بھی ثابت کیا تھا۔ [2]

تفسیر تدبر قرآن میں عقلی استدلال کی ایک اور مثال "روزے کا اثر انسان کی صلاحیت کار" کے عنوان سے کرتے ہیں جس سے وہ مغرب کے مادہ پرستانہ فلسفہ زندگی کو بھرپور انداز میں رد کرتے ہیں کہ روزے سے صلاحیت کار اور قوت کار کردگی بہت کم ہو جاتی ہے۔ مولانا انتہائی خوبصورت انداز میں عقلی استدلال سے اس عقیدے کی نفی کرتے ہیں۔

تفرد تدبر قرآن کی نمایاں خصوصیت:

تدبر قرآن کی ایک اور بڑی خصوصیت تفرد ہے مولانا اصلاحی بعض معاملات میں دوسرے مفسرین سے الگ نظریہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ عقلی استدلال بھی کرتے ہیں اور لغوی تحقیق بھی پیش کرتے ہیں۔ مثلاً سورۃ بنی اسرائیل:۷۹ میں "مقام محمود" ایک ایسا مقام ہو گا جہاں بلند مرتبہ ہو گا اور مدح وستائش کی بارش ہو گی جبکہ اصلاحی صاحب نے اس سے مراد جگہ نہیں لی۔ تدبر قرآن میں لکھتے ہیں، "ہمارے نزدیک مقام محمود ظرف کے معنی میں نہیں بلکہ مصدر کے معانی میں ہے اور یہاں یہ مفعول مطلق کی حیثیت رکھتا ہے چونکہ لفظ بعثت اور مقام میں بھی معنی کا اشتراک موجود ہے اس لیے کہ بعثت کے

---

(۱) تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، ۴/۲۲۶
(۲) ایضاً، ۱/۸۶

معنی اٹھانے اور مقام کے معنی کھڑے ہونے اور اٹھنے کے ہیں اس وجہ سے اس کے مفعول مطلق واقع ہونے میں کوئی قباحت نہیں"۔[1]

اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں تدبر قرآن میں جن میں مولانا جمہور علماء سے ہٹ کر تفسیر بیان کرتے ہیں۔

داعیانہ انداز تفسیر:

تدبر قرآن کی نمایاں خصوصیت اس کا داعیانہ انداز بیان ہے یہ پڑھنے والوں کو دعوت دین دیتی ہے۔ اور دوسروں کو بھی تدبر قرآن کی دعوت دیتی ہے۔ تفسیر میں جو داعیانہ انداز بیان ہے اس کے لیے عقلی استدلال سے اور مثالوں سے بات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ امین احسن صاحب اپنی تفسیر میں جس خوبصورت انداز میں دعوت غور وفکر اور تدبر اور دعوت دین دیتے ہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ مولانا انتہائی دلکش اور پرسوز انداز میں دعوتی آیات کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں کہ دین کی باتیں دلوں تک اثر کرتیں ہیں اور دین کی خدمت کے لیے مر مٹنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ انہوں نے قرآن پاک میں غوروفکر اور تدبر کی دعوت بھی دی اور اس کے لیے انہوں نے اپنی کتاب "مبادی تدبر قرآن" میں تدبر کے اصول بھی بیان کیے ہیں تاکہ ایک عام آدمی بھی قرآن کو سمجھ سکے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا نے داعیانہ انداز بیان اختیار کر کے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ مولانا داعیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے محض مولویانہ انداز اختیار نہیں کرتے بلکہ دل کو لگنے والے دلائل دیتے ہیں اور یہ ان کے داعیانہ انداز کی بڑی خوبی ہے۔

نظم قرآن:

۱. تدبر قرآن کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت جو اسے دیگر تمام تفاسیر سے ممتاز کرتی ہے وہ نظم قرآن ہے۔ چونکہ عام طور پر علمائے تفسیر نے اس کی طرف بہت کم توجہ دی ہے اور بہت سے علمائے کرام نظم کی تلاش کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں۔

تفسیر تدبر قرآن میں نظم قرآن کے موضوع کو شدت سے بیان کیا گیا ہے۔[2]

تفسیر کا مقدمہ پڑھتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس میں نظم قرآن کو کیا اہمیت حاصل ہے یوں امین احسن اصلاحی صاحب نے مخالفین اسلام کے اعتراض کو پرزور طریقے سے رد کر دیا ہے۔ اور نظم قرآن کو تفسیر کے بنیادی وسائل میں شامل

(۱) تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، ۳/ ۷۷۵

(۲) ماہنامہ فکر و نظر، برصغیر کی چند اہم تفاسیر کا تقابلی جائزہ، خورشید احمد ندیم، فروری ۱۹۹۸ء، شمارہ ٦

کیا اور مستشرقین کے اعتراضات کو کامیابی کے ساتھ رد کیا ہے اکثر اوقات یہ نظم بہت متاثر کرتا ہے۔ اصلاحی صاحب تدبر قرآن کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

"نظم نویسی کلام کا ایسا جزلاینفک ہے کہ اس کے بغیر کسی عمدہ کلام کا تصور نہیں کیا جا سکتا"۔ (۱)

(۲) چنانچہ امین احسن صاحب کی تفسیر تدبر قرآن نظم قرآن کی نمائندہ تفسیر ہے، خود فرماتے ہیں،

"میں نے اس تفسیر میں چونکہ نظم کلام کو پوری اہمیت دی ہے اس وجہ سے میں نے ہر جگہ ایک ہی قول اختیار کیا ہے بلکہ اگر میں اس حقیقت کو صحیح لفظوں میں بیان کروں تو مجھے یہ کہنا چاہیے کہ مجھے ایک ہی قول اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے کیونکہ نظم کی رعایت کے بعد مختلف وادیوں میں گردش کرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ صحیح بات اس طرح سامنے آتی ہے کہ آدمی اگر بالکل اندھا بہرا متعصب نہ ہو تو اپنی جان تو قربان کر سکتا ہے لیکن اس سے انحراف برداشت نہیں کر سکتا۔ (۲)

(۳) نظم کی اہمیت میں مولانا امام فخر الدین رازی (۳) کا حوالہ دیتے ہیں۔

"ترتیب اور نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے، ایک اس کے مشکل ہونے کے سبب سے مفسرین نے اس کی طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ امام فخر الدین کو اس کا سب سے زیادہ اہتمام رہا ہے اور ان کا یہ کہنا ہے کہ حکمت قرآن کا اصل خزانہ اس کے نظم و ترتیب میں چھپا ہوا ہے۔ (۴)

(۴) غرض تدبر قرآن علمی اور ادبی لحاظ سے نمایاں حیثیت کی حامل ہے یہ تفسیر نظم قرآن بالقرآن کا شاہکار نمونہ ہے۔ تفسیر کی ایک اور خوبی اس کا زور بیان ہے زبان نہایت شستہ شاندار اور باوقار ہے۔ تشبیہ اور استعارہ کا خوبصورت استعمال ہے اور شعری وسائل سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جس سے انداز تحریر شگفتہ ہو گیا ہے۔ اس تفسیر کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ قرآن مجید کی کل آیات کی تعداد ٦٦٦٦ ہے اور تفسیر تدبر قرآن کے بھی کم و بیش اتنے ہی صفحات ہیں گویا ہر آیت کی تفسیر کے لیے کتاب کا ایک صفحہ مختص ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید کا زمانہ نزول ۲۳ سال ہے اور تدبر قرآن کا زمانہ تحریر و تسوید بھی ۲۳ سال ہے۔ یہ تفسیر قرآن کے طلباء کے لیے ایک عمدہ تفسیر ہے اور تفسیری ذخیرے میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔

---

(۱) مبادی تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، فاران فاونڈیشن، لاہور، اگست ۱۹۹۹ء، ص ۱۹۴

(۲) تدبر قرآن، ۱/۱۹۷

(۳) آپ کا پورا نام فخر الدین ابو عبد اللہ محمد بن عمر بن الحسین رازی ہے۔ ۱۱۴۹ میں پیدا ہوئے۔ فقہ، منطق، ریاضی، طب اور تفسیر میں مہارت تامہ حاصل کی۔ مفاتیح الغیب آپ کی شہرہ آفاق تصنیف ہے۔ آپؒ نے ۱۲۱۰ میں وفات پائی۔ (اصول تفسیر و تاریخ تفسیر، فقیر محمد، ص ۱۲۱)

(۴) الاتقان فی علوم القرآن، علامہ جلال الدین سیوطی، مطبعہ حجازی، قاہرہ، ۱۳۶۵ھ، ۲/۱۰۸

تفہیم القرآن کا تعارف اور خصوصیات

مفسر تفہیم القرآن کا تعارف

تفسیر "تفہیم القرآن" کے مصنف مولانا ابوالاعلی مودودی صاحب ہیں۔ مودودی صاحب کی ولادت ۳رجب ۱۳۲۱ھ بمطابق ۲۵ دسمبر ۱۹۰۳ء ہے۔ ان کی پیدائش حیدر آباد دکن میں ہوئی۔ (۱)

مولانا مودودی ایک عالم دین اور مفکر اسلام تھے۔ مودودی صاحب عملاً ایک اسلامی معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے اور وہ جانتے تھے کہ ایسا تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب مسلمان صرف قرآن پاک کو سنہری غلافوں میں لپیٹ کر نہ رکھیں بلکہ اس عظیم کتاب کی لازوال تعلیمات کو سمجھیں اور اپنی زندگیوں کے شب و روز کو اس کی روشنی میں ڈھالیں۔ چنانچہ اسلامی تعلیمات کو پھیلانے کے لیے انہوں نے ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی اور مولانا کو متفقہ طور پر جماعت اسلامی کا امیر مقرر کیا گیا۔ (۲)

مودودی صاحب کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ وہ دین اسلام کو ایک کل کی حیثیت سے لیتے ہیں وہ مذہب اسلام کو صرف مسجد اور خانقاہ تک محدود نہیں رکھتے بلکہ وہ انسانی زندگی اور لوازمات زندگی کو مذہب کے تابع اور فرمان بتاتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں،

"انسانی زندگی کے مختلف پہلو انسانی جسم کے اعضاء کی طرح ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں اور ان کے اندر ایک ہی روح جاری ہے اگر یہ روح خدا اور آخرت سے بے نیازی اور تعلیم انبیاء سے بے تعلقی کی روح ہے تو پوری زندگی کا نظام ایک دن باطل بن کر رہ جاتا ہے اور اگر یہ خدا اور آخرت پر ایمان اور تعلیم انبیاء کے اتباع پر مبنی ہو تو یہ نظام دین حق بن جاتا ہے۔ چنانچہ اقامت دین سے ہماری مراد یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں خدا کا دین قائم کیا جائے اور رسول ﷺ کی تعلیمات کے مطابق چلایا جائے جنھیں ہم اپنا ہادی برحق مان چکے ہیں اب ہماری زندگی کے ہر پہلو کو مسلمان ہونا چاہیے ہم کسی پہلو کو شیطان کے حوالے نہیں کر سکتے ہمارے ہاں سب کچھ خدا کا ہے شیطان کا نہیں۔ ہمیں کہا جاتا ہے کہ تم صرف مذہب کی تبلیغ کرو سیاست میں کیوں دخل دیتے ہو ہم اس بات کے قائل ہیں کہ "جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی" ہمارا مذہب قرآن و حدیث کا مذہب ہے جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں اور وہ مذہب سیاست میں محض دخل نہیں دیتا بلکہ اس کو ایک جز بنا کر رکھنا چاہتا ہے"۔ (۳)

---

(۱) مفکر اسلام سید ابوالاعلی مودودی، عبدالرحمن چوہدری، ادارہ معارف اسلامی، لاہور ۱۹۹۱ء، ص ۱۲۱

(۲) جماعت اسلامی کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل، مولانا مودودی، شعبہ نشر و اشاعت جماعت اسلامی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۳۶

(۳) جماعت اسلامی اس کا مقصد، تاریخ لائحہ عمل، مولانا مودودی، ص ۱۰۹

تبلیغ اور اصلاح کی اہمیت سید مودودی کے الفاظ میں:

"واقعہ یہ ہے کہ بگڑی ہوئی سوسائٹی کے درمیان علم صحیح اور عمل صالح رکھنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک وبائے عام میں مبتلا ہو جانے والی بستی کے درمیان چند تندرست لوگ موجود ہوں جو کچھ طب کا علم بھی رکھتے ہوں اور کچھ دواؤں کا ذخیرہ بھی ان کے پاس ہو مجھے بتایئے کہ اس وبازدہ بستی میں چند ایسے لوگوں کا حقیقی فرض کیا ہے؟ کیا یہ مریضوں سے نفرت کریں اور انہیں دور بھگائیں یا اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر ان کا علاج کریں اگر یہ لوگ پہلی صورت اختیار کریں تو خدا کے ہاں الٹے مجرم قرار پایئں گے اور ان کی اپنی تندرستی علم طب سے واقف ہونا اور ان کے پاس دواؤں کا ذخیرہ ہونا نافع ہونے کی بجائے الٹا ان کے جرم کو اور زیادہ سخت بنا دے گا"۔(۱)

مودودی صاحب کی نظر میں داعی کا مقام:

مبلغ کے بارے میں مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ

"جو اللہ کے دین کی خاطر کام کرتا ہو تو اس میں دو صفتیں ضرور ہونی چاہیں ایک صبر اور دوسری حکمت۔ صبر کا تقاضا ہے کہ جو رکاوٹیں پیش آئیں ان پر آپ نہ تو مشتعل ہوں اور نہ ہی اپنا ذہنی توازن کھویئں نہ دل شکستہ ہو کر بیٹھیں بلکہ ہر رکاوٹ پیش آنے پر آپ اپنا عزم جوں کا توں رکھیں جذبات کی گرمی سے اپنے دماغ کو محفوظ رکھ کر وہ راستہ اختیار کریں جو حکمت کے مطابق ہو۔ اور حکمت یہ ہے کہ آپ میں صلاحیت ہو کہ ایک راستہ بند ہوتے ہی دوسرے راستے وقت پر نکال لیں جس میں حکمت نہیں ہوتی وہ ایک راہ کو بند پا کر بیٹھ جاتا ہے اور اگر داعی اس کے ساتھ بے صبرا ہو تو اپنا سر پھوڑ لیتا ہے جبکہ صبر اور حکمت کی صفات سے مالامال داعی کی منزل کوئی کھوٹی نہیں کر سکتا چٹانیں منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں اور دریا کسی اور طرف سے اپنی منزل کی طرف بہہ نکلتا ہے"۔(۲)

مودودی صاحب ایک عالم دین اور مجدد شخصیت ہیں انہوں نے اسلام کے مذہبی، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں پر ۸۰ سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں انہوں نے لاکھوں مسلمانوں کو اپنی حرارت ایمانی سے گرما دیا۔ اور ایک واضح نصب العین اور اخروی نجات کی تڑپ پیدا کی۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان ان ذمہ داریوں کو سمجھیں جو کلمہ پڑھنے کے بعد ان پر عائد ہوتی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمان کی صرف یہ ذمہ داری نہیں کہ وہ خود مسلمان ہو جائے بلکہ بہت بھاری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس حق کا گواہ بن کر کھڑا ہو جائے جس پر وہ ایمان لایا ہے۔ مسلمان کے نام سے آپ کو ایک مستقل امت بنانے کی واحد

(۱) دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات، سید ابو اعلیٰ مودودی، اسلامک پبلیکیشنز، منصورہ، لاہور، اپریل ۲۰۱۳ء، ص ۶۰،۵۹

(۲) ایضاً

غرض جو قرآن میں بیان کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ مسلمان بزرگان خدا پر شہادت حق کی حجت پوری کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی ساری زندگی اسی دعوت و تبلیغ کے عظیم مشن میں گزری اور آخر کار ۲۲ دسمبر ۱۹۸۹ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

تفہیم القرآن کا تعارف:

امت مسلمہ کے لیے مودودی صاحب کا سب سے اہم کارنامہ "تفہیم القرآن" کی تفسیر ہے۔ مودودی صاحب نے جب سے تفہیم القرآن لکھنی شروع کی اس وقت سے اس کی قسطیں "ترجمان القرآن" سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ ادارہ ترجمان القرآن موجودہ جماعت اسلامی کا سنگ بنیاد ہے۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں،

"قرآن شاہ کلید ہے لہذا دین کا جامع تصور سمجھنے کے لیے قرآن سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں"۔[۱]

مودودی صاحب یہ چاہتے تھے کہ مسلمان دین محمدی ﷺ کے داعی ہونے کا حق ادا کریں اور قرآن پاک کی تعلیمات پر عمل کریں تاکہ عملاً ایک اسلامی معاشرے کا قیام عمل میں لایا جا سکے۔ مودودی صاحب کا قرآن کا درس دینے کا انداز اتنا خوبصورت جامع اور داعیانہ خلوص و چاؤ لیے ہوئے تھا کہ لوگوں نے آپ سے اسے قلمبند کرنے کی سفارش کی چنانچہ فروری ۱۹۴۲ء میں ترجمان القرآن کے شمارے سے اس عظیم سلسلے کا آغاز ہوا جو تیس سال چار ماہ کی مودودی صاحب کی تحقیق و جستجو کے بعد جون ۱۹۷۲ء کی ایک بابرکت ساعت میں مکمل ہوا۔[۲]

مودودی صاحب نے اس تفسیر میں ایک طرف تو بہت خوبصورت انداز میں مغربی تہذیب کی چکاچوند کی نفی کرتے ہیں اور لادینی عقائد کی بھی اصلاح کرتے ہیں اور قرآن پر اٹھائے جانے والے اعتراضات کو جامع انداز میں دلائل کے ساتھ رد کرتے ہیں۔ تفہیم القرآن میں مولانا صاحب نے روایت و درایت کے اصولوں کا خصوصی اہتمام بھی کیا ہے۔ وہ مستشرقین اور عیسائی مشنریوں کے شکوک و شبہات کا ازالہ بھی کرتے ہیں اور فتنہ انکار رسالت اور قادیانیت کا توڑ بھی کرتے ہیں۔ مودودی صاحب اپنی مشہور زمانہ تفسیر میں نسل نو کے سمجھنے کے لیے قرآن پاک کے ترجمے کو ایسے خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ایک عام شخص بھی صرف ترجمے کو پڑھ کر مفہوم تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

تفہیم القرآن کی خصوصیات

تفسیر بالماثور کا اہتمام:

مودودی صاحب اپنی تفسیر میں تفسیر بالثمور کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں چنانچہ تفہیم القرآن میں آیات کی تفسیر کرتے وقت وہ اس موضوع سے متعلقہ دیگر آیات کو بھی مد نظر رکھتے ہیں یوں ایک ہی موضوع سے متعلقہ احکامات کھل کر

---

(۱) مقدمہ تفہیم القرآن، ۱/۱۳

(۲) سید مودودی بچپن جوانی بڑھاپا، سید اسعد گیلانی، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور ۲۰۰۲ء، ص ۶۱۲

سامنے آتے ہیں۔ مودودی صاحب کے نزدیک تفسیر کا پہلا اور بنیادی ماخذ بذات خود قرآن کریم ہے کیونکہ قرآن کا بعض حصہ بعض حصے کی تفسیر کرتا ہے اور جہاں ایک مقام پر کوئی بات مختصرا بیان ہوتی ہے تو دوسرے مقام پر مفصل، جہاں ایک جگہ مطلق بیان ہوتا ہے تو دوسری جگہ مقید اس لیے مودودی صاحب آیات کی تشریح و توضیح میں اس سے متعلقہ آیات کا حوالہ دیتے ہیں تاکہ مفہوم قرآن مکمل طور پر واضح ہو جائے۔

تفسیر القرآن بالحدیث:

مودودی صاحب کی تفسیر کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ ان کی تفسیر میں تفسیر القرآن بالقران کے ساتھ ساتھ تفسیر القرآن بالحدیث کا غیر معمولی اہتمام کیا گیا ہے۔ تفہیم القرآن میں ذکر کردہ احادیث مبارکہ کی جامع کتب کا جامع الصحیح بخاری، صحیح مسلم سے مطابقت کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مودودی صاحب نے اپنی تفسیر میں جن احادیث مبارکہ کو شامل کیا ہے ان کی صحت کے بارے میں روایت و درایت کے اصولوں کو مد نظر رکھا ہے۔ علّامہ فرماتے ہیں:

"میں نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے میں اس امر کی پوری کوشش کی ہے کہ میں قرآن مجید کی تفسیر احادیث صحیحہ کی روشنی میں کروں کیونکہ قرآن و حدیث کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور یہ بات قطعی طور پر غلط ہے کہ ہم قرآن کو حدیث کے بغیر بھی سمجھ سکتے ہیں بلکہ ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ قرآن کا فہم اگر حاصل ہو سکتا ہے تو وہ سنت نبوی سے ہی ہو سکتا ہے"۔[۱]

مثال:

﴿قَالَ ٱلَّذِينَ غَلَبُواْ عَلَىٰٓ أَمۡرِهِمۡ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيۡهِم مَّسۡجِدًا﴾[۲]

ترجمہ: مگر جو لوگ ان کے معاملات پر غالب تھے انہوں نے کہا ہم تو ان پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔

مولانا اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے قرآن مجید کی آیت کا الٹا مفہوم لیا ہے وہ اسے دلیل ٹھہرا کر مقابر صلحاء پر عمارتیں اور مسجدیں بنانے کو جائز قرار دیتے ہیں حالانکہ قرآن میں یہاں ان کی گمراہی کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے شرک کی راہ اختیار کرلی جبکہ نبی ﷺ کے ارشادات اس کی نفی کرتے ہیں۔

((قال رسول ﷺ لعنة الله علیٰ الیهودوالنصاری اتخذ و اقبور انبیائهم مساجد))[۳]

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے لعنت فرمائی یہود اور نصاری پر انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا۔

---

(۱) سنت کی آئینی حیثیت، مولانا مودودی، اسلامک پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۱۹۸۷ء، ص ۷۷

(۲) سورۃ الکھف: ۱۸/۲۱

(۳) صحیح بخاری، حدیث نمبر ۳۱۲۱

اس طرح مولانا مودودی اپنی تفسیر قرآن میں جابجا احادیث کا حوالہ پیش کرتے ہیں اور مستند کتابوں سے رجوع کرتے ہیں چنانچہ مودودی صاحب اپنی تفسیر میں لوگوں کے غلط عقائد کی نفی بھی احادیث مبارکہ کی روشنی میں کرتے ہیں۔

تفسیر القرآن آثار صحابہؓ کی روشنی میں:

قرآن وسنت کے بعد مودودی صاحب اپنی تفسیر میں اجماع صحابہؓ اور تعامل صحابہؓ کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔ خصوصاً فقہی مسائل کے حل کے لیے وہ قرآن وسنت کے بعد تیسری حیثیت میں اجماع صحابہؓ کو آئین کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔اور یہ مولانا کی وسعت علمی اور صحابہ کرامؓ سے گہری عقیدت و محبت ہے کیونکہ قرآن پاک کے اولین مخاطب یہی لوگ تھے اور یہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی اور منشا کو بہتر طور پر جان سکتے تھے۔

مثلاً آیت مبارکہ

﴿ لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا ٱلْمُطَهَّرُونَ ﴾[1]

ترجمہ: جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔

مودودی صاحب اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ کفار مکہ حضور ﷺ کو کاہن قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ کلام شیاطین القا کرتے ہیں تو آیت مبارکہ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ "اسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا"یعنی فرشتوں کے سوا کوئی قریب بھی نہیں پھٹک سکتا اور فرشتوں کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے کیونکہ وہ ہر قسم کے ناپاک جذبات اور خواہشات سے پاک ہیں۔[2]

یہاں اس آیت مبارکہ کی تفسیر کرتے وقت مولانا فرماتے ہیں کہ اس آیت کی یہی تفسیر انس بن مالک، ابن عباس، سعد بن جبیر، عکرمہ، مجاہدہ، قتادہ، ابو العالیہ، سدی، ضحاک اور ابن زید نے بیان کی ہے۔[3]

یوں اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں جن میں مودودی صاحب تفہیم القرآن میں آثار صحابہ سے استفادہ کرتے ہیں۔

تفہیم القرآن میں تقابل ادیان:

تفہیم القرآن کی ایک اور خوبی جو میرے نزدیک اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ تفہیم القرآن میں یہودیت، عیسائیت اور قرآن کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے لیکن ان مباحث میں مناظرے کا رنگ بھی پایا جاتا ہے مودودی صاحب نے ایک طرف تو یہ کوشش کی ہے کہ ان اعتراضات کا کافی شافی جواب دیا جائے جو مغربی اہل قلم اور مستشرقین نے قرآن پر کیے ہیں اور دوسری

---

(۱)سورۃ الواقعہ:۵۶/۷۹

(۲) تفہیم القرآن، سید مودودی، ۵/ ۲۹۱

(۳)ایضاً

طرف قرآن کے انداز اور موجودہ بائبل کے انداز کا فرق واضح کر دیا جائے تا کہ تسلیم شدہ کتاب تحریف شدہ کتاب سے ممیز اور ممتاز ہو جائے۔ مودودی صاحب قرآن کو اپنی دلیل کی بنیاد بتاتے ہیں پھر دوسرے مذاہب نے جس شکل میں موضوع کو پیش کیا ہے اس پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں اور دونوں کا موازنہ کر کے "حکم" قرآن کو بناتے ہیں یوں مودودی صاحب کی اس تفسیر کی یہ عظیم خوبی ہے کا وہ تقابل ادیان کو خوبصورتی سے واضح کرتے ہیں اور یہود و نصاری کے عقائد کو ان کی مذہب کی کتابوں میں لکھے گئے عقائد کی مدد سے رد کر دیتے ہیں۔ جس سے تعلیمات قرآنی کی حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے جس سے ایک عام قاری بھی اسلام اور دیگر الہامی کتب کی تعلیمات کو سمجھ سکتا ہے جس سے ایمان اور عقیدے میں مزید پختگی واضح ہوتی ہے۔ تفہیم القرآن کے مطالعے سے بخوبی باطل نظریات کو سمجھا اور رد کیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید فرقان حمید کتاب ہدایت ہے قرآن مجید میں تاریخی واقعات کا ذکر ہے تاہم قرآن مجید صرف تاریخ کی کتاب نہیں ہے اس لیے مختلف آیات کی تشریح و تفسیر میں مودودی صاحب نے اہل کتاب سے بھی استفادہ کیا ہے کیونکہ اللہ کے نبی ﷺ نے اہل کتاب سے معلومات اخذ کرنے کی اجازت دی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا،

((وحدثوا عن بنی اسرائیل والاحرج))[1]

مودودی صاحب بنی اسرائیل سے متعلقہ آیات کی تفسیر میں ان کی مذہبی کتب سے استشہاد کرتے ہیں تا کہ بنی اسرائیل کی گمراہی کے بارے میں بتایا جاسکے کہ خود ان کی اپنی کتابیں اس پر گواہ ہیں۔

مثال:

﴿الَّذِينَ قالُوا إِنَّ اللَّهَ عَهِدَ إِلَيْنا أَلاَّ نُؤْمِنَ لِرَسُولٍ حَتَّي يَأْتِيَنا بِقُرْبانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ قُلْ قَدْجاءَكُمْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلي بِالْبَيِّناتِ وَ بِالَّذي قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمْ إِنْ كُنْتُمْ صادِقينَ﴾[2]

ترجمہ: جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم کو ہدایت دی کہ ہم کسی کو رسول تسلیم نہ کریں جب تک وہ لوگ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کریں جیسے (غیب سے آکر) آگ کھالے ان سے کہو تمہارے پاس مجھ سے بہت پہلے بہت رسول آچکے ہیں جو بہت سی روشن نشانیاں لائے تھے اور وہ نشانی بھی لائے تھے جن کا ذکر تم کرتے ہو پھر اگر تم سچے ہو تو ان رسولوں کو تم نے کیوں قتل کیا۔

مودودی صاحب اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ بائبل میں متعدد مقامات پر یہ ذکر آیا ہے کہ خدا کے ہاں کسی قربانی کے مقبول ہونے کی علامت یہ تھی کہ غیب سے آگ نمودار ہو کر اسے بھسم کر دیتی۔[3]

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب بنی اسرائیل، حدیث نمبر ۱۲۱۰

(۲) سورۃ آل عمران: ۳/ ۱۸۳

(۳) کتاب القضاۃ ۶:۶۵، ۶۱، ۱۹، ۱۳

لیکن یہ کسی جگہ نہیں لکھا کہ اس طرح کی قربانی نبوت کی ضروری علامت ہے اگر یہ نشانی نبوت کی لازمی علامت تھی تو پھر بنی اسرائیل نے ایسے انبیاء کو قتل کیوں کیا جو یہ معجزہ پیش کر چکے تھے۔

یوں مودودی صاحب تفسیر قرآن میں بائبل اور تورات سے استفادہ کرتے ہوئے اہل کتاب کی گمراہی کی نشان دہی کرتے ہیں۔

تفہیم القرآن جدید علوم کا خزانہ:

مودودی صاحب اپنی مشہور زمانہ تفسیر میں جابجا آیات کی تشریح و توضیح میں جدید علوم جیسا کہ طبیعیات، حیوانیات، معاشیات، سیاسیات، نفسیات، فلکیات، علم الانسان اور جغرافیہ، فلسفہ و منطق اور تاریخ کے بے شمار مباحث لکھے ہوئے ہیں۔ مولانا ان سب علوم سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن قرآنی تعلیمات کو "حکم" بنا کر یہ علوم کہیں بھی اپنی رو میں بہا کر نہیں لے جاتے۔ عالم اسلام میں سائنسی اور عمرانی علوم و افکار پر مغربی الحاد کو خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے اور فلاح کا دارومدار جدید افکار و نظریات کے مطابق زندگی کی تنظیم میں ہے۔ اس سلسلے میں علماء کرام نے دوسرے راستے اختیار کیے ہیں تو ان نظریات سے صرف نظر کیا گیا۔ یا ان کو اختیار کیا گیا سید مودودی نے دو انتہاؤں کے درمیان اعتدال کی راہ اپنائی اور جو بات قرآن سے ہم آہنگ ہے اسے قبول کیا اور شریعت کے مجموعی مزاج کے خلاف ہے اسے دلیل سے رد کیا اور عصر حاضر کے علم وفلسفہ اور اس کے منہاج کو سامنے رکھتے ہوئے بات کرتے ہیں جو ہر صاحب عقل کو اپیل کرتی ہے۔ [۱]

یوں تفہیم قرآن سے تفسیر کی ایک نئی نہج تفسیر قرآن میں سامنے آتی ہے اور یہی چیز ان کی تفسیر کو عصری تفسیر بناتی ہے جس میں مولانا جدید علوم کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں پیش کرتے ہیں اور کہیں بھی عصری تقاضے اور مروجہ خیالات ان پر مسلط نہیں ہوتے تفہیم القرآن کی حواشی میں دیئے گئے مضامین کو اکٹھا کیا جائے تو یہ کئی جلدوں پر مشتمل ضخیم کتب بنے گی جو علوم کے نئے دروازے وا کرے گی۔

نظم قرآن کا نیا تصور:

تفہیم القرآن کے مطالعے سے نظم قرآن کا ایک نیا تصور سامنے آتا ہے۔ نظم قرآن کا ایک اہم موضوع رہا ہے اور مستشرقین کی طرف سے بھی یہ اعتراض کیا جاتا رہا ہے کہ نظم قرآن کو ثابت کیا جائے اس سے پہلے مفسرین نے بالعموم سورتوں کے باہمی ربط پر توجہ دی ہے کچھ مفسرین نے اپنی تفاسیر میں جزوی طور پر سورتوں اور آیات کے ربط کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ تفہیم القرآن میں سب سے زیادہ جس تصور نظم پر توجہ دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کے موضوع مرکزی مضمون اور مدعا سے ہر سورت اور ہر آیت کا ربط قائم کیا گیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب کہیں بھی اپنے موضوع اور مدعا اور مرکزی مضمون

(۱) ماہنامہ فکر و نظر، سید مودودی بحیثیت مفسر، ڈاکٹر خالد علوی، جون ۱۹۹۷ء، شمارہ ۳، ص ۲۳۳

سے بال برابر بھی نہیں ہٹی ہے اول سے لے کر آخر تک اس کے مختلف النوع مضامین اس کے مرکزی مضمون اس کے ساتھ یوں جڑے ہوتے ہیں جیسے ایک بار چھوٹے بڑے رنگ برنگے جواہر ہار کے رشتے میں مربوط اور منسلک ہوتے ہیں اس کا سارا بیان انتہائی یکسانی کے ساتھ "دعوت و تبلیغ" کے محور پر گھومتا ہے۔(۱)

یہ تفہیم ایک اہم کارنامہ ہے اور نظم قران کے سلسلے کی خدمت میں سے ایک عظیم خدمت ہے مودودی صاحب نے اپنی بحث کو اصطلاحات کے استعمال سے بوجھل نہیں کیا لیکن حقیقیت یہ ہے کہ "تفہیم القرآن" نظم قرآن کے ایک نئے پہلو کو اجاگر کرتی ہے اس میں سورۃ اور اس کے مضامین و آیات کا ربط قرآن کے مقصد اور اس کی دعوت کے ساتھ ربط قائم کیا گیا ہے جو تاویلات کے بغیر قرآن سے خود بخود متبادر ہوتا ہے اور یہ تفہیم القرآن کا ایک اہم کارنامہ ہے۔(۲)

تفہیم القرآن میں ترجمہ موثر ترجمانی ہے:

مودودی صاحب نے "تفہیم القرآن" میں ترجمے کا لگا بندھا طریقہ چھوڑ کر آزاد ترجمانی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ خود فرماتے ہیں: "جہاں تک ترجمے کا تعلق ہے یہ خدمت اس سے پہلے متعدد بزرگ انجام دے چکے ہیں جیسا کہ فارسی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب(۳) کا ترجمہ اردو میں اور دیگر بزرگان دین کے تراجم ان اغراض کو پورا کر دیتے ہیں۔ لفظی ترجمے سے قرآن کی سطروں کے نیچے آدمی کو ایک ایسی بے جان عبارت ملتی ہے جسے پڑھ کر نہ اس کی روح میں وجد آتی ہے اور نہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں نہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں نہ اس کے جذبات میں کوئی طوفان برپا ہوتا ہے نہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز عقل و فکر کو تسخیر کرتی ہے۔(۴)

تفہیم القرآن کا ترجمہ بامحاورہ اور آسان اردو میں ہے جو توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتا ہے کیونکہ اس میں لفظی اور بامحاورہ ترجمے کے مروجہ طریقوں سے ہٹ کر ترجمانی کی راہ اختیار کی گئی ہے لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ کہیں کسی مقام پر بھی ترجمہ کی حدود سے تجاوز نہیں کیا گیا یہ بامحاورہ ترجموں سے بھی اس لیے مختلف ہے کہ بامحاورہ ترجموں میں بھی بنیادی اکائی ترتیب کو بنایا جاتا ہے اور آیات کے درمیان تسلسل نہیں ہوتا جبکہ میرے خیال میں تفہیم القرآن میں اس بات کی بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ ترجمہ مسلسل ہو اور صرف ترجمہ پڑھنے سے بھی تاثر پیدا ہو سکے جو قرآن کا مقصود ہے۔ تفہیم کے ترجمے

---

(۱) تفہیم القرآن، مقدمہ، ۱/ ۲۵

(۲) خطبات مودودی، پروفیسر خورشید احمد، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۱۲۳

(۳) شاہ ولی اللہ کا نام احمد تھا، ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے قرآن کا پہلا فارسی ترجمہ فتح الرحمٰن کے نام سے کیا۔ اصول تفسیر پر آپ نے الفوز الکبیر فی اصول تفسیر لکھی۔ حجۃ اللہ البالغہ ، الخیر الکثیر، تفہیمات النیہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ آپ نے ۱۱۷۶ھ میں وفات پائی۔(تفہیم القرآن، عبداللہ صدیقی، ایورنیو بک پیلس، لاہور ۱۹۹۸ء، ص ۱۱)

(۴) تفہیم القرآن، مقدمہ، ۱/ ۲۸

کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تقریر کی زبان کا ترجمہ تحریر کی زبان میں کیا گیا ہے اور اس طرح ترجمانی کا حق ادا کر دیا گیا ہے اور فہم قرآن کی ایک نئی شاہراہ متعین کر دی گئی ہے تفہیم القرآن میں تقریر کی زبان کو تحریر کی زبان میں لانا بہت بڑا انقلابی قدم ہے۔ تقریر میں جو کام وقوف سانس لینے کے لیے اور آزاد ولہجہ کی تبدیلی سے کیا جاتا ہے مولانا نے تفہیم القرآن میں یہی کام قوسین کی وضاحتوں اور پیراگراف بندی سے لیا گیا ہے اور یہ کام تفہیم القرآن میں پہلی بار ہوا ہے تفہیم سے پہلے دنیا کی کسی زبان میں یہ خدمت نہیں انجام دی گئی اس حیثیت سے اسے تفہیم القرآن کی اولیات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

تفہیم القرآن اسلاف کی تفاسیر کی نمائندگی کرتی ہے:

مودودی صاحب تفہیم کو لکھتے وقت اسلاف کی تمام عظیم تفاسیر کو پیش نظر رکھتے ہیں تفسیر کی امہات الکتب کو بالتزام دیکھتے ہیں جن میں "انکشاف عن حقائق التنزیل"، "تفسیر القرآن العظیم"، "جامع البیان"، "مفاتیح الغیب" یعنی تفسیر الکبی "روح المعانی"، "احکام القرآن" اور "احکام القرآن" خاص طور پر قابل ذکر ہیں جہاں فقہی مسائل کی بات آجاتی ہے ان میں مذاہب اربعہ حنفی، مالکی، شافعی کی لکھی ہوئی اصل کتب کا مطالعہ کرتے ہیں کیونکہ مودودی صاحب علمی تحقیق کے لیے اصل ماخذ کی صرف رجوع کرتے ہیں۔ لغوی تحقیق اور جستجو کے بعد آیات کی تفاسیر لکھتے ہیں مثلاً رہبانیت پر تفسیر لکھنے سے اس موضوع پر مطالعہ و تحقیق میں ۴ماہ صرف ہوئے پھر کہیں جا کر آپ نے تفہیم کے اس حاشیہ کو سپرد قلم کیا۔ ایسے حاشیے تفہیم القرآن میں بکثرت موجود ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ علم فقہ کے سمندر سے گراں مایہ موتیوں کو نکال کر لڑی میں پرو دیا ہے۔

تاریخی واقعات کی تفصیل:

تفہیم القرآن میں ان تاریخی واقعات اور مقامات وغیرہ کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے، جن کا تذکرہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ بعض جگہوں پر تاریخی مقامات کے نقشے بھی دیئے گئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت، غزوات اور بنی اسرائیل سے متعلقہ آیات کی تفسیر میں باقاعدہ نقشوں سے مقامات کی تصویری وضاحت دی گئی ہے۔ (۱)

اس تفسیر کے مطالعے سے سابقہ اقوام ومذاہب کی تہذیب و تمدن کا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے یوں کہ اس تفسیر کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قاری ان حالات اور واقعات کا آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہے۔

اجتہادی تفسیر:

مودودی صاحب نے تفسیر القرآن بالقرآن تفسیر بالحدیث و اقوال صحابہ کا انداز اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ جدید دور کے مسائل میں اجتہاد سے بھی کام لیا ہے یہی وجہ ہے کہ تفہیم القرآن اجتہادی تفسیر بھی کہلاتی ہے۔

---

(۱) تفہیم القرآن، ۱/ ۸۲

فقہ حنفی کی تائید:

تفہیم القرآن میں فقہی مسائل کے ضمن میں آئمہ اربعہ کا موقف بیان کیا گیاہے، مودودی صاحب اختلافی مسائل میں مالکی، شافعی، حنبلی، حنفی رائے بیان کرتے ہیں تاہم حنفی ہونے کے باوجود مصنف نے کسی جگہ تعصب سے کام نہیں لیا بلکہ آئمہ اربعہ کی رائے بیان کرنے کے بعد فیصلہ قاری پر چھوڑتے ہیں۔ بلکہ مودودی صاحب حنفی مسلک ہونے کے باوجود بعض آیات کی تفسیر میں حنفی مسلک سے اختلاف سے کرتے ہیں جب کہ مفسرین عام طور پر اپنے مسلک کے مطابق تعبیر کو ترجیح دیتے ہیں اور احکام میں مسلکی عصبیت نمایاں ہوتی ہے۔جب کہ تفہیم القرآن اس سے پاک ہے۔ [1]

دعوت و تبلیغ کی نمائندہ تفسیر:

قرآن پاک سراسر دعوت ہے اس لیے تفہیم القرآن کی تفسیر میں بھی مولانا نے داعیانہ انداز اختیار کیاہے۔ قرآن پاک کے ترجمے و تفسیر کو پڑھنے اور سمجھنے سے انسان پر عالمگیر دعوت واصلاح کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ چنانچہ مولانا تفہیم کے مقدمے میں لکھتے ہیں" مختلف ضرورتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی تقریریں نبی ﷺ پر نازل ہوتی رہیں جن کا انداز کبھی آتشیں خطابت کا، کبھی فرامین واحکام کی کبھی معلمانہ درس و تعلیم کا اور کبھی مصلحانہ افہام و تفہیم کا ہوتا تھا غرض قرآن پاک میں ایک طرف تو مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی جاتی تھی اور ان کی کمزوریوں پر تنبیہ کی جاتی تھی ان کو راہ خدا میں جان ومال سے جہاد کرنے پر ابھارا جاتا شکست و فتح، مصیبت و راحت، بدحالی اور خوشحالی، امن وخوف غرض ہر حال میں مناسب اخلاقیات کا درس دیا جاتا تھا کہ وہ حضور ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے جانشین بن کر دعوت و اصلاح کے کام کو انجام دے سکیں اور جو لوگ دائرہ ایمان سے باہر ہیں ان کو مختلف حالتوں کے لحاظ سے سمجھاتے نرمی سے دعوت دینے، سختی سے ملامت کرنے اور نصیحت کرنے، خدا کے عذاب سے ڈرنے اور سبق آموز واقعات واحوال سے عبرت دلانے کی کوشش کی جاتی تھی تاکہ ان پر حجت تمام کر دی جائے۔ [2]

یہی وجہ ہے کہ مودودی صاحب نے بہت خوبصورت انداز اور شستہ زبان وبیان سے دعوتی آیات کی تفسیر کی ہے۔ تفسیر ھذا میں اگر صرف آیات کے ترجمے کو ہی پڑھا جائے تو دعوت و تبلیغ کا جذبہ قاری کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اور مصنف نے مکی زندگی میں نازل ہونے والی آیات کی تفسیر میں جو داعیانہ انداز اختیار کیاہے۔ وہ مدنی زندگی میں نازل ہونے والی آیات کی تفاسیر سے یکسر مختلف ہے۔ یوں وہ حضرات جو دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دینا چاہتے ہیں یادے رہے ہیں ان کے لیے " تفہیم القرآن "کا مطالعہ دعوتی انداز و بیان اور دعوتی طریقہ کار کے اختیار میں نشان منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔

---

(۱)ماہنامہ فکر و نظر، مولاناسید ابوالاعلیٰ مودودی بحیثیت مفسر، ڈاکٹر خالد علوی، ستمبر ۱۹۹۸ء، شمارہ ۳۶، ص ۲۳۱

(۲) تفہیم القرآن، ۱/ ۲۱

الغرض سید مودودی نے تفہیم القرآن میں جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کی حیثیت سہل ممتنع کی ہے اس میں سادگی وروانی ہے علمی و فکری مسائل کی توضیح ہے اس میں زبان کا حسن اور ادب کی چاشنی ہے اور سب سے بڑھ کر اس میں کامل ابلاغ ہے کہیں پیچیدگی نہیں کوئی تعقید نہیں بلکہ فصاحت وبلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

باب دوم

انبیاء کے اسالیب دعوت

(حصہ الف)

انبیاء کے اسالیب دعوت

فصل اول: حضرت نوح علیہ السلام کے اسالیب دعوت تدبر قرآن کی روشنی میں

فصل دوم: حضرت نوح علیہ السلام کے اسالیب دعوت تفہیم القرآن کی کی روشی میں

فصل سوم: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسالیب دعوت تدبر قرآن کی روشنی میں

فصل چہارم: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسالیب دعوت تفہیم القرآن کی روشنی میں

فصل اوّل

حضرت نوح علیہ السلام کے اسالیب دعوت تدبر قرآن کی روشنی میں

حضرت نوح علیہ السلام:

حضرت نوح علیہ السلام اولین اولوالعزم رسول ہیں جن کے ذریعے دعوت کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور اس دعوت کی تکمیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ہوئی۔

نام ونسب:

آپ علیہ السلام کا نسب نامہ اس طرح ہے

[نوح بن لامک بن متوشلغ بن فنوخ (ادریس علیہ السلام) بن یرد بن سھلاییل بن قنین بن انوش بن آدم علیہ السلام](۱)

حضرت نوح علیہ السلام اولین اولوالعزم رسول ہیں جنہیں قرآن نے بطور ماڈل پیش کیا ہے۔(۲)

حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کے درمیان ایک سو چھیالیس سال کا فاصلہ ہے اور صحیح ابن حیان میں ہے کہ ان کے درمیان دس قرن (دس صدیوں یا دس نسلوں) کا فاصلہ ہے۔ جیسا کہ

حضرت نوح علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کی آٹھویں پشت میں سے ہیں حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن گزرے ہیں ایک قرن سو سال کا ہوتا ہے وہ سب اسلام پر تھے۔(۳)

وجہ تسمیہ:

نوح بمعنی محنت و مشقت کرنے والا۔(۴)

بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو اس وقت نبوت سے سرفراز فرما کر مبعوث فرمایا جب بتوں اور شیطانوں کی پوجا شروع ہو گئی تھی اور لوگوں نے گمراہی اور کفر کا راستہ اختیار کر لیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر رحمت فرماتے ہوئے حضرت نوح علیہ السلام کو دنیا میں بھیجا اس طرح آپ علیہ السلام وہ پہلے رسول تھے جنہیں زمین والوں کی طرف بھیجا گیا۔ قیامت کے دن میدان محشر میں کھڑے ہو کر لوگ بھی ان سے یہی بات کہیں گے۔

مختلف سورتوں میں حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ:

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں متعدد مقامات پر حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ بیان کیا ہے کہ آپ علیہ السلام کی قوم نے طرح طرح سے آپ علیہ السلام کو اذیتیں دیں مگر آپ علیہ السلام کے پایہ استقلال میں لغزش نہ آئی۔ قرآن پاک میں سورۃ اعراف، سورۃ

---

(۱) قصص الانبیاء، امام ابوالفداء ابن کثیر، ترجمہ عطاء اللہ ساجد، ادارہ دارالسلام، جدہ، ۱۹۸۹ء، ص ۶۸

(۲) ایضاً

(۳) البدایہ والنھایہ، عماد الدین ابن کثیر ۱ / ۹۴

(۴) کتاب پیدائش، باب ۵، فقرہ ۳

یونس، سورۃ ہود، سورۃ انبیاء، سورۃ مومنون، سورۃ شعراء، سورۃ عنکبوت، سورۃ صافات اور سورۃ قمر میں آپ علیہ السلام کا ذکر فرمایا اور ایک مکمل سورۃ نوح آپ علیہ السلام کے نام سے نازل فرمائی۔ حضرت نوح علیہ السلام کی شخصیت اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ نسل آدم علیہ السلام کے بگاڑ پر اولین تنبیہ ان کے ذریعے ہوئی۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِۦ فَقَالَ يَٰقَوْمِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُۥٓ إِنِّىٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٥٩﴾﴾[1]

ترجمہ: ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تو انہوں نے ان سے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں مجھے تمہارے بارے میں بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

قرآن مجید نے نوح علیہ السلام کی دعوتی سرگرمیوں کا مفصل ذکر کیا ہے اور اجمالی اور تفصیلی ذکر تینتالیس جگہوں پر آیا ہے۔[2]

بعثت سے قبل مذہبی حالات:

حضرت آدم علیہ السلام کے بعد دس قرن یعنی تقریباً ایک ہزار سال ایسے گزرے ہیں کہ تمام اولاد آدم علیہ السلام خداوند کریم کی توحید پر قائم تھی۔ اس کے بعد بت پرستی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَالُوا۟ لَا تَذَرُنَّ ءَالِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا﴾[3]

ترجمہ: اور بولے ہرگز نہ چھوڑنا اور اپنے معبودوں کو اور نہ چھوڑنا ود کو اور نہ سواع کو اور نہ یغوث کو اور نہ یعوق کو اور نہ نسر کو۔

یہ حضرت آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان کے زمانے کے اولیائے کرام تھے ان کے کچھ پیروکار بھی تھے جو ان کے طریقے پر چلتے تھے۔ جب وہ ان فوت ہو گئے تو ان کے عقیدت مندوں نے کہا: اگر ہم ان کی تصویریں بنالیں تو ان کی وجہ سے ہمیں عبادت کا شوق زیادہ ہو گا۔ جب یہ تصویریں بنانے والے فوت ہو گئے اور ان کی جگہ دوسرے لوگ آ گئے تو ابلیس نے

---

(۱) سورۃ اعراف: ۷/ ۵۹

(۲) دعوت وارشاد، محمد عین الحق، ایورنیو بک پیلس، لاہور، ص ۷۰

(۳) سورۃ نوح: ۷۱/ ۲۳

ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ تمہارے باپ دادا ان اولیائے کرام کی عبادت کیا کرتے تھے اور انہی کی وجہ سے انہیں بارش ملتی تھی چنانچہ ان لوگوں نے ان کی عبادت شروع کر دی۔ (۱)

رفتہ رفتہ ان لوگوں نے تصویروں کی جگہ مجسم بت بنا لیے تا کہ زیادہ دیر تک قائم رہ سکیں اور آنے والی نسلوں کے لیے نشانی بھی رہے۔ چنانچہ تصویروں کی جگہ مجسمے بنا لیے گئے۔

حضرت ام سلمہ ؓ اور حضرت ام حبیبہ نے حبشہ میں جو گرجا دیکھا تھا اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا۔ اس کا نام "ماریہ" تھا۔ انہوں نے اس کی خوبصورتی کا ذکر کیا اور اس میں جو تصویریں تھیں ان کا ذکر کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی فوت ہو جاتا تھا تو اس کی قبر پر عبادت گاہ تعمیر کرتے تھے اور اس میں یہ تصویریں بناتے تھے۔ اللہ کے ہاں یہ لوگ مخلوقات میں بدترین ہیں"۔ (۲)

صحیح مسلم میں ہے کہ قوم نوح علیہ السلام کے یہ بت عربوں نے اختیار کر لیے اور ان کی پرستش شروع کر دی۔

((عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا صَارَتْ الْأَوْثَانُ الَّتِي كَانَتْ فِي قَوْمِ نُوحٍ فِي الْعَرَبِ بَعْدُ أَمَّا وَدٌّ كَانَتْ لِكَلْبٍ بِدَوْمَةِ الْجَنْدَلِ وَأَمَّا سُوَاعٌ كَانَتْ لِهُذَيْلٍ وَأَمَّا يَغُوثُ فَكَانَتْ لِمُرَادٍ ثُمَّ لِبَنِي غُطَيْفٍ بِالْجَوْفِ عِنْدَ سَبَإٍ وَأَمَّا يَعُوقُ فَكَانَتْ لِهَمْدَانَ وَأَمَّا نَسْرٌ فَكَانَتْ لِحِمْيَرَ لِآلِ ذِي الْكَلَاعِ أَسْمَاءُ رِجَالٍ صَالِحِينَ مِنْ قَوْمِ نُوحٍ فَلَمَّا هَلَكُوا أَوْحَى الشَّيْطَانُ إِلَى قَوْمِهِمْ أَنْ انْصِبُوا إِلَى مَجَالِسِهِمْ الَّتِي كَانُوا يَجْلِسُونَ أَنْصَابًا وَسَمُّوهَا بِأَسْمَائِهِمْ فَفَعَلُوا فَلَمْ تُعْبَدْ حَتَّى إِذَا هَلَكَ أُولَئِكَ وَتَنَسَّخَ الْعِلْمُ عُبِدَتْ))

"ابن عباس سے روایت ہے کہ وہ بت جو قوم نوح میں تھے وہی عرب میں اس کے بعد پوجے جانے لگے ود قبیلہ کلب کا بت تھا جو دومتہ الجندل میں تھے۔ سواع ھذیل کا اور یغوث مراد کا پھر بنی غطیف جو سبا کے پاس جرف میں تھا۔ یعوق ھمدان کا اور نسر حمیر کا جو ذوالکلاع کے خاندان سے تھا۔ یہ قوم نوح علیہ السلام کے صالح لوگوں کے نام تھے۔ جب ان نیک لوگوں نے وفات پائی تو شیطان نے ان کی قوم کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ ان کے بیٹھنے کی جگہ میں جہاں وہ بیٹھا کرتے تھے بت نصب کر دیں اور اس کا نام ان بزرگوں کے نام پر رکھ دیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور پھر جب وہ لوگ مر گئے علم جاتا رہا تو ان بتوں کی عبادت کی جانے لگی"۔ (۳)

---

(۱) دعوت وارشاد، محمد عین الحق، ص ۷۱

(۲) صحیح مسلم، امام محمد بن مسلم نیشاپوری، المساجد، باب النھی عن بناء المساجد علی القبور، حدیث ۵۲۸

(۳) صحیح بخاری، کتاب التفسیر، حدیث ۲۰۲۷

عربوں کے ہاں ان بتوں کی پوجا کے سلسلے میں سید ابو الاعلی مودودیؒ لکھتے ہیں:

"قوم نوح علیہ السلام کے معبدوں میں سے یہاں ان معبدوں کے نام لیے گئے ہیں جنہیں بعد میں اہل عرب نے پوجنا شروع کر دیا اور آغاز اسلام کے وقت عرب میں جگہ جگہ ان کے مندر بنے ہوئے تھے بعید نہیں کہ طوفان میں جو لوگ بچ گئے تھے ان کی زبان سے بعد کی نسلوں نے قوم نوح کے قدیم معبدوں کا ذکر سنا ہو گا اور جب از سر نو ان کی اولاد میں جاہلیت پھیلی ہو گی تو ان معبدوں کے بت بنا کر انہوں نے پھر انہیں پوجنا شروع کر دیا ہو گا"۔[۱]

دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں حضرت نوح علیہ السلام کو ایک ایسی قوم کا سامنا تھا جو شرک اور بت پرستی پر جم چکی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو توحید کا راستہ دکھانے کے لیے انہیں خدائے واحد کی عبادت کی تلقین کی جس پر انہیں قوم کی شدید مخالفت اور دشمنی کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم پھر بھی آپ علیہ السلام کے پایہ استقلال میں لغزش نہ آئی۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو دعوت توحید:

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا تو ان لوگوں کو اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کرنے کو کہا اور یہ فرمایا کہ وہ اللہ کے سوا کسی بت مجسمے یا طاغوت کی پوجا نہ کریں اس کی وحدانیت کا اقرار کریں۔ سیدنا نوح علیہ السلام کی اولاد میں مبعوث ہونے والے دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہی حکم دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام اور ابراھیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَٰهِيمَ وَجَعَلْنَا فِى ذُرِّيَّتِهِمَا ٱلنُّبُوَّةَ وَٱلْكِتَٰبَ ۖ فَمِنْهُم مُّهْتَدٍ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَٰسِقُونَ ﴾[۲]

ترجمہ: اور ہم نے نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا اور ان دونوں کی ذریت میں نبوت اور کتاب کا سلسلہ جاری کیا۔ پس اس میں سے کچھ تو ہدایت پانے والے بنے اور زیادہ ان میں سے نافرمان نکلے۔

یعنی نوح علیہ السلام کے بعد آنے والا ہر نبی ان کی اولاد سے تھا اور یہی شان ابراہیم علیہ السلام کی بھی ہے۔[۳]

چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا:

---

(۱) صحیح بخاری، باب التفسیر، حدیث نمبر ۲۰۲۷

(۲) سورۃ الحدید: ۵۷ / ۲۶

(۳) قصص الانبیاء، امام ابو الفداء ابن کثیر، ص ۷۱

﴿أَن لَّا تَعۡبُدُوٓاْ إِلَّا ٱللَّهَۖ إِنِّيٓ أَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ أَلِيمٖ﴾(۱)

ترجمہ: تم صرف اللہ ہی کی عبادت کرو مجھے تو تم پر دردناک دن کے عذاب کا خوف ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں کو ہر طرح سے دعوت و تبلیغ کے ذریعے حکم ربانی کی طرف بلایا لیکن آپ علیہ السلام کی قوم گمراہی پر ڈٹی رہی۔ ہر وقت آپ علیہ السلام سے دشمنی پر تیار رہتی۔ آپ علیہ السلام کو اور ایمان والوں کو برا بھلا کہتی رہتی انھیں شہید کر دینے اور جلاوطن کر دینے کی دھمکیاں دیتی رہتی۔ آپ علیہ السلام کی خیر خواہی، نرمی اور پیار کے باوجود علیہ السلام کی قوم کے بڑے سرداروں نے کہا:

﴿إِنَّا لَنَرَىٰكَ فِي ضَلَٰلٖ مُّبِينٖ﴾(۲)

ترجمہ: ہم آپ کو واضح گمراہی میں دیکھتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿يَٰقَوۡمِ لَيۡسَ بِي ضَلَٰلَةٞ وَلَٰكِنِّي رَسُولٞ مِّن رَّبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ﴾(۳)

ترجمہ: اے برادران قوم میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں۔

یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ میں گمراہ ہوں بلکہ میں رب العالمین کی طرف سے صحیح ہدایت پر قائم ہوں۔

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں مولانا مودودیؒ صاحب لکھتے ہیں کہ "یہ معاملہ جو نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان پیش آیا تھا بعینہ ایسا ہی معاملہ مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی قوم کے درمیان پیش آیا تھا جو شبہات اہل مکہ کے سرداروں کو تھے وہی شبہات ہزاروں سال پہلے حضرت نوح علیہ السلام کے سرداران قوم کو بھی تھے دوسرے انبیاء کرام اور ان کی قوموں کے قصوں سے یہی حالات سامنے آتے ہیں اس سے قرآن اپنے مخاطبین کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ انسان کی گمراہی ہر زمانے میں بنیادی طور پر ایک ہی طرح کی رہی ہے اور خدا کے بھیجے ہوئے مصلحوں کی دعوت بھی ہر عہد اور ہر سرزمین میں یکساں رہی ہے اور ٹھیک اسی طرح ان لوگوں کا انجام بھی ایک جیسا ہوا ہے اور ہو گا جنہوں نے انبیاء کی دعوت سے منہ موڑا اور اپنی گمراہی پر اصرار کیا۔(۴)

مولانا امین اصلاحیؒ اس آیت مبارکہ کی تفسیم میں فرماتے ہیں کہ "شرک کی وجہ سے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں فساد کو فروغ حاصل ہوتا ہے اسی وجہ سے اللہ کے رسول اپنی قوم کی دعوت کا آغاز اسی نقطے سے شروع کرتے تھے اور

---

(۱) سورۃ ھود: ۱۱/ ۲۶

(۲) سورۃ الاعراف: ۷/ ۶۰

(۳) سورۃ الاعراف: ۷/ ۶۱

(۴) تفہیم القرآن، ۲/ ۴۲

یہی چیز یعنی رد شرک انبیاء کا مشترکہ نقطہ آغاز ہے۔ جبکہ ان کی قوم نے انہیں کہا کہ ہم تمہیں گمراہی میں دیکھتے ہیں کہ تم نے اپنے باپ دادا کے دین کی تحقیر کی ہم تمہیں گمراہی میں دیکھتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے جواب دیا مجھے کوئی سر پھرا اور بہکا ہوا انسان نہ سمجھو میں جو کچھ تمہیں سنا رہا ہوں وہ بے کم و کاست خدا کی طرف سے سنا رہا ہوں کوئی بات اپنی طرف سے نہیں سنا رہا"۔[1]

اس سورہ اعراف کی اس آیت مبارکہ کی تفسیر مولانا مودودی صاحب دعوتی نقطہ نگاہ سے زیادہ اچھی کرتے ہیں کہ خدا کے بھیجا ہوئے مصلحین کی دعوت بھی ہر سرزمین میں یکساں رہی ہے اور اس کو ٹھکرانے والوں کا انجام بھی یکساں رہا جبکہ امین احسن صاحب اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں ذرا سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ تم مجھے کوئی سر پھرا اور بہکا ہوا انسان نہ سمجھو تاہم دونوں دعوتی تفاسیر ہیں۔

قوم کی مخالفت اور استہزاء:

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے سرداروں نے ان کی دعوت و تبلیغ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ہر طرح سے انہیں اپنے مذاق کا نشانہ بنایا ان پر پہلا اعتراض یہ لگایا گیا کہ تمہاری دعوت کھلی گمراہی ہے باپ دادا کے مذہب سے انحراف ہے اور آباؤ اجداد کے معبدوں کی تحقیر ہے۔ جواب میں حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ قَالَ يَٰقَوْمِ لَيْسَ بِي ضَلَٰلَةٌ وَلَٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ۝ أُبَلِّغُكُمْ رِسَٰلَٰتِ رَبِّي وَأَنصَحُ لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ ٱللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴾[2]

ترجمہ: اس نے کہا، اے میری قوم مجھ میں کوئی گمراہی نہیں ہے بلکہ میں تمام عالم کا رسول ہوں تمہیں اپنے رب کا پیغام پہنچا رہا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کر رہا ہوں۔ اور میں اللہ کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے مخالفین کو ان کی بشریت پر بھی اعتراض تھا اور حضرت نوح علیہ السلام کے متبعین کی کم تر معاشرتی حیثیت پر بھی اعتراض تھا۔

تاریخِ دعوت کی یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ دعوت کے مخاطبین تو سوسائٹی کے تمام لوگ ہوتے ہیں اور داعی کی طبعی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ اعلیٰ طبقے کے افراد دعوت قبول کریں لیکن مشیت ایزدی نے یہ شرف پسے ہوئے طبقات کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے اس طبقے کے لوگ اولین مومنین ہوتے ہیں۔ قرآن نے اس کو یوں نقل کیا ہے:

---

(۱) تدبر قرآن، ۳/ ۳۷۶

(۲) سورۃ الاعراف: ۷/ ۶۱، ۶۲

﴿قَالُوٓاْ أَنُؤۡمِنُ لَكَ وَٱتَّبَعَكَ ٱلۡأَرۡذَلُونَ ﴾(۱)

ترجمہ: وہ بولے کیا ہم تم پر ایمان لائیں اور تمہارے پیرو تو رذیل لوگ ہیں۔

پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ لکھتے ہیں ہے کہ "تم تو یہ کہتے ہو کہ یہ رذیل اور خستہ حال لوگ اس قابل نہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہو۔ میں تو ایسا نہیں کہہ سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ ظاہر کو نہیں دیکھتا بلکہ دل کو دیکھتا ہے اگر ان کا باطن درست ہو ان کا سینہ نور توحید سے منور ہو تو ان کی ظاہری خستہ حالی کے باوجود وہ اپنی خیرات وبرکات سے مالا مال کر دے گا"۔(۲)

آپ علیہ السلام کی قوم کو آپ علیہ السلام کی بشریت پر بھی اعتراض تھا۔ گویا حضرت نوح علیہ السلام کا بشر ہونا انہیں نبوت کے منافی نظر آتا تھا۔

﴿ فَقَالَ ٱلۡمَلَؤُاْ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ مِن قَوۡمِهِۦ مَا هَٰذَآ إِلَّا بَشَرٞ مِّثۡلُكُمۡ يُرِيدُ أَن يَتَفَضَّلَ عَلَيۡكُمۡ وَلَوۡ شَآءَ ٱللَّهُ لَأَنزَلَ مَلَٰٓئِكَةٗ مَّا سَمِعۡنَا بِهَٰذَا فِيٓ ءَابَآئِنَا ٱلۡأَوَّلِينَ ﴾(۳)

ترجمہ: ان کی قوم کے سردار جو کافر تھے کہنے لگے کہ یہ تو تم ہی جیسا آدمی ہے تم پر بڑائی حاصل کرنا چاہتا ہے اگر خدا چاہتا تو فرشتے اتار دیتا ہم نے اپنے اگلے باپ دادا سے تو یہ بات کبھی نہیں سنی۔

مولانا مودودی آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں "یہ خیال درحقیقت تمام گمراہ لوگوں کی مشترکہ گمراہیوں میں سے ایک ہے کہ نبی بشر نہیں ہو سکتا اور بشر نبی نہیں ہو سکتا اس لیے قرآن نے بار بار اس جاہلانہ تصور کی نفی کی ہے اور پورے زور کے ساتھ بیان کیا ہے کہ تمام انبیاء انسان تھے اور انسانوں کے لیے انسان ہی نبی ہونا چاہیے"۔(٤)

غرض قوم نوح کی طرف سے حضرت نوح علیہ السلام کو ان کے راستے سے ہٹانے کے لیے طرح طرح کے اعتراضات کیے گئے اور حضرت نوح علیہ السلام ہر طرح سے ان اعتراضات کے جوابات دیتے رہے پس وہ لوگ مخالفت پر ڈٹے رہے۔

عذاب خداوندی کا مطالبہ:

حضرت نوح علیہ السلام نے جن صبر آزما حالات میں دعوت الی اللہ کا کام کیا اور جتنا عرصہ سرگرم عمل رہے وہ اپنی مثال آپ ہے لیکن اس کے باوجود ان کی قوم شرک اور بت پرستی پر ڈٹی رہی۔ قوم نوح علیہ السلام کی گمراہی کا یہ عالم تھا کہ جب ایک نسل

---

(۱) سورۃ الشعراء:۲٦/ ۱۱۱

(۲) تفسیر ضیاء القرآن، پیر محمد کرم شاہ الازہری، ۲/ ۳۵

(۳) سورۃ المومنون:۲۳/ ۲۴

(۴) تفہیم القرآن، ۳/ ۲۷۳

کے لوگ مرتے تو وہ اپنے بعد والوں کو یہ وصیت کر جاتے تھے کہ حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان نہ لانا ان سے جھگڑتے اور ان کی مخالفت کرتے رہنا جب کسی کا بچہ بڑا ہوتا اور اس کی باتیں سمجھنے لگتا تو باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا تھا کہ زندگی بھر نوح علیہ السلام پر ایمان نہ لانا۔ اور ان کی قوم نے کہا:

﴿ قَالُواْ يَٰنُوحُ قَدْ جَٰدَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَٰلَنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ ۝ قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيكُم بِهِ ٱللَّهُ إِن شَآءَ وَمَآ أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ﴾(۱)

ترجمہ: وہ کہنے لگے اے نوح تم نے ہم سے جھگڑا تو کیا اور جھگڑا بھی بہت کیا لیکن اگر سچے ہو تو جس چیز سے ہمیں ڈراتے ہو وہ ہم پر نازل کرو۔ نوح نے کہا اس کو تو اللہ ہی چاہے گا تو نازل کرے گا اور تم (اس کو کسی طرح) ہرا نہیں سکتے۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب فرماتے ہیں "جب قوم نوح علیہ السلام کے داعیان بحث و مناظرے کے میدان میں پسپا ہونے لگے اور حضرت نوح علیہ السلام نے ہر پہلو سے ان پر حجت تمام کر دی تو آخری بار انہوں نے اپنے لیے یہ خیال کیا کہ ان سے عذاب کا مطالبہ کریں جس کی وہ خبر دے رہے ہیں چنانچہ اگر تم سچے ہو تو ہم پر عذاب الٰہی لے آؤ۔ حضرت نوح علیہ السلام نے جواب دیا عذاب لانا تو اللہ کے اختیار میں ہے وہی جب چاہے گا لائے گا لیکن یاد رکھو کہ اس طنطنہ کے ساتھ جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں تو جب عذاب آدھمکے گا اس وقت کوئی خدا کے قابو سے باہر نہیں نکل سکے گا"۔(۲)

مولانا احسن اصلاحی کثرت جدالنا کا خوبصورت ترجمہ حجت تمام کر دی سے کرتے ہیں کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ یاد رکھو تم عذاب کا مطالبہ بڑے طنطنہ یعنی بڑی دیدہ دلیری سے کر رہے ہو مگر در حقیقت تم اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہو آیت مبارکہ کی تفسیر میں مولانا صاحب انتہائی درد کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ تم اپنی جانوں پہ ظلم کر رہے ہو امین احسن یہاں الفاظ کا خوبصورت اور بامحاورہ ترجمہ کرتے ہیں اور اس میں دکھ کے ساتھ سرزنش کا پہلو نمایاں ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا حکم:

حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ دین کے نتیجے میں چند لوگ اللہ پر ایمان لائے۔ جو ایمان لائے وہ زیادہ تر نچلے درجے سے تعلق رکھتے تھے ان کی مجموعی تعداد دس، بہتر یا اسی بیان کی جاتی ہے۔ چنانچہ حکم ربانی آپہنچا اور آپ علیہ السلام کو حکم دیا گیا۔

---

(۱) سورۃ ھود: ۱۱/ ۳۲، ۳۳

(۲) تدبر قرآن، ۲/ ۱۳۹

﴿ وَٱصۡنَعِ ٱلۡفُلۡكَ بِأَعۡيُنِنَا وَوَحۡيِنَا وَلَا تُخَٰطِبۡنِي فِي ٱلَّذِينَ ظَلَمُوٓاْ إِنَّهُم مُّغۡرَقُونَ ﴾[1]

ترجمہ: اور کشتی ہماری حفاظت میں اور ہمارے حکم سے تیار کرلے اور ان نافرمان لوگوں کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہ کر کیونکہ یہ سب غرق کیے جائیں گے۔

یہ کشتی دراصل دنیا میں سب سے پہلا بحری جہاز تھا جس کی ابتداء اللہ کے نبی علیہ السلام کے ذریعے ہوئی۔ یہ کشتی کیا تھی ایک بڑا جہاز تھا جس کی لمبائی ۳۰۰ ہاتھ، چوڑائی ۵۰ ہاتھ اور اونچائی ۳۰ ہاتھ تھی اور اوپر نیچے تین منزلیں تھیں گویا یہ دنیا میں سب سے پہلا پانی کا جہاز تھا۔[2]

طوفان نوح علیہ السلام کی آمد:

۱۰ رجب کو نوح علیہ السلام کشتی میں سوار ہوئے اور کشتی چھ مہینے پانی میں برابر چلتی رہی جب بیت اللہ شریف کے قریب پہنچی تو بیت اللہ کے سات چکر لگائے اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو بلند کرکے طوفان میں غرق ہونے سے بچالیا۔ ۱۰ محرم الحرام یعنی یوم عاشورہ کو یہ طوفان ختم ہوا اور کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہری۔[3]

اس طوفان میں سوائے ان لوگوں کے جو کشتی میں سوار تھے کشتی کے باہر رہ جانے والے تمام لوگ ہلاک ہوگئے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے سام، حام، یافث بھی مسلمان تھے اور کشتی میں سوار تھے جبکہ ان کا چوتھا بیٹا یام اپنے کفر کی وجہ سے طوفان کی نذر ہوگیا۔[4]

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی ساری زندگی صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا اور ان کی اہم خوبی دعوت اور کاریگری یکجا کرنے میں ہے حضرت نوح علیہ السلام کے اسالیب دعوت دورِ حاضر کے داعیان کرام کے لئے اور دعوتی تنظیموں کے لئے مشعل راہ ہیں کیونکہ داعی حضرات اور دعوتی تنظیمیں دعوت کا کام بڑے جوش و جذبے سے شروع کرتے ہیں لیکن جلد ہی مسائل اور لوگوں کے منفی رویے سے گھبرا کر یہ کام چھوڑ دیتے ہیں یا مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں اگر وہ اپنا دعوتی کام حضرت نوح علیہ السلام کے اسالیب اور ان کی دعوتی مدت کو سامنے رکھتے ہوئے کریں تو یقیناً داعی حضرات اور دعوتی تنظیمیں کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہیں۔

---

(۱) سورۃ ھود: ۱۱/ ۳۷

(۲) تاریخ الانبیاء، ذوالفقار ارشد گیلانی، علم دوست پبلیشرز، اردو بازار، لاہور، ۱۹۸۷ء ص ۲۱۹

(۳) معارف القرآن، مفتی محمد شفیع، ادارہ المعارف، کراچی، اکتوبر ۱۹۹۱ء، ۴/ ۶۲۸

(۴) ایضاً

اسالیب دعوت تدبر قرآن کی روشنی میں

۱) حضرت نوح علیہ السلام کا قوم کو دعوت دینا

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو دن رات اللہ کے راستے کی طرف بلایا۔ کیونکہ دعوت دین کسی خاص وقت کے ساتھ مخصوص اور مقید نہیں۔ دعوت حق کی تڑپ رکھنے والے میسر آنے والے وقت میں دعوت دیتے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ﴾[۱]

ترجمہ: اے میرے پرودگار! میں نے اپنی قوم کو تیری طرف رات دن بلایا۔

رسول چونکہ اپنی قوم کے لیے عدالت بن کر آتا ہے اس کی تصدیق یا تکذیب ہی پر اس قوم کی زندگی یا موت کا انحصار ہوتا ہے اس وجہ سے ہر رسول نے دعوت کی راہ میں اپنے دن رات ایک کر دیئے اور اپنی طاقت کا ایک ایک قطرہ نچوڑ دیا اور حضرت نوح علیہ السلام کو تو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ علیہ السلام نے جتنی طویل مدت تک اپنی قوم کو جھنجھوڑا اور جگایا اس کی تاریخ میں کوئی اور مثال موجود نہیں لیکن اس کے باوجود اس کا جو حاصل رہا وہ خود آپ علیہ السلام کے الفاظ میں یہ ہے:

﴿ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيٓ إِلَّا فِرَارًا ﴾[۲]

ترجمہ: جتنا زیادہ میں نے ان کو پکارا وہ اتنا ہی زیادہ مجھ سے بھاگے۔

"مولانا امین احسن اصلاحیؒ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کی مقبولیت ہر شخص پر واضح تھی مگر ان کی دعوت چونکہ نفس کی خواہشوں کے خلاف تھی اور اسے قبول کرنے سے قوم کے لیڈروں کے اختیار پر چوٹ پڑتی تھی اس وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام نے جتنا ان کا تعاقب کیا وہ اتنا ہی بھاگے وہ جانتے تھے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی باتوں کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں اور اپنی زندگی کو بدلنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا لہذا سلامتی اور گریز فرار میں ہی جانا"۔[۳]

تفسیر ابن السعود میں اس آیت مبارکہ کی تفسیر کچھ یوں ہے کہ "﴿ لَيْلاً وَ نَهاراً ﴾ای **دائما من ئیر فتور ولا توان**" (یعنی لگاتار، بغیر کوتاہی اور بلا توقف)[۴]

---

(۱) سورۃ نوح: ۷۱/ ۵

(۲) سورۃ نوح: ۷۱/ ۶

(۳) تدبر قرآن، ۸/ ۵۸۴

(۴) ایضاً

داعیان کرام کے لیے دعوت و تبلیغ مخصوص وقت کے لیے نہیں بلکہ داعی ہر سانس دعوت و تبلیغ کا فریضہ سر انجام دیتا ہے اور حضور ﷺ کا بھی یہ طریقہ عمل رہا ہے۔

دعوت و تبلیغ میں کسی مخصوص وقت کی قید نہیں یہ امت محمدیہ ﷺ کا وہ فرض اولین ہے جو ہر حال میں جاری رہتا ہے مولانا صاحب نے حضرت نوح علیہ السلام کے اس اسلوب کی بھرپور ترجمانی کی ہے کہ انکی دعوت کی معقولیت کو وہ لوگ جانتے تھے تاہم ان کی دعوت چونکہ نفس کی خواہشات کے خلاف تھی اس لئے انہوں نے سوچا کہ سلامتی گریز اور فرار میں ہے۔

۲) نرم زبان اور شیریں کلام سے دعوت الی اللہ

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے تلخ و تند سوالات اور بد تہذیبی کا جواب ہمیشہ نرمی اور مہربانی اور شیریں زبان سے دیا۔ قوم کے جھٹلانے گمراہ کہنے اور طعن و تشنیع اور روسائے قوم کی بدزبانیوں کا جواب انتہائی نرم اور میٹھی زبان میں دیا۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے اپنی قوم کے مذاق اور استہزاء کو سننے کے بعد صرف اتنا کہا:

﴿قَالَ يَـٰقَوۡمِ لَيۡسَ بِي ضَلَـٰلَةٞ وَلَـٰكِنِّي رَسُولٞ مِّن رَّبِّ ٱلۡعَـٰلَمِينَ ﴾[۱]

ترجمہ: اے میری قوم مجھ میں تو ذرا بھی گمراہی نہیں میں پروردگار عالم کا رسول ہوں۔

مولانا اصلاحی صاحب فرماتے ہیں "حضرت نوح علیہ السلام نے جواب دیا کہ تم مجھے کوئی سر پھرا اور بھٹکا ہوا آدمی نہ سمجھو میں تمام عالم کے رب کی طرف سے تمہارے پاس پیغمبر کی حیثیت سے آیا ہوں اور جو کچھ تمہیں سنا رہا ہوں کوئی بات بھی اپنی طرف سے نہیں سنا رہا یہ خدا کا پیغام بھی ہے اور میری طرف سے تمہارے حق میں خیر خواہی بھی کہ تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی، ناقدری ودل آزاری، دشمنی وبیزاری کے باوجود تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہوں اور تمہارے ہاتھوں سب کچھ جھیل رہا ہوں۔ جذبہ ہمدردی اور خیر خواہی کے سوا اور کسی جذبے کا میری اس تگ ودو میں کوئی شائبہ نہیں بس یہ اندیشہ اور غم ہے کہ تم کہیں خدا کی پکڑ میں نہ آجاؤ۔ تم صرف ظاہر کو دیکھتے ہو اس وجہ سے تمہیں عذاب کا ڈراوا عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن خدا کی طرف سے وہ بات بھی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ تم اپنے ظاہری روگ کے ساتھ اگر اپنے ان روگوں سے بھی باخبر ہوتے جو تم نے اپنے سفید کپڑوں کے نیچے چھپا رکھے ہیں تو تمہیں اندازہ ہوتا کہ میں کتنی سچی بات کہہ رہا ہوں"۔[۲]

مزید فرمایا:

---

(۱) سورۃ اعراف: ۷/ ۶۱

(۲) تدبر قرآن، ۳/ ۲۹۴

﴿أَوَعَجِبْتُمْ أَن جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوا۟ وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾[1]

ترجمہ: کیا میری بات ماننے میں یہ چیز تمہیں مانع ہو رہی ہے کہ اللہ نے تمہی میں سے ایک شخص پر تمہارے لیے یاد دہانی اتاری تاکہ وہ سامنے کے خطرے سے تمہیں آگاہ کر دیں تاکہ تم اللہ سے ڈرو اور اس کی رحمت کے سزادار بنو۔

"یہاں سوال اٹھا کر بات چھوڑ دی ہے جواب نہیں دیا اس لیے کہ انداز کلام اظہار حسرت وافسوس کا ہے۔ اس اسلوب بیان میں یہ بات مضمر ہے کہ اگر تم سوچتے، غرور وانانیت کو راہ نہ دیتے تو یہ چیز تمہارے لیے تعجب اور استکبار کے بجائے ممنونیت اور شکر گزاری کا باعث ہوتی کہ خدا نے تمہارے ہی اندر سے ایک شخص کو تمہیں راہ نجات دکھانے کے لیے اٹھایا۔ میں تمہارے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں، میری زبان اور میرا دل تمہاری اپنی فطرت کا ترجمان ہے۔ تو کیا یہ بہتر ہوتا کہ تم پر اہتمام حجت کے لیے کوئی فرشتہ اترتا یا یہ بہتر ہے کہ تمہاری اپنی ہی زبان اور تمہارا اپنا ہی درد آشنا دل تم پر گواہی دے؟ اسلوب کلام کا کمال دیکھیے کہ اسلوب کلام میں ہی ساری داستان مضمر ہے یا اضمار ہی اس محل میں تقاضائے بلاغت ہے۔ آخر ان لوگوں کو غم دل سنانے سے کیا حاصل تھا جو سننے سے پہلے ہی اعتراض ونکتہ چینی کے لیے پر تولے ہوئے ہوں"۔[2]

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں مولانا امین احسن اصلاحی تھوڑی ترش اور سخت زبان استعمال کرتے ہیں کہ "حضرت نوح علیہ السلام نے کہا: تم مجھے کوئی سر پھرا اور بھٹکا ہوا آدمی نہ سمجھو" حضرت نوح علیہ السلام نے تو انتہائی نرم اور شیریں زبان میں جو کہ دعوت دین کا پہلا اصول ہے سے کلام فرمایا تھا:

"اے میری قوم مجھ میں تو ذرا بھی گمراہی نہیں میں پروردگار عالم کا رسول ہوں۔"

مولانا اصلاحی اس قصہ میں دعوت نوح علیہ السلام کے ایک اسلوب کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کا اسلوب اپنے اندر قوم کی تڑپ کو سموئے ہوئے ہیں اسی لئے مولانا اصلاحیؒ کے قلم میں بھی زبان کی نرمی اور شیرینی بلکہ قوم کا دکھ ہے۔

۳) قوم کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات کی یاد دہانی

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں اور بے پناہ احسانات کی یاد دلائی تاکہ وہ پروردگار پر ایمان لے آئیں اور اس کے شکر گزار بندے بن جائیں۔ چنانچہ سورۃ نوح میں ارشاد ربانی ہے:

---

(۱) سورۃ اعراف: ۷/ ۶۳

(۲) تدبر قرآن، ۳/ ۲۹۵

﴿وَٱللَّهُ جَعَلَ لَكُمُ ٱلۡأَرۡضَ بِسَاطًا o لِّتَسۡلُكُواْ مِنۡهَا سُبُلًا فِجَاجًا﴾ (۱)

ترجمہ: اور اللہ ہی نے تمہارے لیے زمین کو ہموار بنایا کہ تم اس کی کھلی راہوں میں چلو۔

ان آیات میں زمین کی نشانی کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت و حکمت کا بھی اظہار ہوتا ہے اور اس کی بے پناہ رحمت و عنایت کا بھی فرمایا ہم نے تمہارے لیے زمین کو ایک فرش کی طرح بچھایا اس کو متوازن رکھنے کے لیے اس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑھ دیں اور پہاڑوں کے اندر درے اور راستے نکال دیئے تاکہ تم ان دروں سے گزر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ آجاسکو۔ (۲)

ان آیات مبارکہ میں حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کروار ہے ہیں۔

یہ انسانی نفسیات کا ایک اہم اصول ہے کہ اگر ضدی، ہٹ دھرم اور ناشکرے شخص کو احسانات کی یاددہانی کروائی جائے تو اس کے اعصاب کا تناؤ کم ہو جاتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ بات کو سننے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ (۳)

یہی اسلوب حضرت نوح علیہ السلام نے اختیار کیا جس سے ان کی قوم ان کی بات سننے پر آمادہ ہوئی۔

یہ اسلوب اس لیے اختیار کیا کہ وہ سوتے ہوئے انسانی نفس کو بعض اوقات نعمتوں کے چھن جانے کا خوف ہی انسان کو اصلاح نفس پر مجبور کر دیتا ہے امین احسن صاحب خوبصورت انداز میں فرماتے ہیں اللہ نے زمین پر پہاڑ گاڑے کہ اس کا توازن قائم رہے اور ساتھ ہی اس میں درے بھی بنائے تاکہ انسان کیلئے آمد و رشد کی راہیں کھلی رہیں آیت مبارکہ کی تفسیر میں پہاڑوں کے دروں کی مثال غور و فکر اور تدبر کی نئی راہیں کھولتی ہیں اور تفسیر تدبر قرآن کا حق ادا کرتی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا پہلا مرحلہ انذار:

﴿إِنَّآ أَرۡسَلۡنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوۡمِهِۦٓ أَنۡ أَنذِرۡ قَوۡمَكَ مِن قَبۡلِ أَن يَأۡتِيَهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (۴)

ترجمہ: ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا کہ اپنی قوم کو قبل اس کے ان پر ایک دردناک عذاب آجائے ہوشیار کردو۔

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں مولانا امین احسنؒ صاحب فرماتے ہیں کہ اس آیت میں سنت الٰہی کا بیان ہے جس کی وضاحت قرآن مجید میں جگہ جگہ ہوتی ہے کہ جب کسی قوم کا اخلاقی فساد اس حد کو پہنچ گیا کہ وہ اللہ کے فیصلہ کن عذاب کی

---

(۱) سورۃ نوح: ۷۱/ ۱۹، ۲۰

(۲) تدبرِ قرآن: ۸/ ۶۱۰

(۳) تعلیمی نفسیات، شازیہ رشید، جدران پبلی کیشنز، ٹاؤن شپ، لاہور، ص ۱۳۱

(۴) سورۃ نوح: ۷۱/ ۱

مستحق ہو گی تو عذاب بھیجنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر اپنا ایک رسول بھیج کر اس پر اپنی حجت تمام کر دی ہے تا کہ کسی کے پاس گمراہی میں پڑے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اسی سنت کے مطابق اس نے قوم نوح پر عذاب بھیجنے سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا کہ اگر نجات مطلوب ہے تو لوگ اپنی گمراہی کی روش چھوڑ کر اس طریقہ کی پیروی کریں جس کی وہ دعوت دے رہے ہیں چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنی قوم کو آگاہ کیا جس طرح ایک "نذیر عریاں" اپنی قوم کو حملہ آور دشمن سے آگاہ کرتا ہے اسی طرح میں تمہارے لیے ایک نذیر مبین ہوں اور اللہ نے مجھے تمہاری طرف اس لیے بھیجا ہے کہ میں تمہیں اس عذاب سے ہوشیار کر دوں جو تمہارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔[1]

ایک داعی کا کام چونکہ افراد کی اصلاح کی کوشش ہے لہذا وہ دعوت دین میں انذاز کا طریقہ بھی اختیار کرتا ہے تا کہ لوگوں کو اصلاح پر آمادہ کیا جا سکے۔ مولانا صاحب یہی مضمون سورۃ نوح کی آیت نمبر ۲ میں بیان کرتے ہیں۔ یہی مضمون سورۃ یونس کی آیت نمبر ۷۳ میں بیان کیا گیا ہے۔

مفسر تدبر قرآن نذیر سے عریاں کے خوبصورت مثال پیش کرتے ہیں کیونکہ مولانا صاحب عرب کے جاہلی معاشرے کی رسومات سے اور لسان العرب سے گہری واقفیت رکھتے اور دورانِ تفسیر الفاظ کے لغوی اور معنوی تحقیق کو اہمیت دیتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی عظمت پر اعتقاد کے لیے مظاہر فطرت پر غور کی دعوت دینا:

حضرت نوح علیہ السلام کے قصے میں قرآن مجید نے متعدد علمی اور سائنسی علوم کی نقاب کشائی کی ہے جن کی تصدیق آج کے جدید علوم اور تحقیقات سے ہو رہی ہے۔ یعنی جن علوم و معارف سے آج کی جدید دنیا آج متعارف ہو رہی ہے اور ان کو جدید تحقیقات کا نام دے ریا جا رہا ہے قرآن مجید چودہ سو سال قبل ہی ان کو خبر دے چکا ہے۔

﴿وَجَعَلَ ٱلْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ ٱلشَّمْسَ سِرَاجًا﴾[2]

ترجمہ: اور چاند کو ان میں نور (روشنی) بنایا اور سورج کو چراغ ٹھہرایا۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں کو توحید الٰہی کی طرف مائل کرنے کے لیے مظاہر فطرت سے مثالیں دیں کہ خدا وہ ہے جس نے ان آسمانوں کے اندر چاند کو روشن اور سورج کو چراغ بنا رکھا جن سے ان کے اندر اجالا ہوتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کے ساتھ ساتھ اس کی بے نہایت حکمت اور عالم گیر ربوبیت کی طرف بھی اشارہ ہے اگر اس نے ان میں چاند کا دیا اور سورج کا چراغ نہ رکھا ہوتا تو یہ عالم ظلمات ہوتا۔ ان روشن نشانیوں کے بعد بھی جن کو آخرت ناممکن نظر آئے ان کی

---

(۱) تدبر قرآن، ۸/ ۵۹۱

(۲) سورۃ نوح: ۱۶/۷۱

آنکھیں کوئی چیز بھی نہیں کھول سکتی۔ یہاں یہ امر واضح ہے کہ اس کائنات میں خدا کی رحمت اور ربوبیت کی جو نشانیاں ہیں وہ ایک روز عدل کے ظہور کو واجب کرتی ہے۔[۱]

داعیان کرام دعوت و تبلیغ کے دوران مدعوبین کو متوجہ کرنے کے لیے مظاہر فطرت سے مثالیں دیتے ہیں اور اس طرح کا مضمون سورۃ نوح کی آیت نمبر ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۶، ۱۷، میں بیان کیا گیا ہے۔ تا کہ انسان اپنے ارد گرد کے ماحول کو غور اور توجہ سے دیکھے اور خدائے واحد کے وجود کا یقین کرے کیونکہ نظام فطرت توحید کا سب سے بڑا گواہ ہے۔ خود انسان کی اپنی ذات اور اس کی تخلیق کے مراحل خدائے واحد کی ذات کے واحدہ لاشریک ہونے کے عملی ثبوت ہیں۔

داعی اجرت اور معاوضے کے طلبگار نہ ہوں:

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے جو دعوت و تبلیغ کا فریضہ سر انجام دیا اس میں اپنی قوم سے بار بار کہا کہ میں اس دعوت کے کام کے لیے تم سے کسی صلے کا طلبگار نہیں ہوں نہ میں تم سے کوئی دنیاوی عہدہ اور مقام چاہتا ہوں اور نہ ہی میں تم سے کسی خاص فائدے کی امید رکھتا ہوں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا:

﴿ وَيَٰقَوۡمِ لَآ أَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مَالًاۖ إِنۡ أَجۡرِيَ إِلَّا عَلَى ٱللَّهِۚ وَمَآ أَنَا۠ بِطَارِدِ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْۚ إِنَّهُم مُّلَٰقُواْ رَبِّهِمۡ وَلَٰكِنِّيٓ أَرَىٰكُمۡ قَوۡمًا تَجۡهَلُونَ ﴾[۲]

ترجمہ: اے قوم! میں اس نصیحت کے بدلے تم سے مال و زر کا خواہاں نہیں ہوں میرا صلہ تو اللہ کے ہاں ہے اور جو لوگ ایمان لائے ہیں نہ میں ان کو اپنے پاس سے نکال سکتا ہوں وہ تو اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ نادانی کر رہے ہو۔

مولانا امین احسن صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"حضرت نوح علیہ السلام کو جب ان کی قوم نے بار بار جھٹلایا تو انہوں نے اپنی قوم کے سرداروں کی رعونت کا جواب یوں دیا کہ اگر تم میری بات سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہو تو اچھی طرح سمجھ لو! کہ اس میں میرا کوئی نقصان نہیں ہے میں جو کچھ تمہارے آگے پیش کر رہا ہوں اگر میں اس کے عوض میں تم میں سے کسی اجرت کا طالب ہوتا تو تمہاری اس بیزاری کی مجھے پرواہ ہوتی کہ تم نے میرے مال کی قدر نہیں کی اور میری دکان بیٹھ جائے گی لیکن جب میں کوئی تجارت نہیں کر رہا ہوں بلکہ جس طرح مفت پایا اسی طرح مفت بانٹ رہا ہوں تو تم اگر اس کو قبول نہ کرو گے تو خود ہی خسارہ میں رہو گے مجھے تو اس کا جو اجر ملنا ہے

---

(۱) تدبر قرآن، ۸/۶۰۰

(۲) سورۃ ھود: ۱۱/۲۹

وہ اللہ کے ذمہ ہے اور وہ مجھے مل کے رہے گا۔ تمہارے ردّ و قبول سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ رہی بات کہ میری دعوت جن لوگوں نے قبول کی ہے وہ تمہاری نگاہوں میں حقیر ورذیل لوگ ہیں اسی وجہ سے تمہیں میرے قرب سے عار ہے تو میں تمہاری دلداری کے لیے ان کو اپنے پاس سے دھتکارنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ وہ اپنے رب پر ایمان لائے ہیں اور کل کو اپنے اسی ایمان کے ساتھ اپنے رب کے ساتھ ملنے والے ہیں۔ اگر آج میں انہیں تمہاری خاطر داری میں اپنے پاس سے دھتکاروں تو کل میں خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ شرافت اور ذلت کا اصلی فیصلہ تو خدا کے ہاں ہونا ہے وہی بتائے گا کہ اس کی نگاہوں میں کون شریف ہے اور کون رذیل ہے۔[۱] ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَيَٰقَوْمِ مَن يَنصُرُنِي مِنَ ٱللَّهِ إِن طَرَدتُّهُمْۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴾[۲]

ترجمہ: اور اے میرے ہم قومو! اگر میں ان کو دھتکاروں تو خدا کے مقابل میں کون میری مدد کرے گا؟۔

اس مضمون میں مزید وضاحت ہے کہ اگر میں تمہاری ناز برداری میں اللہ پر ایمان لانے والے ان غریبوں کو دھتکاروں تو کل کو خدا کی پکڑ سے مجھے کون بچانے والا بنے گا۔ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ یعنی مال وجاہ کے غرور میں تم ایسے پاگل ہو گئے ہو کہ تم میں سے کسی کو معاملے کے اس پہلو پر غور کرنے کی توفیق نہیں ہوئی"۔[۳]

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں امین صاحب بڑے سادہ اور عام فہم انداز میں حضرت نوح علیہ السلام کے دعوتی کام میں اجرت کے طلبگار نہ ہونے کے اسلوب کو اپنی قوم کی ذہنی سطح اور فطرت کو سامنے رکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ خصوصاً ان کا یہ جملہ کہ "میں نے اس کو جس طرح مفت پایا اسی طرح مفت بانٹ رہا ہوں" یا ان کا یہ جملہ کہ "میں تم سے کسی اجرت کا طالب ہوتا تب تو تمہاری بیزاری کی مجھے پرواہ ہوتی کہ تم نے میرے مال کی قدر نہیں کی اور میری دکان بیٹھ جائے گی"۔ مولانا اس طرح کے جملے قوم نوح کی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں کیونکہ حضرت نوحؑ کی قوم منافع اور خسارے اور دنیاوی کاروبار میں زیادہ دلچسپی لیتی تھی

دعوت و تبلیغ میں اس طرح کے جملے جو مخاطب کی ذہنی سطح اور اس کے ماحول کو مد نظر رکھتے ہوئے بیان کیے جائیں وہ زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں۔

---

(۱) تدبر قرآن: ۶/ ۱۳۸

(۲) سورۃ ھود: ۱۱/ ۳۰

(۳) تدبر قرآن، ۶/ ۱۳۸

صبر واستقامت:

حضرت نوح علیہ السلام نے صبر واستقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی قوم کو ساڑھے نو سو سال دعوت حق دی قرآن میں اس کا ذکر اس طرح آتا ہے:

﴿ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِۦ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا فَأَخَذَهُمُ ٱلطُّوفَانُ وَهُمْ ظَٰلِمُونَ ﴾[1]

ترجمہ: اور ہم نے نوح علیہ السلام کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو وہ ان کے اندر پچاس سال کم ایک ہزار سال رہا تو ان کو طوفان نے آپکڑا اور وہ اپنی جانوں پر خود ظلم ڈھانے والے بنے۔

اصلاحی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ساڑھے نو سو سال کا ذکر صرف اسی سورۃ میں آیا ہے۔ عمر کی یہ تصریح اس سورۃ کے عمود کے تقاضے سے ہوئی ہے کہ جو لوگ حق کی راہ اختیار کریں ان کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ جلدی سے بغیر کوئی زحمت ومشقت جھیلے منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے بلکہ انہیں ایک طویل مدت تک آزمائشوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے یہاں حضرت نوح علیہ السلام کی عمر کا حوالہ دیا کہ انہیں اپنی قوم کے ساتھ ایک طویل مدت تک کشمکش کرنی پڑی تب کہیں جا کر وہ اللہ تعالیٰ کے امتحان میں سرخرو اور اپنے فرض سے فارغ ہوئے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی جو عمر یہاں مذکور ہے وہ تورات کے بیان کے مطابق ہے۔ تورات میں ہے،

"اور طوفان کے بعد نوح ساڑھے تین برس اور جیتا رہا اور نوح کی کل عمر ساڑھے نو سو برس کی ہوئی"۔[2]

اصلاحی صاحب مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

"کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں عمروں کا اوسط آج کی نسبت بہت زیادہ تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے والد کی عمر سات سو تہتر اور ان کے دادا کی عمر نو سو انہتر برس مذکور ہے۔ آیت مبارکہ کے دوسرے حصے میں اس حقیقت کی تائید ہے کہ ہر چند اللہ تعالیٰ اعدائے حق کو ڈھیل تو دیتا ہے لیکن پھر پکڑ تا ضرور ہے اور وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ سنت الہی کے مطابق جس طرح اہل حق کا کامیابی کی منزل پر پہنچنے سے پہلے امتحان ضروری ہے اسی طرح اہل باطل پر عذاب سے پہلے اتمام حجت لازمی ہے۔[3]

---

(۱) سورۃ العنکبوت: ۲۹/ ۱۴

(۲) کتاب پیدائش، باب ۹، ص ۲۸

(۳) تدبر قرآن، ۶/ ۲۸، ۲۹

معارف القرآن کا بیان:

آیت مبارکہ کی تفسیر میں مفتی محمد شفیع صاحب[1] فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام وہ پہلے پیغمبر ہیں جن کو کفر و شرک کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دوسرے اس لیے بھی کہ جتنی ایذائیں انہیں اپنی قوم کی طرف سے ان کو پہنچیں وہ کسی دوسرے پیغمبر علیہ السلام کو نہیں پہنچیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عمر طویل کا خصوصی امتیاز عطا فرمایا اور ان کی ساری عمر کفار کی ایذاؤں میں بسر ہوئی۔ ان کی عمر جو قرآن کے مطابق ہے وہ قطعی و یقینی ہے بہر حال اتنی غیر معمولی طویل عمر مسلسل دعوت و تبلیغ میں صرف کرنا اور ہر تبلیغ و دعوت کے وقت کفار کی طرف سے طرح طرح کی ایذائیں، مار پیٹ اور گلا گھونٹنے کی سہتے رہنا اور ان سب کے باوجود کسی وقت ہمت نہ ہارنا یہ سب صبر و استقامت کی انتہا ہے اور یہ حضرت نوح علیہ السلام کے دعوت و تبلیغ کی نمایاں خصوصیات ہیں۔[2]

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا آخری مرحلہ

اعلان برأت:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا يَنفَعُكُمْ نُصْحِىٓ إِنْ أَرَدتُّ أَنْ أَنصَحَ لَكُمْ إِن كَانَ ٱللَّهُ يُرِيدُ أَن يُغْوِيَكُمْ ۚ هُوَ رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴾[3]

ترجمہ: میری خیر خواہی تمہیں کچھ بھی نفع نہیں دے سکتی گو میں کتنی ہی خیر خواہی کیوں نہ چاہوں بشرطیکہ اللہ کا ارادہ تمہیں گمراہ کرنے کا ہو۔ وہی تم سب کا پروردگار ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

مولانا امین اصلاحی صاحب اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ دعوت و نصیحت کا آخری مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ رسول اپنا فرض ادا کر کے اپنی سبکدوشی کا اعلان کرتا ہے اور اپنے جھٹلانے والوں کو ان کے اس انجام کے حوالے کرتا ہے جو ان کے لیے خدا کی طرف سے مقرر ہو چکا ہوتا ہے۔ یہ بات حضرت نوح علیہ السلام نے اس مرحلے میں بیان فرمائی ہے کہ اب تم خدا کے

---

(۱) مفتی محمد شفیع: آپ کے دادا نے آپ کا نام مبین اور آپ کے استاد نے آپ کا نام شفیع رکھا۔ آپ ۱۸۹۷ء میں دیوبند میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں کراچی میں وفات پائی۔ اہم تصانیف معارف القرآن، قرآن میں نظامِ زکوۃ، ختم نبوت، مقامِ صحابہ، دستور قرآنی اسلام اور سوشلزم ہیں۔ آپ کو مفتی اعظم پاکستان بھی کہا جاتا ہے۔ (تاریخ و تفسیر، فقیر محمد، ص ۴۳)

(۲) معارف القرآن، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، ادارہ المعارف، کراچی، اپریل ۱۹۹۳ء، ۶/ ۶۸۱، ۶۸۲

(۳) سورۃ ھود: ۱۱/ ۳۴

قانون کی زد میں آچکے ہو لہذا میں تمہیں لاکھ نصیحت و موعظت کروں کچھ کارگر نہیں ہو سکتی اب تمہارا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔

﴿أَمْ يَقُولُونَ ٱفْتَرَىٰهُ ۖ قُلْ إِنِ ٱفْتَرَيْتُهُۥ فَعَلَىَّ إِجْرَامِى وَأَنَا۠ بَرِىٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ﴾[1]

ترجمہ: کیا یہ کہتے ہیں کہ اس نے اس کو گھڑ لیا ہے، کہہ دو کہ اگر میں نے اس کو گھڑا ہے تو میرے جرم کا وبال میرے ہی اوپر ہے اور جو جرم تم کر رہے ہو میں اس سے بری ہوں۔

آیت مبارکہ کی تفسیر میں مولانا امین اصلاحی صاحب بیان کرتے ہیں کہ اس آیت میں بعض لوگوں نے مخاطب حضور ﷺ کو سمجھا ہے اور اس کو حضرت نوح علیہ السلام کی سرگزشت کے درمیان ایک التفات کی حیثیت دی ہے۔ اگرچہ اس کے التفات ہونے کا بھی ایک محل ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ دعوت و موعظت کے آخری مرحلے میں اعلان براءت کی آیت ہے۔ اس آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کو ہدایت ہوتی ہے کہ اگر تمہاری قوم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ تم انہیں بتا رہے ہو یہ سب تمہاری اپنی ہی گھڑی ہوئی باتیں ہیں جن کو تم جھوٹ موٹ خدا کی طرف منسوب کر رہے ہو تو اب یہ بحث بند کر دو اور ان سے کہہ دو کہ اگر یہ سب کچھ میرا افترا ہے تو اس جرم کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور اگر یہ حق ہے اور تم جان بوجھ کر اس سے بغاوت کر رہے ہو تو میں تمہارے اس جرم کی ذمہ داری سے اپنی براءت کا اعلان کرتا ہوں۔ مذکورہ بالا اعلان براءت کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کو وحی کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ تمہاری قوم میں جن لوگوں کے اندر تمہاری دعوت ایمان کو قبول کرنے کی صلاحیت تھی وہ ایمان لا چکے اب کوئی نہیں ایمان لائے گا۔ دودھ میں جتنا مکھن تھا وہ سب نکالا جا چکا ہے اب جو بچ رہا ہے وہ صرف چھاچھ ہے تو تم خاطر جمع رکھو یہ جو کچھ اب تک ہوا اس سے دل شکستہ اور ملول نہ ہو۔[2]

مولانا امین احسن صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں مکھن اور چھاچھ کی جو مثال دے رہے ہیں اس سے قاری کو نہ صرف بات سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے بلکہ ذوق طبع کا سامان بھی پیدا ہوتا ہے۔ مولانا اپنی تفسیر میں اس طرح کی مثالیں جا بجا بیان کرتے ہیں تاکہ قاری کو ترجمے کے نیچے بے جان اور خشک عبارت نہ پڑھنی پڑے اور وہ روزمرہ ماحول سے وابستہ رہے ان کی تفسیر میں دعوتی اسالیب بیان کرنے میں روزمرہ زندگی سے بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

---

(۱) سورۃ ھود: ۱۱/ ۳۵

(۲) تدبر قرآن، ۴/ ۱۴۰

فصل دوم

حضرت نوح علیہ السلام کے اسالیب دعوت تفہیم القرآن کی روشنی میں

حضرت نوح علیہ السلام کی گمراہ قوم کو تبلیغ توحید:

قرآن پاک نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِۦ فَقَالَ يَـٰقَوْمِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَـٰهٍ غَيْرُهُۥٓ إِنِّىٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾(۱)

ترجمہ: ہم نے نوح علیہ السلام کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اس نے کہا" اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں۔ میں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔

ان آیات مبارکہ میں حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو اللہ کی عبادت کی طرف بلاتے ہیں۔ شرک سے روکتے ہیں کہ تمہارا اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ سید مودودی آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "قرآن کی رو سے جس صالح نظام زندگی پر حضرت آدم علیہ السلام اپنی اولاد کو چھوڑ کر گئے تھے اس میں سب سے پہلا بگاڑ حضرت نوح علیہ السلام کے دور میں رونما ہوا اور اس کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو بھیجا۔ یہاں اور دوسرے مقامات پر حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا جو حال قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ یہ قوم تو اللہ کے وجود کی منکر تھی نہ اس سے واقف تھی نہ اسے اللہ تعالیٰ کی عبادت سے انکار تھا بلکہ اصل گمراہی جس میں وہ مبتلا تھی وہ شرک کی گمراہی تھی یعنی اس نے اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو خدائی میں شریک اور عبادت کے استحقاق میں حصہ دار قرار دے لیا تھا۔ پھر اس بنیادی گمراہی سے بے شمار خرابیاں اس قوم میں رونما ہو گئیں جب خود ساختہ معبود خدائی میں شریک ٹھہرا لیے گئے تھے ان کی نمائندگی کرنے کے لیے قوم میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو تمام مذہبی، سیاسی اور معاشی اقتدار کا مالک بن بیٹھا اور اس نے انسانوں میں اونچ نیچ کی تقسیم پیدا کر دی، اجتماعی زندگی کو ظلم و فساد سے بھر دیا اور اخلاقی فسق و فجور سے انسانیت کی جڑیں کھوکھلی کر دی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اس حالت کو بدلنے کے لیے ایک زمانہ دراز تک انتہائی صبر و حکمت کے ساتھ کوشش کی مگر عامۃ الناس کو ان لوگوں نے اپنے مکر کے جال میں ایسا پھانس رکھا تھا کہ اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتی اور بالآخر یہ قوم اپنے انجام کا شکار ہوئی بوجہ شرک کے"۔(۲)

مودودی صاحب نے آیات مبارکہ کی تفسیر میں بہت خوبصورتی سے اور جامع انداز میں قوم نوح کے شرک کی حالت کو بیان کیا ہے۔

---

(۱) سورۃ اعراف: ۷/ ۵۹

(۲) تفہیم القرآن، ۲/ ۴۱

مودودی صاحب نے آیت مبارکہ کی تفسیر میں تین اہم نکات کی طرف اشارہ کیا ہے قوم نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے انکار نہ تھا وہ شرک چھوڑنے پر تیار نہ تھے شرک چونکہ سب سے بڑی خرابی ہے لہذا اس نے دیگر خرابیوں کو جنم دیا اور وہ بتوں کے مجاور یعنی بتوں کے مزاجی خدا بن بیٹھے اسی شرک نے ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو مسائل سے پر کر ڈالا اور ان کی اخلاقی حالت تباہ ہو گئی۔

حضرت نوح علیہ السلام کا اسلوب دعوت

بذریعہ خوشخبری:

جب بھی رسول کسی قوم کو اللہ کے راستے کی طرف اس کی اطاعت کی طرف بلاتا ہے تو اپنی قوم کو ترغیب دلانے کے لیے اس راستے پر چلنے کے انعامات کا تذکرہ بھی کرتا ہے تاکہ لوگوں میں ذوق وشوق پیدا ہو۔ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو توحید کی طرف دعوت دی تو فرمایا:

﴿ أَنِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ وَٱتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ ० يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ أَجَلَ ٱللَّهِ إِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۖ لَوْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴾(۱)

ترجمہ: اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔ وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور مقرر وقت تک تم کو مہلت دے گا۔ جب اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آجاتا ہے تو تاخیر نہیں ہوتی۔ کاش تم جانتے ہوتے"۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ "یہ تین بنیادی باتیں تھیں جو حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی رسالت کا آغاز کرتے ہوئے اپنی قوم کے سامنے پیش کیں ایک اللہ کی بندگی، دوسرے تقوی، تیسرے رسول کی اطاعت اللہ کی بندگی کا مطلب یہ ہے کہ صرف اللہ کو معبود تسلیم کرو اور اس کی پرستش کرو۔ دوسرے تقوی کا مطلب یہ تھا کہ ان کاموں سے پرہیز کرو جو اللہ کی ناراضگی اور اس کے غضب کا سبب ہیں اور اپنی زندگی میں وہ روش اختیار کرو۔ جو خداترس لوگوں کو اختیار کرنی چاہیے۔ رہی تیسری بات کہ "میری اطاعت کرو" تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ان احکام کی اطاعت کرو جو اللہ کا رسول ہونے کی حیثیت سے میں تمہیں دیتا ہوں۔

اصل الفاظ میں "يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ "اس فقرے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تمہارے گناہوں میں سے بعض کو معاف کر دے گا بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر تم ان تین باتوں کو قبول کر لو جو تمہارے سامنے پیش کی جارہی ہیں

---

(۱)سورۃ نوح: ۷۱/ ۳،۴

تو اب تک جو گناہ تم کر چکے ہو ان سب سے وہ در گزر فرما دے گا یہاں من تبعیض نہیں بلکہ عن کے معنی میں ہے۔یعنی اگر تم نے یہ تین بات مان لیں تو تمہیں دنیا میں اس وقت تک جینے کی مہلت دے دی جائے گی جو اللہ نے تمہاری طبعی موت کے لیے مقرر کی ہے۔ (۱)

درج بالا تفسیر کی روشنی میں مولانا کی رائے کے مطابق داعی کو اپنی مخاطبین سے تبشیر اور تیسر کی حکمت بھی اپنانی چاہیے کیونکہ خوشخبری اور آسانی دونوں وہ اہم دعوتی اسالیب ہیں جس سے لوگوں کے دل بات کو سننے پر آمادہ ہوتے ہیں اور یہ آمادگی اصلاح کا پہلا قدم ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے اہم اسلوب استغفار:

استغفار کا موضوع بھی نوح علیہ السلام کی دعوت کا ایک اہم جز ہے۔ گناہوں کی کثرت کے سبب انسان اپنے رب سے دور ہو جاتا ہے اور شیطان کے قریب ہو جاتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم بھی گناہوں میں مبتلا تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو بار بار استغفار کی طرف توجہ دلائی تاکہ دلوں کا میل صاف ہو اور ان کی قوم حق کی طرف متوجہ ہو۔ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:

﴿فَقُلْتُ ٱسْتَغْفِرُوا۟ رَبَّكُمْ إِنَّهُۥ كَانَ غَفَّارًا﴾ (۲)

ترجمہ: میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو بے شک وہ بڑا ہی بخشنے والا ہے۔

سید مودودی آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے کہ اپنے رب سے معافی مانگو کیونکہ خدا سے بغاوت کی روش صرف آخرت ہی میں نہیں دنیا میں بھی انسان کی زندگی کو تنگ کر دیتی ہے اور اس کے برعکس اگر کوئی قوم نافرمانی کے بجائے ایمان و تقوی اور احکام الہی کی اطاعت کا طریقہ اختیار کرلے تو یہ آخرت ہی میں نافع نہیں بلکہ دنیا میں بھی اس پر نعمتوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ (۳)

یہی مضمون سورۃ ھود میں یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿وَيَٰقَوْمِ ٱسْتَغْفِرُوا۟ رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوٓا۟ إِلَيْهِ يُرْسِلِ ٱلسَّمَآءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا۟ مُجْرِمِينَ﴾ (۴)

---

(۱) تفہیم القرآن، ۶/ ۹۸،۹۹

(۲) سورۃ نوح: ۷۱/ ۱۰

(۳) تفہیم القرآن، ۶/ ۱۰۰

(۴) سورۃ ھود: ۱۱/ ۵۲

ترجمہ: اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے معافی چاہو پھر اس کی طرف پلٹو وہ تم پر آسمان کے دھانے کھول دے گا اور تمہاری قوت پر مزید قوت کا اضافہ کر دے گا اور تم نافرمان ہو کر نہ پھر جاؤ۔

آیت مبارکہ کی تفسیر میں مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ وہی بات ہے جو حضور ﷺ سے کی گئی تھی۔ اپنے رب سے معافی مانگو تم کو اچھا سامان زندگی دے گا اس سے معلوم ہوا کہ آخرت ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں بھی نعمتوں کا اتار چڑھاؤ اخلاقی بنیادوں پر ہوتا ہے۔ یہ بات قرآن پاک میں کئی مقامات پر بیان کی گئی ہے کہ جب ایک قوم کے پاس نبی کے ذریعے سے خدا کا پیغام پہنچتا ہے اگر وہ اسے قبول کر لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر نعمتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے اگر رد کر دیتی ہے تو اسے تباہ کر دیا جاتا ہے۔ لیکن عین اس وقت جب کہ وہ اپنے اس برے انجام کی طرف بگٹٹ چلی جارہی ہو اگر وہ اپنی غلطی کو محسوس کر لے اور نافرمانی چھوڑ کر خدا کی بندگی کی طرف پلٹ آئے تو اس کی قسمت بدل جاتی ہے اس کی مہلت عمل میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اور مستقبل میں اس کے لیے عذاب کے بجائے انعام، ترقی اور سر فرازی کا فیصلہ لکھ دیا جاتا ہے۔[1]

مودودی صاحب ان آیات مبارکہ کی تفسیر میں نہایت خوبصورت انداز میں استغفار کی اہمیت کو اجگر کرتے ہیں کہ استغفار صرف دنیاوی ہی نہیں بلکہ اخروی کامیابی کی ضمانت بھی ہے۔

ایک داعی کو دعوت کے ہر مرحلے میں استغفار کے اسلوب سے خود بھی مدد لینی چاہیے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دینے رہنا چاہیے تاکہ کسی بھی لمحے شیطان اسے غافل سمجھ کر شرک کی طرف نہ لے جاسکے نہ اس کے اندر کسی قسم کا غرور و تکبر پیدا کر سکے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا انذار:

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی پوری زندگی اپنی قوم کو حق بات کی طرف دعوت دینے میں گزاری۔ دعوت الی اللہ کو پیش کرنے کے سلسلے میں جو تجربات آپ کو حاصل ہوئے وہ آنے والے داعیان کرام کے لیے سنگ میل ثابت ہوئے۔

"انذار" کے بنیادی معنی اطلاع دینے مشورہ دینے اور خبر دار کرنے کے ہیں جیسے کہتے ہیں،

انذرته بكذا[2]

میں نے اسے اس چیز کی اطلاع دی یا اس کے بارے میں مشورہ دیا۔

قرآن پاک نے نوح علیہ السلام کے لیے "نذیر" کی اصطلاح استعمال کی ہے یعنی وہ خبر دار کرنے والے ہیں۔

---

(۱) تفہیم القرآن، ۲/ ۳۴۶

(۲) لسان العرب، ابن منظور، ۵/ ۲۰۱

﴿ وَلَقَدۡ أَرۡسَلۡنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوۡمِهِۦ فَقَالَ يَٰقَوۡمِ ٱعۡبُدُواْ ٱللَّهَ مَا لَكُم مِّنۡ إِلَٰهٍ غَيۡرُهُۥٓۚ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴾[۱]

ترجمہ: اور ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تو انہوں نے ان سے کہا کہ اے قوم اللہ ہی کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں کیا تم ڈرتے ہو؟۔

سورۃ الشعراء میں اس مضمون کو یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿ إِذۡ قَالَ لَهُمۡ أَخُوهُمۡ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴾[۲]

ترجمہ: ان سے ان کے بھائی نوح نے کہا! تم ڈرتے کیوں نہیں۔

آیات مبارکہ کی تفسیر میں مودودی فرماتے ہیں کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے ابتدائی خطاب میں ان الفاظ کو استعمال کیا ہے کہ اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے تو کیا تم ڈرتے نہیں ہو۔ یہاں حضرت نوح علیہ السلام کے اس ارشاد کا مطلب محض خوف پیدا کرنا نہیں بلکہ اللہ کا خوف پیدا کرنا ہے یعنی کیا تم اللہ سے بے خوف ہو گئے ؟ اس کے سوا دوسروں کی بندگی کرتے ہوئے تم کچھ نہیں سوچتے کہ اس باغیانہ روش کا انجام کیا ہو گا۔[۳]

دعوت و تبلیغ کے آغاز میں خوف دلانے کی حکمت یہ ہے کہ جب تک کسی شخص یا گروہ کو اس کے غلط رویے کی بد انجامی کا خطرہ نہ محسوس کروایا جائے وہ صحیح بات اور اس کے دلائل کی طرف توجہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ راہ راست کی تلاش آدمی کے دل میں پیدا ہی اس وقت ہوتی ہے جب اس کو یہ فکر دامن گیر ہو جاتی ہے کہ کہیں میں کسی ٹیڑھے راستے پر تو نہیں جا رہا ہوں جس میں ہلاکت کا اندیشہ ہو۔

اللہ سے ڈرو کا تنبیہی فقرہ اس لیے ارشاد فرمایا گیا ہے تاکہ ہر مخاطب اچھی طرح کان کھول کر سن لے کہ رسول کی رسالت کو تسلیم نہ کرنے اور اس کی اطاعت قبول نہ کرنے کا کیا نتیجہ کیا ہو گا۔ داعی کو اپنے مخاطبین کی حالت کو سامنے رکھتے ہوئے حکمت و بصیرت سے کام لینا چاہیے داعی حضرات کو دعوت و تبلیغ میں خوشخبری کے ساتھ ساتھ انذار کے پہلو کو بھی اجاگر کرنا ہوتا ہے تاکہ لوگوں کو سیدھا راستہ دکھایا جا سکے۔

---

(۱) سورۃ المومنون: ۲۳/۲۳

(۲) سورۃ الشعراء: ۲۶/۱۰۶

(۳) تفہیم القرآن، ۳/۵۱۰

دعوت و تبلیغ خیر خواہی کے ذریعے:

حضرت نوح علیہ السلام کے اسالیب دعوت میں خیر خواہی کا عنصر نمایاں ہے۔ دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے ہوئے داعی کو یہ یقین دہانی بھی اپنے قوم سے کروانی ہوتی ہے کہ اسے اپنے مخاطب لوگوں سے کتنی ہمدردی اور خیر خواہی ہے جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:

﴿أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنصَحُ لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾[(۱)]

ترجمہ: تمہیں اپنے پروردگار کا پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور مجھ کو اللہ کی طرف سے ایسی باتیں معلوم ہیں جن سے تم بے خبر ہو۔

اس مضمون کو سورۃ ھود میں یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿وَلَا يَنفَعُكُمْ نُصْحِي إِنْ أَرَدتُّ أَنْ أَنصَحَ لَكُمْ إِن كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَن يُغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾[(۲)]

ترجمہ: اور اگر میں یہ چاہوں کہ تمہاری خیر خواہی کروں اور اللہ یہ چاہے کہ تمہیں گمراہ کردے تو میری خیر خواہی تم کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتی وہی تمہارا پروردگار ہے اور تمہیں اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کی خیر خواہی چاہتے تھے اور انہیں اپنے رب کے پیغامات سناتے تھے تاکہ وہ راہ راست پہ آجائیں۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ جو پیغام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا جو اعتراض اہل مکہ نے کیے تھے وہی نوح علیہ السلام کی قوم نے ہزاروں سال پہلے کیے تھے۔ ہر نبی کی قوم کا رویہ اہل مکہ کے رویے سے اور ہر نبی کی تقریر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سے ہو بہو مشابہ ہے۔ اس سے قرآن اپنے مخاطبوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ انسان کی گمراہی ہر عہد اور ہر سر زمین میں یکساں رہی ہے اور ٹھیک اسی طرح ان لوگوں کا انجام بھی ایک جیسا ہوا ہے اور ہو گا جنہوں نے انبیا کی دعوت سے منہ موڑا اور ان کی بات نہ مانی اور اپنی گمراہی پر اقرار کیا۔[(۳)]

سورۃ ھود کی تفسیر میں مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہٹ دھرمی شر پسندی اور خیر سے بے رغبتی دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہیں راست کردی کی توفیق نہ دے اور جن راہوں میں تم خود بھٹکنا چاہتے ہو انھی میں تم کو

---

(۱) سورۃ الاعراف: ۷/ ۶۲

(۲) سورۃ ھود: ۱۱/ ۳۴

(۳) تفہیم القرآن ۲/ ۴۲

بھٹکا دے تو اب تمہاری بھلائی کے لیے میری کوئی کوشش کار گر نہیں ہو سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ گھٹیا قسم کے لوگوں کا ذہن ہمیشہ بات کے برے پہلو کی طرف جایا کرتا ہے اور اچھائی سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوئی کہ بات کے اچھے پہلو پر نظر رکھے۔ ایک شخص نے اگر حکمت و بھلائی کی بات کی ہے یا وہ تمہیں کوئی سبق دے رہا ہے یا تمہاری کسی غلطی پر تم کو متنبہ کر رہا ہے تو اس سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنی اصلاح کرو مگر گھٹیا آدمی ہمیشہ خیر خواہی کی بات میں بھی برائی کا پہلو تلاش کرے گا جس سے وہ حکمت و نصیحت پر پانی پھیر دے گا بہتر سے بہتر نصیحت بھی ضائع کی جاسکتی ہے اگر سننے والا اسے خیر خواہی کی بجائے چوٹ کے معنی میں لے لے اور اس کا ذہن اپنی غلطی کے احساس اور ادراک کی بجائے برا ماننے کی طرف چل پڑے اور اس طرح کے لوگ ہمیشہ اپنی فکر کی بنیاد ایک بنیادی بد گمانی پر رکھتے ہیں۔[۱]

داعیان کرام کو اپنی دعوت کو موثر بنانے کے لیے خود کو خیر خواہ ثابت کرنا ہوتا ہے تاکہ لوگ انہیں سن سکیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ۹۵۰ سال اپنی قوم کو دعوت دی اور ان کی اصلاح کے لیے اتنی طویل جدوجہد کرنا ان کے جذبہ خیر خواہی کی عظیم مثال ہے۔ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں داعی کے مخاطبین کے ایک نفسیاتی پہلو کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ بعض اوقات گھٹیا قسم کے لوگ داعی کی تمام کوششوں اور اس کی خیر خواہی پر پانی پھیر دیتے ہیں تاہم داعی حضرات کو ہر لمحہ اپنے آپ کو ان کا ہمدرد ثابت کرنا ہوتا ہے۔

سرداران قوم کا حضرت نوح علیہ السلام سے استہزا:

دعوت و تبلیغ کے کام میں داعی حضرات کو دوسروں کے استہزا اور طعنے سننے پڑتے ہیں۔ دعوت کے مخاطبین اگرچہ قوم کے سب لوگ ہوتے ہیں لیکن رد عمل مختلف ہوتا ہے کچھ لوگ انبیا کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور مومنین میں شامل ہو جاتے ہیں اور کچھ عاقبت نااندیش اس دعوت کو رد کر دیتے ہیں اور منکرین میں شامل ہو جاتے ہیں وہ نہ صرف خود منکرین کی صف میں شامل ہوتے ہیں بلکہ وہ دوسروں کو بھی اپنے مذاق واستہزا کا نشانہ بناتے ہیں اور انہیں بھی دعوت حق قبول کرنے سے روکتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں صاحب اثر گروہ نے بھی یہی روش اختیار کی اور کہا:

﴿قَالَ ٱلْمَلَأُ مِن قَوْمِهِۦٓ إِنَّا لَنَرَىٰكَ فِى ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ﴾[۲]

ترجمہ: اس قوم کے سرداروں نے جواب دیا ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔

---

(۱) تفہیم القرآن ۲/ ۳۳۶،۳۳۷

(۲) سورۃ الاعراف:۷/ ۶۰

﴿فَقَالَ ٱلْمَلَؤُا۟ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ مِن قَوْمِهِۦ مَا هَٰذَآ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَن يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ ٱللَّهُ لَأَنزَلَ مَلَٰٓئِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِىٓ ءَابَآئِنَا ٱلْأَوَّلِينَ﴾(۱)

ترجمہ: تو ان کی قوم کے سردار جو کافر تھے کہنے لگے یہ تو تم ہی جیسا آدمی ہے تم پر بڑائی حاصل کرنا چاہتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو فرشتے اتار دیتا۔ ہم نے اپنے اگلے باپ دادا میں تو یہ بات کبھی نہیں سنی۔

مودودی فرماتے ہیں کہ یہ خیال تمام گمراہ لوگوں کی مشترکہ گمراہیوں میں سے ایک ہے کہ بشر نبی نہیں ہو سکتا اور نبی بشر نہیں ہو سکتا اس لیے قرآن نے بار بار اس جاہلانہ تصور کا ذکر کر کے اس کی تردید کی ہے اور اس بات کو پورزور سے بیان کیا ہے کہ تمام انبیا انسان تھے اور انسانوں کے لیے انسان ہی نبی ہونا چاہیے۔

یہ بھی مخالفین حق کا قدیم ترین حربہ ہے کہ جو شخص بھی اصلاح کے لیے کوشش کرنے کے لیے اٹھے اس پر فورا یہ الزام چسپاں کر دیتے ہیں کہ یہ شخص کچھ نہیں محض اقتدار کا بھوکا ہے۔ یہی الزام فرعون نے حضرت موسٰی علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام پر لگایا تھا کہ۔ اور اسی کا شبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سرداران قریش کو تھا چنانچہ انہوں نے کئی مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سودا کرنے کی کوشش کی کہ اگر اقتدار کے طالب ہو تو "اپوزیشن" کو چھوڑ کر حزب اقتدار میں شامل ہو جاؤ تمہیں ہم بادشاہ بنا لیتے ہیں اصل بات یہ ہے کہ لوگ ساری عمر دنیا اور اس کے مادی فائدوں اور اس کی شان و شوکت ہی کے لیے اپنی جان کھپاتے رہتے ہیں ان کے لیے یہ تصور کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی انسان نیک نیتی اور بے غرضی کے ساتھ فلاح انسانیت کی خاطر اپنی جان بھی کھپا سکتا ہے وہ خود چونکہ اپنا اثر اور اقتدار جمانے کے لیے دل فریب نعرے اور اصلاح کے جھوٹے دعوے شب و روز استعمال کرتے رہتے ہیں اس لیے یہ مکاری و فریب کاری ان کی نگاہ میں ایک فطری چیز ہوتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اصلاح کا نام مکر و فریب کے سوا کسی صداقت اور خلوص کے ساتھ کبھی لیا ہی نہیں جا سکتا یہ نام جو بھی لیتا ہے اصلاح کا کام جو بھی کرتا ہے وہ ضرور ان کا اپنا ہم جنس ہو گا اور لطف یہ ہے کہ مصلحین کے خلاف "اقتدار کی بھوک" کا یہ الزام ہمیشہ برسر اقتدار لوگ اور ان کے خوشامدی حاشیہ نشین ہی استعمال کر رہے ہیں گویا خود انہیں اور ان کے آقایان نامدار کو جو اقتدار حاصل ہے وہ تو ان کا پیدائشی حق ہے اس کے حاصل کرنے اور اس پر قابض رہنے میں ہی وہ کسی الزام کے مستحق نہیں البتہ نہایت قابل ملامت ہیں وہ جس کے لیے یہ "غذا" پیدائشی حق نہ تھی اور اب یہ لوگ اس کے اندر اس چیز کی بھوک محسوس کر رہے ہیں اس جگہ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جو شخص بھی رائج الوقت نظام زندگی کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے اٹھے گا اور اس کے مقابلے میں اصلاحی نظریہ و نظام پیش کرے گا اس کے لیے ہر حال میں یہ بات ناگزیر ہو گی کہ اصلاح کی راہ میں جو طاقتیں بھی سد راہ ہوں انہیں ہٹانے کی کوشش کرے اور ان طاقتوں کو برسر اقتدار لائے جو اصلاحی نظریہ و نظام کو عملاً

(۱) سورۃ المومنون: ۲۳/ ۲۴

نافذ کر سکیں۔ نیز ایسے شخص کی دعوت جب بھی کامیاب ہو گی اس کا قدرتی نتیجہ ہی ہو گا وہ لوگوں کا مقتدا اور پیشوا بن جائے گا اور نئے نظام میں اقتدار کی باگیں یا تو اس کے اپنے ہی ہاتھوں میں ہو گی یا اس کے حامیوں اور پیروؤں کے ہاتھ اس پر قابض ہوں گے۔ آخر انبیاء اور مصلحین عالم میں سے کون ہے جس کی کوششوں کا مقصد اپنی دعوت کو عملا نافذ کرنا نہ تھا۔ یہ الزام کے وہ "اقتدار کا بھوکا" ہے سراسر غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقتدار کی بجائے خود مطلوب ہونے اور کسی مقصد خیر کے لیے مطلوب ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہے یہ اتنا بڑا فرق ہے جتنا ڈاکو کے خنجر اور ڈاکٹر کے خنجر میں ہے۔ اگر کوئی شخص اس بنا پر ڈاکٹر اور ڈاکو کو ایک کر دے کہ دونوں بالا ارادہ جسم چیرتے ہیں اور دونوں کے اس عمل کے نتیجے میں مال ہاتھ آتا ہے تو یہ اس کے اپنے دل و دماغ کا قصور ہے۔ ورنہ دونوں کے طریق کار اور دونوں کے مجموعی کردار میں اتنا فرق ہے کہ کوئی صاحب عقل ڈاکو کو ڈاکٹر نہیں سمجھ سکتا۔[۱]

مودودی آگے چل کر مزید فرماتے ہیں کہ پیغمبر کی مخالفت کے لیے اٹھنے والے اصل لوگ وہ تھے جنہیں قوم کی سرداری حاصل تھی ان سب کی مشترکہ گمراہی یہ تھی کہ وہ آخرت کے منکر تھے اس لیے خدا کے سامنے کسی ذمہ داری وجواب دہی کا انہیں اندیشہ نہ تھا۔ اور اس لیے وہ دنیا کی اس زندگی پر فریفتہ تھے اور "مادی فلاح و بہبود" سے بلند تر کسی قدر کے قائل نہ تھے پھر اس گمراہی میں جس چیز نے انہیں بالکل غرق کر دیا تھا وہ معاشی خوشحالی تھی انسانی تاریخ بار بار اس حقیقت کو دہراتی ہے کہ "دعوت حق کی مخالفت" کرنے والے ہمیشہ انہی خصوصیات کے حامل لوگ ہیں۔[۲]

دعوت و تبلیغ کے اس مقدس کام میں داعی حضرات کو بھی اسی طرح لوگوں کے اعتراضات اور استہزا برداشت کرنے پڑتے ہیں جس طرح کے حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کیے گئے۔ لیکن حضرت نوح علیہ السلام دل برداشتہ نہ ہوئے بلکہ پورے خلوص، لگن اور جذبے کے ساتھ دعوت حق کا کار خیر انجام دیا۔ اور بار بار کہا کہ میں تمہارے لیے ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ رکھتا ہوں اور تمہاری دل آزاری اور بیزارگی کے باوجود میں تمہیں مسلسل سمجھا رہا ہوں کیونکہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ علم کی بنیاد پر عواقب سے جو آگاہی مجھے حاصل ہے وہ تمہیں میسر نہیں لہذا تمہارا یہ الزام کہ میں گمراہی میں مبتلا ہوں ایک فضول بات ہے میں نہ صرف اللہ کا پیغام پہنچا رہا ہوں بلکہ تمہاری بھلائی کے لیے مصروف کار ہوں۔

مدعوین کو مائل کرنے کے لیے تخلیق انسان کی طرف مائل کرنا

دعوت و تبلیغ میں داعی کو مدعوین کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے مختلف مثالوں سے بات ثابت کرنا پڑتی ہے تاکہ فریقین اس میں دلچسپی محسوس کریں اور غور و فکر کریں۔

---

(۱) تفہیم القرآن ۳/ ۲۷۳، ۲۷۵

(۲) تفہیم القرآن ۳/ ۲۷۷

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَٱللَّهُ أَنۢبَتَكُم مِّنَ ٱلۡأَرۡضِ نَبَاتًا﴾(۱)

ترجمہ: اور اللہ نے ہی تم کو زمین سے پیدا کیا۔

﴿ثُمَّ يُعِيدُكُمۡ فِيهَا وَيُخۡرِجُكُمۡ إِخۡرَاجًا ۝ وَٱللَّهُ جَعَلَ لَكُمُ ٱلۡأَرۡضَ بِسَاطًا ۝ لِّتَسۡلُكُواْ مِنۡهَا سُبُلًا فِجَاجًا﴾(۲)

ترجمہ: پھر اسی میں تمہیں لوٹا دے گا اور اسی سے تم کو نکال کھڑا کرے گا اور اللہ ہی نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا تاکہ اس کے بڑے بڑے کشادہ رستوں میں چلو۔

مودودی صاحب اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو توحید کی طرف مائل کرنے کے لیے خود ان کے وجود سے مثال دی اور کہا اللہ وہ ہے جو تمہیں تخلیق کے مختلف مدارج اور اطوار سے گزارتا ہوا تمہیں موجودہ حالت میں لایا ہے۔ پہلے تم اپنے ماں باپ کے صلب میں الگ الگ نطفوں کی شکل میں تھے پھر خدا کی قدرت ہی سے یہ دونوں نطفے ملے اور تمہارا استقرار حمل ہوا پھر نو مہینے تک ماں کے پیٹ میں بتدریج نشوونما دے کر تمہیں پوری انسانی شکل دے دی گئی اور تمہارے اندر وہ تمام قوتیں پیدا کی گئیں جو دنیا میں انسان کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے تمہیں درکار تھیں۔ پھر تمہیں ایک حالت سے دوسری حالت تک ترقی دی جاتی رہی یہاں تک کہ تم جوانی اور کہولت کی عمر کو پہنچے تم ہر وقت خدا کے بس میں تھے وہ چاہتا تم تمہیں استقرار حمل ہی نہ ہونے دیتا اور تمہاری جگہ کسی اور شخص کا اسقرار کرواتا وہ چاہتا تو تمہیں گونگا بہرا اپاہج بنادیتا تمہاری عقل میں فتور رکھ دیتا اس کے ایک اشارے پر کسی وقت میں کسی حادثے کا شکار ہو سکتے تھے جس خدا کے بس میں تم اس قدر بے بس ہو اس پر ایمان کیوں نہ لائے دوسروں کو اس کا شریک کیوں ٹھہراتے ہو، کیا تم نے یہ جان رکھا ہے کہ اس کی شان میں ہر گستاخی کی جاسکتی ہے، ہر بغاوت کی جاسکتی ہے اور ان حرکتوں کا تمہیں کوئی خمیازہ نہیں بھگتنا پڑے گا؟

دوسری آیت مبارکہ میں زمین کے مادوں سے انسان کی پیدائش کو نباتات کے اگنے سے تشبیہ دی ہے کہ جس طرح کسی وقت اس کرے پر نباتات موجود نہیں تھیں پھر اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کو اگایا اسی طرح ایک وقت تھا جب روئے زمین پر انسان کا کوئی وجود نہ تھا پھر اللہ نے اس کی پود لگائی۔(۳)

---

(۱) سورۃ نوح:۷۱/۱۷

(۲) سورۃ نوح:۷۱/۱۸،۱۹،۲۰

(۳) تفہیم القرآن ۶/۱۰۳،۱۰۲

حضرت نوح علیہ السلام اپنے قوم کو دعوت و تبلیغ دیتے ہوئے قوانین فطرت کی طرف متوجہ کرتے ہیں تاکہ دلیل سے ان پر خالق کائنات کی وحدانیت ثابت کریں۔ مبلغ کبھی بھی قوانین فطرت سے ٹکراؤ کی صورت پیدا نہیں کرتا بلکہ اپنی تمام تبلیغی سرگرمیاں بصیرت سے سر انجام دیا ہے فطرت تکوینی قوانین پر مبنی ہوتی ہے لہذا دین کے احکامات کی دعوت ان قوانین کے مطابق دی جانی چاہیے حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو "اللہ کی وحدانیت کی مثال" ان کے وجود سے دیتے ہیں کہ اپنی تخلیق پہ غور کرو اور مودودی صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں انتہائی سادہ اور دلکش اسلوب اختیار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جس اللہ کے سامنے تم اس قدر بے بس ہو اس پر ایمان کیوں نہیں لاتے۔ مودودی صاحب نے آیت مبارکہ کی تفسیر میں خوبصورت داعیانہ اسلوب اختیار کیا ہے۔

استقلال اور استقامت حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا طرہ امتیاز:

دعوت کی کامیابی اور کامرانی کے لیے تحمل برداشت اور استقامت بنیادی شرائط ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی طویل دعوتی جدوجہد سے داعیان توحید کو ایک نیا جذبہ ایک نیا ولولہ ملتا ہے کہ مومن حالات کی ناسازی راستے کی دشواری اور ساتھیوں کی قلت سے کبھی نہیں گھبراتا حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تک تبلیغ حق کا حق ادا کر دیا جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِۦ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا فَأَخَذَهُمُ ٱلطُّوفَانُ وَهُمْ ظَٰلِمُونَ ﴾(۱)

> مودودی فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نو سو پچاس سال کی طویل مدت تک اپنی قوم کو دعوت دیتے رہے یہاں یہ بات اس لیے بیان ہوئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو صبر کی تلقین کی جائے حضرت نوح علیہ السلام کی طویل مدت کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء اپنی چند سال کی تبلیغی سعی و محنت کو نتیجہ خیز ہوتا نہ دیکھ کر بددل نہ ہوں اور حضرت نوح علیہ السلام کے صبر واستقامت کو دیکھیں جنہوں نے مدت ہائے دراز تک نہایت دل شکن حالات میں دعوت حق کی خدمت انجام دی اور ذرا ہمت نہ ہاری۔(۲)

مودودی صاحب سورۃ العنکبوت کی آیت نمبر ۱۴ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد طوفان تک پورے ساڑھے نو سو برس حضرت نوح علیہ السلام نے اس ظالم و گمراہ قوم کی اصلاح کے لیے سعی فرماتے رہے اور اتنی طویل مدت تک ان کی زیادتیاں برداشت کرنے پر بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری یہاں دعوت و تبلیغ کے کام میں حضرت کے صبر

---

(۱) سورۃ العنکبوت:۲۹/ ۱۴

(۲) تفہیم القرآن ۲/ ۴۳

ور ثبات اور استقلال کو بیان کیا جا رہا ہے کہ انہوں نے کتنا طویل عرصہ گمراہ قوم کی ہٹ دھرمیاں برداشت کیں ہیں لیکن راہ حق سے نہ ہٹے۔[1]

یہی صبر واستقامت ہے جو اولوالعزمی کی دلیل ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ ٱلْأُمُورِ﴾[2]

ترجمہ: اور جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے تو یہ بڑے اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔

دعوت دین کا کام کرنے والوں کے لیے دعوتی اسالیب میں سے سب سے اہم اسلوب صبر واستقامت ہے کیونکہ تبلیغ حق کی راہ وہ راہ ہے جس میں قدم قدم پر کانٹوں سے الجھنا پڑتا ہے اور مالی اور جسمانی ہر قسم کی اذیتوں کو برداشت کرنا ہوتا ہے اور جس انسان میں صبر واستقامت نہ ہو وہ اس راہ پر نہیں چل سکتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

آیت مبارکہ کی تفسیر میں حضرت نوح علیہ السلام کے صبر واستقلال کے اسلوب دور حاضر کی دعوتی تحریکوں کے لئے ایک سبق ہے کیونکہ اصلاح کے نام پر اور دعوت کے نام پر اٹھنے والی تحریکیں اٹھتی تو بہت جوش سے ہیں لیکن بعض اوقات لوگوں کی مخالفت وسائل کی کمی کی وجہ سے بہت جلد جھاگ کی طرح بیٹھ جاتیں ہیں انہیں اولوالعزم انبیاء کے اسالیب کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ کسی طرح حضرت نوح علیہ السلام ۹۵۰ سال تک دعوت حق بلند کرتے ہیں اور چند لوگ ان کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اس کے باوجود حضرت نوح علیہ السلام کے صبر واستقلال میں لغزش نہیں آتی غرض داعیان دین کے لئے دعوت دین میں حضرت نوح علیہ السلام اسوہ روشنی کا مینار ہے۔

---

(۱) تفہیم القرآن ۳/ ۶۸۵

(۲) سورۃ الشوریٰ: ۴۲/ ۴۳

فصل سوم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسالیب دعوت تدبر قرآن کی روشنی میں

حضرت ابرہیم علیہ السلام بین الاقوامی دعوت کے علمبردار:

حضرت ابراہیم علیہ السلام بین الاقوامی دعوت کے علمبردار ہیں۔ دنیا کے تین بڑے تبلیغی مذاہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام آپ علیہ السلام کی اولاد سے چلے لہذا اس لیے آپ علیہ السلام کو بین الاقوامی دعوت کا علمبردار کہا جاتا ہے آپ علیہ السلام کا نام قرآن پاک کی ۲۵ سورتوں میں ۶۹ دفعہ آیا ہے۔ (۱)

"ابراہیم / ابراہام یا ابرام عبرانی بائبل کا عظیم جد امجد، عہد نامہ جدید کا جد امجد اور قرآن مجید کا عظیم مقدس پیغمبر بھی ہے۔ ابراہیم یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا مشترکہ جد امجد ہے وہ عرب اسرائیل تنازع کا دھرا ہے وہ مغرب اور اسلامی انتہا پسندی کے درمیان مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ دنیا بھر میں بیس لاکھ یہودیوں، دو ارب عیسائیوں اور ایک ارب مسلمانوں کا باپ ہے (نعوذ باللہ) متعدد صورتوں میں مفروضاتی حیاتیاتی باپ وہ اولین توحید کی تاریخ ہے"۔ (۲)

نام ونسب:

ابراہیم بن تارخ (۲۵۰) بن ناحور (۱۴۸) بن ساروغ () بن راغو (۲۳۹) بن نالغ (۴۳۹) بن عابر (۴۶۴) بن شالح () بن ارفخشد (۴۳۸) بن سام (۶۰۰) بن نوح علیہ السلام

ناموں کے ساتھ ہندسوں میں ان حضرات کی عمریں لکھی ہیں۔ (۳)

آپ علیہ اسلام دسویں بعثت میں حضرت نوح علیہ السلام سے جاملتے ہیں۔

آپ علیہ اسلام کے باپ کے تین بیٹے تھے جن کے نام یہ ہیں:

۱. ابراہیم خلیل اللہ

۲. ناحور

۳. حاران

حضرت لوط علیہ السلام حاران کے بیٹے اور آپ علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ حاران اپنے وطن اُرہی میں باپ کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے تھے اور حضرت لوط علیہ السلام نے آپ علیہ اسلام کی سرپرستی میں ہی پرورش پائی اور آپ علیہ اسلام کے ساتھ ہی زندگی بسر کی۔ (٤)

---

(۱) اطلس قرآن، شوکی ابو فیصل، مترجم حافظ محمد امین، دارالسلام، س۔ن، ص ۶۹

(۲) حضرت ابراہیم، مصنف بروس فیلر، ترجمہ یاسر جواد، حبیب ایجوکیشنل سنٹر، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۰

(۳) قصص الانبیاء، ابن کثیر، عماد الدین الدمشقی، ص ۱۴۹

(۴) حیات انبیاء کا انسائیکلوپیڈیا، امیر علی خان، مشتاق کارنر، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۴۸

کنیت ولقب:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کنیت ابو محمد اور ابو الانبیاء تھی۔[۱]

کیونکہ ان کے بعد آنے والے نبی انہی کی نسل سے مبعوث ہوئے۔

حضرت ابراہیم کا لقب عمود عالم اور آدم ثالث تھا۔[۲]

ان کا لقب خلیل اللہ ہے۔[۳]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام خلیل رکھا گیا اس لیے کہ وہ تمام صفات الہیہ میں سرایت کر گئے تھے۔[٤]

جائے ولادت اور جائے وفات:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت قدیم شہر اُر میں ہوئی جو عراق میں واقع تھا اس کا محل وقوع وہ مقام تھا جو آج کل تل العبید کے نام سے موسوم ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات فلسطین یا موجودہ شام میں ہوئی جس کو پہلے زمانے میں کنعان بھی کہتے تھے۔ وہ مقام جہاں آپ علیہ السلام کا وصال ہوا وہ تورات میں جبرون کے نام سے مذکور ہے آپ علیہ السلام کا مدفن "مکفیلہ کے کھیت کا غار" بتایا گیا ہے جو جبرون کے سامنے واقع تھا۔[٥]

(حلیہ ابراہیم):

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس سے یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ

((حَدَّثَنِي بَيَانُ بْنُ عَمْرٍو حَدَّثَنَا النَّضْرُ أَخْبَرَنَا ابْنُ عَوْنٍ عَنْ مُجَاهِدٍ أَنَّهُ سَمِعَ ابْنَ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا وَذَكَرُوا لَهُ الدَّجَّالَ بَيْنَ عَيْنَيْهِ مَكْتُوبٌ كَافِرٌ أَوْ ك ف ر قَالَ لَمْ أَسْمَعْهُ وَلَكِنَّهُ قَالَ أَمَّا إِبْرَاهِيمُ فَانْظُرُوا إِلَى صَاحِبِكُمْ وَأَمَّا مُوسَى فَجَعْدٌ آدَمُ عَلَى جَمَلٍ أَحْمَرَ مَخْطُومٍ بِخُلْبَةٍ كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَيْهِ انْحَدَرَ فِي الْوَادِي))[٦]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے سامنے لوگ دجال کا ذکر کر رہے تھے کہ اس کی آنکھوں کے درمیان کافر یا ک۔ف۔ر۔ لکھا ہوا ہو گا، انہوں نے کہا، میں نے تو یہ نہیں سنا ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے

---

(۱) رحمۃ للعالمین سیرۃ النبی الامی، محمد سلیمان منصور پوری، الفیصل ناشران تاجران کتب غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، س،ن، ص۱۰٦

(۲) ایضاً

(۳) الاسلام، ابو الفضل محمد احسان اللہ عباسی، نفیس اکیڈمی، بلاسس سٹریٹ، کراچی، س ن، ص۲۰۸

(۴) نصوص الحکم، عبد القدیر صدیقی، ممتاز اکیڈمی، اردو بازار، لاہور، ص۱۲۵

(۵) انبیائے قرآن، محمد جمیل احمد، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، جلد اول، س ن، ص۱٦۸

(٦) صحیح بخاری: باب الانبیاء: حدیث نمبر ۱۵۸۱

یہ سنا ہے اگر حضرت ابراھیم کو دیکھنا ہو تو مجھے دیکھ لو اور حضرت موسی علیہ السلام تو ان کا رنگ گندمی ہے وہ سرخ اونٹ پر سوار ہیں جس کو کھجور کی چھال کی نکیل ڈالی ہوتی ہے گو میں انہیں دیکھ رہا ہوں کہ وہ وادی کی جانب اتر رہے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والدین:

حضرت ابراہیم کے والد تارخ کا لقب "آدار" یا "آزر" تھا "آدار" کالدی یا کلدانی زبان میں بڑے پجاری کو کہتے ہیں اور عبرانی میں یہی نام آزر کہلایا۔ تارخ چونکہ بت تراش اور سب سے بڑا پجاری تھا اس لیے "آزر" کے نام سے مشہور ہو گیا اس لقب نے نام کی جگہ لے لی تھی۔ (۱)

ایک دوسری روایت کے مطابق تارح ان کا باپ اور آزر چچا تھا۔ چونکہ عربی زبان میں باپ اور چچا کے لیے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے اس لیے قرآن نے اسے اب یعنی باپ کہا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد تارح کا ان کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا چچا نے ہی پرورش کی تھی اور چونکہ وہ مندر کے پجاریوں میں سے تھا اس لیے آزار کے لقب سے پکارا جاتا تھا "آزار قدیم کالدی زبان میں بڑے پجاری یا محافظ معبد کو کہا کرتے تھے جس نے بعد میں عربی میں آژر کی شکل اختیار کر لی اس لیے قرآن نے اس کا آزر کے نام سے ذکر کیا ہے۔ (۲)

والدہ کا نام:

اکثر اہل علم حضرات کی روایت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی ماں کا نام ابیونا تھا اور مہ افرایم بن ارغو بن فالح بن عابر بن ارفشد بن نوح علیہ السلام کے سلسلہ نسب میں سے تھیں۔ (۳)

قوم ابراہیم کی مذہبی حالت:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بت پرستی، ستارہ پرستی اور مظاہر پرستی میں بری طرح منہمک تھی کہ خدائے برتر کی قدرت مطلقہ اور اس کی احدیت و صمدیت کا تصور بھی ان کے قلوب میں باقی نہیں رہا تھا اور ان کے لیے خدائے واحد کی وحدانیت کے عقیدے سے زیادہ کوئی اچنبے کی بات نہ تھی۔ شرک کا سب سے بڑا مرکز ان کا اپنا گھر تھا۔ آپ علیہ السلام کے والد آزر بہت بڑے بت فروش و بت گر و بت پرست تھے۔ آپ علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے باپ کو دعوت حق دی اور عذاب خداوندی سے ڈرایا جس کے بدلے میں ان کے باپ نے انہیں سنگسار کرنے کی دھمکی دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ اب

---

(۱) اطلس قرآن: ص ۸۰

(۲) انبیائے قرآن، محمد جمیل احمد، ۱/۱۶۹

(۳) طبقات ابن سعد، محمد بن سعد، مترجم علامہ عبد اللہ السماوی، نفیس اکیڈمی، کراچی، س۔ن، ص ۳۱۲

معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے ایک جانب اگر باپ کے احترام کا مسئلہ ہے تو دوسری جانب ادائے فرض حمایت حق اور اطاعت امر الٰہی کا سوال ہے انہوں نے باپ کی سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا تحقیر و تذلیل کا رویہ نہیں برتا نرمی اور اخلاق کریمی کے ساتھ یہ جواب دیا" اے میرے والد صاحب! اگر میری بات کا یہی جواب ہے تو آج سے میرا تجھ کو سلام، میں خدا کے سچے دین اور پیغام حق کو نہیں چھوڑ سکتا، میں آج سے ہی تجھ سے جدا ہوتا ہوں مگر غائبانہ تیرے لیے بخشش طلب کرتا رہوں گا تاکہ تجھے ہدایت نصیب ہو اور خدا کے عذاب سے نجات پائے۔[1]

قوم کو دعوت اسلام:

باپ اور بیٹے کے درمیان جب اتفاق کی کوئی صورت نہ بنی اور آزر نے کسی طرح ابراہیم علیہ السلام کی رشد و ہدایت کو قبول نہ کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آزر سے جدائی اختیار کر لی اور اپنی دعوت حق اور پیغام رسالت کو وسیع کر دیا اور اب آزر ہی مخاطب نہ رہا بلکہ پوری قوم کو مخاطب بنالیا مگر قوم نے آپ کی ایک نہ سنی اور اپنے باطل معبودوں کی طرح گونگے اندھے بہرے بن گئے کہ ہمارے باپ دادا اپنی کرتے چلے آئے ہیں۔[2]

بت شکنی:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر اور قوم کو بت پرستی سے روکنے کے لیے جب اپنی تمام قوت صرف کر دی تو آپ نے ایک فقیہ تدبیر کی قوم کا مذہبی میلہ ہونے والا تھا۔ جب لوگ اس میں شرکت کے لیے جانے لگے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اصرار کر لیا کہ آپ علیہ السلام بھی ہمارے ساتھ چلیں لیکن آپ علیہ السلام نہ مانے اور آپ نے سوچا کہ وقت آگیا ہے کہ اپنے نظام عمل کی تکمیل کروں اور مشاہدے کی صورت میں جمہور پر واضح کر دیں کہ ان کے دیوتاؤں کی حقیقت کیا ہے؟ چنانچہ علیہ السلام مندر میں گئے اور تمام بتوں کو توڑ ڈالا اور اس سے بڑے بت کے کندھے پر کلہاڑا رکھ کر واپس چلے آئے جب لوگ واپس آئے اور انہوں نے آپ علیہ السلام سے استفسار کیا، آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ سب اس بڑے بت کی کارروائی ہے اس سے دریافت کرو چنانچہ قوم نے آپ کے سامنے انتہائی شرمساری کے ساتھ جواب دیا کہ ان دیوتاؤں میں بولنے کی سکت نہیں ہے یوں آپ علیہ السلام نے ان بتوں کی بے چارگی کا اقرار خود ان سے کروایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس نصیحت و موعظت کا اثر یہ ہونا چاہیے تھا کہ تمام قوم اپنے باطل عقیدے سے تائب ہو کر مسلک حنفی کو اختیار کر لیتی اور کج روی چھوڑ کر راہ مستقیم پر گامزن ہوئی لیکن دلوں کی کجی نفوس کی سرکشی اور مجرمانہ ذہنیت اور باطنی خباثت نے انہیں اس جانب نہ آنے دیا۔[3]

---

(۱) قصص الانبیاء، خواجہ محمد اسلام، مکتبہ الایمان، اردو بازار، لاہور، ص ۶۲

(۲) قصص الانبیاء، ص ۲۶، ۲۷

(۳) قصص الانبیاء، ص ۶۸، ۶۹

بادشاہ کے دربار میں طلبی:

نمرود کو جب آپ علیہ السلام کی پیغمبرانہ تبلیغ و دعوت کی سرگرمیوں کا علم ہوا تو اس کو محسوس ہوا کہ یہ میری ربوبیت ملوکیت اور الوہیت سے بھی رعایا کو برگشتہ کر دے گا اور یوں میری سلطنت کو زوال آجائے گا چنانچہ اس نے آپ کو دربار میں بلایا آپ علیہ السلام نمرود کے دربار میں آ گئے تو آپ علیہ السلام سے نمرود نے سوال کیا کہ تم نے مجھے سجدہ نہیں کیا؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اپنے پروردگار کے علاوہ کسی کو سجدہ نہیں کرتا نمرود نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا کیا تم نے رب کو دیکھا ہے جس کی عبادت تم کرتے ہو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے۔ یہ سن کر نمرود نے دو قیدیوں کو جو سزائے موت پانے والے تھے بلایا ایک کو قتل کر دیا اور ایک کو معاف کر دیا اور کہا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ اس پہ ابراہیم علیہ السلام نے کہا میرا رب تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال جس سے نمرود لا جواب ہو گیا اور آپ علیہ السلام کا جانی دشمن بن گیا چنانچہ اس نے ابراہیم علیہ السلام کو زندہ جلا کر دعوت حق کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا حکم دیا۔[1]

آتش سوزاں اور خلیلِ بت شکن:

حضرت ابراہیم علیہ السلام قافلہ عشاق کے سرخیل اور سردار ہیں۔ چنانچہ آپ علیہ السلام کے لیے ایک بڑا آتش خانہ تیار ہوا نہایت کثیر مقدار میں لکڑیاں جمع کر کے ان میں آگ لگائی گئی اور آپ علیہ السلام کو شعلوں کی نذر کر دیا گیا۔ یہ بڑی سخت آزمائش کا وقت تھا مگر وہ جس کو خود اللہ نے موحد اور اپنا خلیل کہا ہو، اس کے پائے استقلال میں جنبش کسی طرح آسکتی تھی اور خود اللہ کو اپنے خلیل کا بال بیکا ہونا کس طرح گوارا ہو سکتا تھا ادھر دشمنانِ خدا نے محبوبِ خدا کو آگ میں پھینکا۔ ادھر خدا کی بارگاہ سے حکم صادر ہوا:

﴿قُلْنَا يَٰنَارُ كُونِى بَرْدًا وَسَلَٰمًا عَلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ﴾[2]

اے آگ سرد ہو جا اور ابراہیم پر موجب سلامتی (بن جا)۔

اور آتش سوزاں خلیل اللہ کے لیے گلزار بن چکی تھی۔ چالیس روز تک حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں رہے فرمایا کرتے تھے کہ ان دنوں سے زیادہ آرام میں نے اپنی عمر میں نہیں دیکھا۔[3]

---

(۱) علوم القرآن، خورشید عالم گوہر، فائن پبلیکیشنز، چوک اردو بازار، لاہور ۱۹۸۷ء، ص ۵۷۶

(۲) سورۃ الانبیاء: ۲۱/ ۶۹

(۳) انبیائے قرآن، محمد جمیل احمد، ص ۱۹۸،۱۹۸

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہجرت:

حضرت ابراہیم علیہ اسلام سب سے پہلے پیغمبر ہیں جنہوں نے راہ خدا میں یعنی دعوت دین کے لیے اپنا وطن چھوڑ کر ہجرت اختیار کی۔ ہجرت کے وقت ان کی عمر ۷۵ سال تھی۔ (۱)

چنانچہ حکم خدا ہوتے ہی آپ علیہ السلام اپنی زوجہ سارہ، بھتیجے لوط علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی زوجہ ملکاہ کے ہمراہ شمالی شام تشریف لے گئے۔ شام میں جا کر آپ علیہ السلام نے اپنی تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں یہاں تک کہ آپ علیہ السلام کو شام سے فلسطین جانے کا حکم ہوا یہاں پر بھی آپ علیہ السلام نے دعوت و تبلیغ کا کام جاری رکھا۔ کچھ عرصے بعد جب وہاں قحط پڑا تو آپ علیہ السلام کو مصر جانے کا حکم ہوا۔

حضرت ہاجرہ سے شادی:

چونکہ آپ علیہ السلام کی بیوی حضرت سارہ کے ہاں اولاد نہیں تھی اس وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بی بی ہاجرہ سے نکاح کی ترغیب دی اور آپ نے ان کی ترغیب پر حضرت ہاجرہ سے نکاح کیا جن سے آپ کے بیٹے حضرت اسماعیل پیدا ہوئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش:

اللہ تعالی نے پنے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہت سی آزمائشوں سے گزارا اور آپ علیہ السلام آزمائش کی ہر گھڑی میں ثابت قدم رہے۔ بہر حال جب ہاجرہ کے ہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو اس سے سارہ کے جذبات برانگیختہ ہو گئے انہوں نے حضرت خلیل علیہ السلام سے مطالبہ کیا انہیں ان کے سامنے نہ رکھا جائے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے کو لے کر چلے حتی کہ انہیں شہر مکہ میں جا ٹھہرایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکہ معظمہ کی وادی جو پہاڑوں میں گھری ہوئی تھی اور جس میں کسی آبادی کا نشان نہ تھا اکیلے چھوڑ دینا بھی دعوت کی خاطر ایک قربانی تھی۔ (۲)

حضرت اسماعیل علیہ السلام اس وقت دودھ پیتے تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام جب انہیں وہاں چھوڑ کر پلٹے تو حضرت ہاجرہ نے ان کا دامن پکڑ لیا اور بولیں ابراہیم علیہ السلام آپ ہمیں اس جگہ چھوڑ کر جا رہے ہیں ہمارے پاس تو ضرورت کی اشیاء بھی نہیں ہیں مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کوئی جواب نہ دیا جس پر حضرت ہاجرہ نے کہا کیا اللہ نے آپ علیہ السلام کو یہ حکم دیا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا "ہاں" تب انہوں نے کہا: اگر یہ بات ہے تو اللہ ہمیں ہلاک نہیں ہونے دے گا"۔ (۳)

---

(۱) ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام، عباس محمود العقاد المصری، نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۸۶ء، ص ۶۷

(۲) قرآنی فیصلے، غلام احمد پرویز، ادارہ طلوع اسلام، گلبرگ، لاہور، نومبر ۱۹۷۹ء، ص ۱۵۳

(۳) قصص الانبیاء، امام ابو الفداء ابن کثیر الدمشقی، ص ۱۷۷

چاہ زم زم کا ظہور:

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام چلے گئے اور آفتاب کی گرمی سر پر پہنچی تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کو پیاس کی شدت محسوس ہوئی حضرت ہاجرہ کوہ صفا و مروہ کی طرف دوڑیں وہاں پانی کہیں نظر نہ آیا اس طرح پانی کے لیے حضرت ہاجرہ نے سات چکر لگائے۔ چنانچہ حاجیوں پر قیامت تک سنت ہاجرہ جاری رہے گی۔ حضرت ہاجرہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اس میدان میں جس جگہ چاہ زم زم ہے لٹا کر صفا و مروہ پر دوڑیں اور پانی نہ پا کر پریشانی میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرف دیکھ کر حیران ہو گئیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام شدت پیاس سے جس زمین پر ایڑیاں رگڑ رہے تھے اس جگہ بحکم خداوند قدوس پانی کا فوارہ جاری ہوا چنانچہ حضرت ہاجرہ نے خود بھی سیر ہو کر پیا اور بچے کو بھی پلایا۔ اتفاقاً وہاں سے ایک قبیلہ بنی جرہم کے لوگوں کا گزر ہوا اور انہوں نے آپ علیہ السلام سے وہاں رہنے کی اجازت طلب کی یوں وہ زمین آباد ہوئی۔(۱)

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا مطالبہ:

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایک اور آزمائش اتاری اور انہیں بڑھاپے میں عطا ہونے والے اکلوتے بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا حکم آیا۔ آپ علیہ السلام نے یہ حکم بیٹے کو بتایا تو فرمانبردار بیٹے نے سر تسلیم خم کر دیا۔ باپ چھری ہاتھ میں لیے حلقوم پسر کی طرف بڑھا اور بیٹا خود سپردگی کے عالم میں اللہ تعالیٰ کی رضا پر قربان ہونے کے لیے بہ دل و جان آمادہ و تیار ہو گیا چنانچہ چشم فلک نے زیر آسمان وہ عجیب و غریب منظر دیکھا کہ جس کی تاریخ عالم میں مثال نہیں ملتی(۲)۔ بقول اقبال(۳)

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی(۴)

اللہ رب العزت کو اپنے خاص بندوں کی ادا اتنی پسند آئی کہ اس واقعے کو ذبح عظیم قرار دے کر ہر سال اس کی یاد کی تجدید کا حکم امت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے شریعت مطہرہ کا حصہ بنا دیا جس کا اتباع سنت ابراہیمی علیہ السلام کے طور پر واجب قرار پایا۔(۵)

---

(۱) قصص الانبیاء، سید سعید علی شاہ، شبیر برادرز، اردو بازار، لاہور جون ۱۹۸۸ء، ص: ۸۲،۸۷

(۲) ایضاً

(۳) علامہ اقبال ہمارے قومی شاعر ہیں۔ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے۔ آپ نے پاکستان کا تصور پیش کیا۔ آپ کی مشہور تصانیف بالِ جبرائیل، بانگ درا، ضرب کلیم، پیام مشرق، ارمغانِ حجاز وغیرہ ہیں۔ آپ نے ۱۹۳۸ء میں وفات پائی۔ (علم التعلیم، سخی محمد، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۲۱۷

(۴) بالِ جبرائیل، علامہ محمد اقبال، ایم سی گراہال بک کمپنی ۱۹۷۷ء، ص ۱۷۰

(۵) فلسفہ حج، محمد طاہر القادری، ادارہ منہاج القرآن، لاہور، ص ۳۳

کہ حضرت اسماعیل کی جگہ اللہ تعالی نے جنت سے مینڈھا بھیجا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی قبول ہوئی۔ یہ وہ اصل امتحانات تھے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام پاس ہو گئے۔ اللہ تعالی نے ان امتحانات کے ذریعے ابراہیم علیہ السلام کو آزمالیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام آزمائشوں میں کامیاب ہوئے اور خدا نے انسانوں کی رہبری کا مقام امامت بخشا۔[1]

تعمیر بیت اللہ:

اللہ تعالی نے حضرت ہاجرہ کو دو عظیم الشان نعمتیں کر رکھی تھیں انہیں دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی تھیں اس کا خاوند اللہ رحمان کا خلیل تھا اور اس کا بیٹا اپنے باپ کی ہو بہو تصویر تھا جس کے چہرے پر روحانی چمک تھی۔ اللہ تعالی نے اسے یہ حکم دیا کہ وہ اللہ کے لیے ایسا گھر تعمیر کریں کہ لوگ دور دور سے آکر اس کا حج کریں بیت اللہ جس جگہ پر تعمیر ہوا، وہ جگہ بھی اللہ تعالی نے ان کو سمجھائی چنانچہ آپ علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ علیہا السلام سے فرمایا "اے ہاجرہ تم خوش ہو جاؤ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس کا گھر بناؤں اور اس نے مجھے حکم دیا کہ اسماعیل اس کام میں میری مدد کریں" حضرت ہاجرہ نے یہ سن کر اللہ تعالی کے حضور سجدہ شکر ادا کیا کہ اس نے اس کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کے اس گھر کی تعمیر کے لیے چن لیا ہے جو لوگوں کے لیے قیام اور امن کا باعث بنے گا ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ اسلام بیت اللہ کی تعمیر کرنے لگے بسا اوقات حضرت ہاجرہ بھی ان کا ہاتھ بٹاتی دونوں باپ بیٹا کا سر اس فخر سے بلند ہوا کہ اللہ تعالی نے انہیں اپنے گھر کی تعمیر کا شرف عطا کیا ہے۔

روئے زمین پر یہ پہلا گھر تھا جو خالص خدا کی عبادت کے لیے بنایا گیا۔[2]

دونوں نے مل کر پہلے بنیادیں کھودیں۔ بنیادیں کھودتے وقت دونوں اپنے رب کو پکارتے رہے قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَٰهِـۧمُ ٱلْقَوَاعِدَ مِنَ ٱلْبَيْتِ وَإِسْمَـٰعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ۖ إِنَّكَ أَنتَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْعَلِيمُ ۝ رَبَّنَا وَٱجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ ۖ إِنَّكَ أَنتَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ۝ رَبَّنَا وَٱبْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا۟ عَلَيْهِمْ ءَايَـٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلْكِتَـٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ ٱلْعَزِيزُ ٱلْحَكِيمُ﴾[3]

---

(۱) تمدن انسانی پر انبیاء علیہم السلام کے اثرات، فخر الدین مجازی، مقبول اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۱ء، ص ۹۷، ۹۸

(۲) تاریخ اسلام، شاہ معین الدین ندوی، گلفراز احمد پبلشرز، لاہور، اپریل ۲۰۰۳ء، ص ۲۷

(۳) سورۃ البقرۃ: ۲/ ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹

ترجمہ: جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے تو دونوں نے التجا کی اے ہمارے رب ہمیں اپنا مطیع اور فرمانبردار بنا دے اور ہماری اولاد میں سے ایک ایسی امت پیدا کر دے جو تیری فرمانبردار ہو اور ہمیں عبادت کے طریقے سکھلائے اور ہمارے قصور معاف کریں ہماری توبہ قبول کر لے بے شک تو توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے اے ہمارے رب ان میں سے ایک رسول بھیج جو انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور انہیں پاک کرے بے شک تو غالب حکمتوں والا ہے۔

یہ دعائے خلیل بالآخر مکہ میں خاتم الانبیاء کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی گویا:

ہوئے پہلو آمنہ سے ہویدار
دعائے خلیل اور نوید مسیحا[1]

کعبہ کی تعمیر مکمل ہوئی ابراہیم علیہ السلام اور ہاجرہ علیہا السلام اور ان کے ساتھ دیگر مسلمان طواف کرنے والوں کے لیے قیام کرنے والوں کے لیے اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے لیے بیت اللہ کو صاف کرنے لگے۔[2]

جب ابراہیم علیہ السلام کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو جبرائیل علیہ السلام ان کے پاس آئے اور انہیں حکم دیا کہ وہ اور اسماعیل علیہ السلام کعبہ کا سات بار طواف کریں چنانچہ دونوں نے مل کر طواف کیا اور مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعتیں ادا کیں پھر جبرئیل علیہ السلام کی راہنمائی میں تمام مناسک حج ادا کیے۔ پھر آپ علیہ السلام کو حکم ہوا:

﴿وَأَذِّن فِي ٱلنَّاسِ بِٱلۡحَجِّ يَأۡتُوكَ رِجَالٗا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٖ يَأۡتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٖ﴾[3]

ترجمہ: لوگوں کو حج کے لیے پکار وہ تیرے پاس پاپیدہ بھی آئیں گے سواریوں پر بھی اور یہ سواریاں ہر تنگ گھاٹی کو عبور کر کے آئیں گی۔

جب ابراہیم علیہ السلام کو حج کے لیے عام منادی کرانے کا حکم ملا تو انہوں نے رب سے کہا،

"یا رب وما یبلغ صوتی قال أذن و علی ابلاغ منادی"[4]

(۱) دیوانِ حالی، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، الناظر پریس، کراچی ۱۹۷۷ء، ص ۲۳۱
(۲) نساء الانبیاء، احمد خلیل جمعہ، نعمان کتب خانہ، بازار، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۳۱۳
(۳) سورۃ الحج ۲۲/ ۲۷
(۴) قصص الانبیاء، ص ۱۲۱

ترجمہ: یارب میری آواز ان سارے لوگوں تک کیسے پہنچے گی، ارشاد ہوا تمہارے ذمے منادی کرانا ہے اور پہنچانا میرا کام ہے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے منادی کی اے لوگو! تمہارے اوپر اس گھر کا حج فرض کیا گیا ہے آپ کی یہ آواز زمین و آسمان کے درمیان سب نے سنی کیا تم دیکھتے نہیں کہ لوگ تلبیہ کرتے ہوئے دور دراز علاقوں سے اس گھر کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔

لہٰذا حکم ملا تم پکارو پہنچانا ہمارا کام ہے۔ ابراہیم علیہ السلام جبل ابو قبیس پر چڑھ گئے اور ندا کی

اے لوگو! بیت عتیق کا حج تم پر فرض کر دیا گیا ہے۔

اور ان کی یہ ندا حجاز کے گوشے گوشے تک پہنچ گئی ہر طرف حج کرنے والوں کے قافلے آنے لگے

جس دن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں میں حج کا اعلان کیا تو ان کی بیوی ہاجرہ وہ پہلی خاتون تھیں جنہوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور انبیاء کی بیویوں کی فہرست میں تاریخی اعتبار سے وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے یہ آواز سنی اور اس پر عمل پیرا ہونے کی سعادت حاصل کی۔ (۱)

الغرض حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی اس طرح گزری کہ وہ اپنے رب کے دربار میں قلب سلیم لیے حاضر ہیں اور جو حکم ملتا ہے اور جو اشارہ ہوتا ہے اسے پامردی کے ساتھ پورے اخلاص کے ساتھ بجالاتے ہیں۔ (۲)

عظیم اولوالعزم نبی:

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالی کے وہ عظیم اولوالعزم پیغمبر ہیں آپ کی تقدیس و عزت کا یہ عالم ہے کہ دنیا کہ تین سب سے بڑے اور تبلیغی مذاہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام آپ علیہ السلام کو اللہ تعالی کا عظیم اور اولوالعزم پیغمبر مانتے ہیں کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد آنے والے سارے انبیاء حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت موسی علیہ السلام، حضرب عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سب کے سب ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اس لیے آپ علیہ السلام کو ابو الانبیاء کہا جاتا ہے۔

یہود و نصاری اور مسلمان بالاتفاق آپ علیہ السلام کو نبی مانتے اور آپ علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں اور ان تینوں مذاہب میں دعوت و تبلیغ کا کام ہر آن جاری رہتا ہے لہٰذا آپ علیہ السلام بین الاقوامی دعوت کے علمبردار ہیں۔

جہاں تک آپ علیہ السلام کی شخصیت کا تعلق ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دنیا میں کوئی دوسری شخصیت اس قدر پر عظمت اور مستقبل پر گہرا اثر ڈالنے والی نہیں گزری۔

---

(۱) نساء الانبیاء، احمد خلیل جمعہ، ص ۳۱۴، ۳۱۵

(۲) لطائف قرآنی، سید مظفر احمد اشرف، اکادمی بازیافت، مارچ ۲۰۰۵ء، ص ۶۷

It is no longer a amter of arguments that behind the biblical Abraham an eminent historical personality is manifest a prophetic leader equal in stature to Muhammad. As the prophet os Islam.Das Alte Testament p.289(1)

ترجمہ: اب یہ بات دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ تورات کے مذکورہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پردہ میں ایک زبردست تاریخی شخصیت جلوہ فرما ہے ایک پیغمبرانہ ہادی جو اپنی عظمت میں اتنا ہی بلند معلوم ہوتا ہے جتنے کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (عہد نامہ قدیم)

دعوت و تبلیغ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے غور و فکر سے پہلے خود توحید کو جانا اور پھر اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس توحید کی شمع کو اپنے خون جگر سے سینچا دعوت و تبلیغ کے ہر مرحلے پر آپ علیہ السلام کو بے شمار آزمائشوں سے گزرنا پڑا لیکن کوئی آزمائش اللہ عزوجل کے خلیل کے پایہ استقلال میں لغزش نہ لا سکی جب نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں زندہ پھینکا تو اللہ کا حکم سے آگ سرد اور گئی حضرت ابراہیم علیہ السلام صحیح سلامت رہے یہ دیکھ کر اکثر لوگوں نے اسلام قبول کیا جن کی امداد سے آپ علیہ السلام کو اسلام کی تبلیغ کرنے میں کچھ سہولتیں حاصل ہوئی آپ علیہ السلام عراق سے شام اور شام سے تبلیغ اسلام کرتے ہوئے مصر پہنچے غرض یہ کہ شہر شہر قریہ قریہ آپ علیہ السلام تبلیغ اسلام کا کام کرتے پھرتے تھے۔(۲)

دعوت و تبلیغ کے عالمگیر مرکز "کعبہ" کے بانی اعظم:

دعوت و تبلیغ کا عالمگیر مرکز خانہ خدا یعنی کعبۃ اللہ ہے اس مقدس گھر کی بنیادوں میں خلیل اللہ اور ذبیح اللہ کا خون جگر شامل ہے کعبہ وہ تعمیر ہے جس کی بنیاد موحد اعظم نے صدق واخلاص پر رکھی اس مقدس گھر کی تعمیر اور اس کی آبادکاری نصرت خداوندی کا عملی نمونہ ہے جو رہتی دنیا تک مینار نور بنی رہے گی اس مقام کو عالمگیر دعوت و تبلیغ اسلام کے مرکز اور نقطہ آغاز کے طور پر منتخب کر لیا گیا اور جس دین حنفی کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دست مبارک سے سرزمین کعبہ میں ڈالی گئی اس دین الہی کی تکمیل حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ سے اپنے کمال کی انتہا کو پہنچی گویا وہ بیج جو خلیل اللہ نے ارض بطحا میں بویا تھا وہ کئی صدیوں بعد دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک شجر سایہ دار کی صورت میں چار دانگ عالم پر سایہ فگن ہو گیا۔

---

(۱) انبیائے قرآن، محمد جمیل احمد، ص ۲۳۱

(۲) روح العبادات، راشد علی مخدومی، بارہ نیکی اودہ، ص ۱۹۱

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسالیب دعوت تدبر قرآن کی روشنی میں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ملکوت الٰہی میں تفکر تمام علوم کی کلید:

مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام زمین و آسمان کے نظام پر غور کرتے تھے اور اللہ تعالی نے اپنی توفیق بخشی سے ان پر اپنی معرفت کے وہ اسرار و حقائق کھولے جو انہوں نے اپنے باپ اور پھر اپنی قوم پر واضح کیے اور اسی ملکوت پر غور کرنے سے وہ کلید ہاتھ آئی ہے جس سے فکر و عمل کے صحیح دروازے کھلتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کائنات میں غور و فکر اور تدبر کو قرآن نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ ٱلَّيْلُ رَءَا كَوْكَبًا قَالَ هَٰذَا رَبِّى فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَآ أُحِبُّ ٱلْءَافِلِينَ﴾[1]

ترجمہ: پس یوں ہوا کہ جب رات نے اس کو ڈھانک لیا تو اس نے ایک تارے کو دیکھا بولا کہ یہ میرا رب ہے پھر جب وہ ڈوب گیا تو اس نے کہا میں ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ کس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم پر واضح کیا کہ وہ اس کائنات کی جن چیزوں کو معبود سمجھ کر ان کی پرستش کر رہی ہے وہ ساری چیزیں خود اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہیں کہ وہ ملکوت الٰہی کے تابع اور اس کے احکام و قوانین کے تحت مسخر ہیں مجال نہیں کہ سر مو ادھر ادھر ان سے تجاوز کر سکیں اس وجہ سے عبادت کا اصلی مستحق وہ ہے جو ان سب کا خالق و فاطر ہے نہ کہ یہ جو محکوم ہیں۔

انبیاء علیہم السلام اپنی دعوت اور اپنے مقاصد کے اعتبار سے تو بالکل یک رنگ و ہم رنگ ہوتے ہیں لیکن اپنے مخاطبوں کے مزاج ان کی افتاد طبع اور ان کے ذوق کے اختلاف کے سبب سے ہر نبی کے طرز خطاب اور طریقہ استدلال و بحث میں امتیازی خصوصیات پائی جاتی ہیں بعض انبیاء کی دعوت میں موعظت کا رنگ غالب ہے ہاں بعض کے ہاں قانون کا انداز نمایاں ہے جیسے حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسی علیہ السلام زیادہ تر تمثیلوں میں بات کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم حجت طراز اور مناظرہ باز تھی جس کی وجہ سے حضرت کے بحث و خطاب میں استدراج کا طریقہ نمایاں ہے۔[2]

حجت ابراہیمی کی وضاحت:

ایک دن انہوں نے ایک چمکتے ہوئے ستارے کو دیکھا (ہو سکتا ہے کہ یہ ستارہ زہرہ ہو جس کو ان کی قوم پوجتی تھی یا کوئی اور ستارہ ہو) تو بولے کہ "ہاں بھائی یہ میرا رب ہے" قرینہ صاف بتا رہا ہے کہ یہ بات انہوں نے خود اپنے آپ کو مخاطب کر کے اس طرح فرمائی ہو گی کہ دوسروں کے کان میں بھی پڑ جائے سننے والوں نے جب ان کی زبان سے یہ بات سنی ہو گی تو انہوں

---

(۱) سورۃ انعام: ۶/ ۷۶

(۲) تدبر قرآن ۳/ ۹۳، ۹۴

نے اطمینان کا سانس لیا ہو گا کہ چلو یہ بھی غنیمت ہے ایک ایسا شخص جو باپ دادا کے دین اور ہمارے معبودوں سے بالکل بیزار ہے جس حد تک بھی ہمارے ساتھ موافقت کر رہا ہے اسی پر قناعت کرو اور زیادہ اس کے درپے نہ ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ بات لوگوں کے کانوں میں ڈال کر خاموش ہو رہے پھر جب ستارہ ڈوب گیا تو انہوں نے بالکل اسی انداز میں اپنے مخاطب اور دوسروں کو سناتے ہوئے کہا کہ میں ان ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا آس پاس والوں کا سابقہ اطمینان تو ان کی یہ بات سن کر رخصت ہو گیا ہو گا لیکن وہ اس سوچ میں ضرور پڑ گئے ہوں گے کہ اس نوجوان کا ہمارے معبودوں سے انحراف محض نوجوانی کی ترنگ اور بے لاگ خواہش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کی سوچ نے اس عقیدے کو متزلزل کر دیا ہے چونکہ بات ان کو براہ راست مخاطب کر کے نہیں کی گئی تھی اس وجہ سے وہ زیادہ مشتعل بھی نہیں ہوئے ہوں گے بلکہ وہ اس فکر میں پڑ گئے ہوں گے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہماری بات ہی میں کوئی کمزوری ہے۔ کسی جمود کا اس حد تک ہل جانا بھی ایک بڑی کامیابی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس طرح اپنی قوم کی توجہ اس حقیقت کی طرف دلائی کہ ان ستاروں کا طلوع ہونا اور چمکنا ہی کیوں دیکھتے ہو ان کا ڈوب جانا کیوں نہیں دیکھتے گویا یہ خود زبان حال سے بتا رہے ہیں کہ ہم آئے نہیں بلکہ لائے گئے ہیں اور جاتے نہیں بلکہ لے جائے جاتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے کانوں میں یہ بات ڈال دی کہ خالق ومالک کے ساتھ بندے کا تعلق محبت کی بنیاد پر ہے نہ کہ مجرد خوف کی بنیاد پر، مجرد خوف ایسی چیز نہیں کہ جس کی بنیاد پر حق عبادت قائم ہو۔ مشرکین کے لیے یہ نئی بات تھی کیونکہ ان کے شرک کی بنیاد ہی خوف پر ہے۔

﴿ فَلَمَّا رَءَا ٱلْقَمَرَ بَازِغًا ﴾ اسی طرح کسی دن پورے چاند کی پھیلی ہوئی چاندنی میں انہوں نے پھر اس تعلیم کے لیے مواقع پیدا کر لیے اور بالکل اسی لب ولہجہ اور اسی انداز میں چاند کے متعلق بھی وہی بات کی جو پہلے ستارے کے بارے میں کہی تھی پھر جب وہ ڈوب گیا تو انہوں نے اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوے اور لوگوں کو سناتے ہوئے کہا "لوگو! میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا"۔ غور کریں یہاں تعلیم کا قدم پہلے کی نسبت آگے ہے کہ ڈوبنے والوں کو معبود بنانا کھلی ہوئی ضلالت ہے اور یہ کہ ہدایت کا سرچشمہ صرف خدا ہے وہ ہدایت نہ بخشے تو انسان ہر چمکتی چیز کو سونا جانتا ہے یا ساری باتیں آپ نے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہیں اور سننے والوں میں سے جس کے کان میں پڑی ہوں گی اس کے لیے ان سے چڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ بلکہ جس کے اندر کچھ بھی غور وفکر کی صلاحیت رہی ہو گی وہ اس سوچ میں پڑ گیا ہو گا کہ یہ ایک شخص ہے جو طلب ہدایت میں اس طرح بے قرار ہے اور ایک ہم ہیں کہ پتھر کی طرح اپنی جگہ سے کھسکنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو بات فرمائی کہ اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں گرے ہوئے

لوگوں میں سے ہو جاؤں گا انہوں نے اپنی فطرت سلیمہ کا آئینہ دوسروں کے سامنے رکھا ہے کہ وہ لوگ اس آئینے میں اپنے منہ دیکھیں لیکن بس آئینہ رکھا ہے خود ان کو مخاطب کر کے کچھ نہیں کہا کہ وہ وحشت زدہ اور بدگمان نہ ہو۔[۱]

ان آیات مبارکہ کی تفسیر میں مولانا امین احسن اصلاحی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طرز استدلال کی خوبیوں کو بیان کیا ہے کہ کس طرح انہوں نے دعوت تبلیغ میں اپنی ذات کو مخاطب کر کے دوسروں کو ااصلاح پر آمادہ کیا ہے اور ان کے دل دماغ کے دریچوں کو کھولا ہے تاکہ وہ حق کو جان اور سمجھ سکے۔

آیت مبارکہ کی تفسیر اس انداز میں کی گئی ہے کہ موجودہ دور کے قاری کو بھی بیدار کرتی ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ کے دریچے کھولے تاکہ وہ حق کو جان اور سمجھ سکے۔ غور و فکر بنی نوع انسان کو خالق کائنات کے قریب کر دیتا ہے اور یہی وہ اسلوب ہے جو عالمگیر دعوت کے بانی نے اختیار کیا۔

حضرت ابراہیمؑ کا مشرکین سے اعلان برأت اور توحید کا اقرار:

حضرت ابراہیم علیہ السلام مظاہرِ فطرت کے گہرے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سب ختم ہونے والی اور فانی چیزیں ہیں لہذا یہ رب نہیں ہو سکتیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مظاہر فطرت کے دوران جو کچھ فرمایا اس کی نوعیت خود اپنے اوپر اثرات کے اظہار کی تھی۔ اگرچہ اس سے بالواسطہ قوم کی عقل اور ضمیر کو بیدار کرنا تھا لیکن قوم کو براہ راست مخاطب نہیں فرمایا تھا اب انہوں نے ان کو براہ راست مخاطب کر کے ان کے دین اور ان کے معبودوں سے اپنی برات کا اعلان کرتا ہوں۔

﴿ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا ۖ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴾[۲]

ترجمہ: میں نے تو اپنا رخ بالکل یکسو ہو کر اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں تو مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

مولانا امین احسن فرماتے ہیں کہ ان آیات مبارکہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بتوں کی پوجا سے اعلان برات بھی ہے جیسا کہ آیت مبارکہ میں ہے:

﴿ يَا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ﴾[۳]

ترجمہ: اے میری قوم کے لوگو! تم جن چیزوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے اپنے آپ کو بری کرتا ہوں۔

---

(۱) تدبر قرآن ۳/۹۲، ۹۴

(۲) سورۃ الانعام: ۶/۷۹

(۳) ایضاً: ۶/۷۸

مولانا امین احسن فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام معبودان باطل سے کٹ کر اور بالکل یکسو ہو کر اپنا رخ اس رب کی طرف کر لیا جو تمام آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ للذی کا "ل" اس بات پر دلیل ہے کہ وجہت کا لفظ اسلمت کے مضمون پر مشتمل ہے یعنی میں نے اپنے آپ کو آسمان اور زمین کے خالق و مالک کے حوالہ کر دیا۔ یہ توحید اور اسلام کی عظیم آیت اور ملت ابراہیمی کا کلمہ جامع ہے اور چونکہ ہم اپنی نمازوں میں اسی حقیقت کا اظہار واعتراف کرتے ہیں۔ (۱)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اعلان توحید سے پہلے اپنی قوم پر ان کے معبودوں سورج، چاند، ستارے کی حقیقت واضح کی کہ یہ ڈوب جانے والے غائب ہو جانے والے ہیں۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے اپنی قوم کے حالات اور ذہنی سطح کو مد نظر رکھتے ہوئے بتدریج ان کے بتوں کی بے بسی واضح کی اور پھر اپنا اعلان توحید کر دیا اس بارے میں جناب فتح اللہ گولن (۲) لکھتے ہیں

"حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے ہر فرد پر لا الہ الا اللہ کی حقیقت آشکار کرنے کے لیے اپنی فراست سے یہ طریقہ اختیار کر لیا یہ انداز گفتگو مکمل طور پر قرآنی انداز گفتگو سے ہم آہنگ ہے کیونکہ دونوں کا سہارا و چشمہ ایک ہے اور دونوں ایک ہی حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں"۔ (۳)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کلمہ حق مشرک باپ کے سامنے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے مشرک باپ کے سامنے اس طرح کلمہ حق بلند کیا۔ قرآن پاک اس حقیقت کو بیان کرتا ہے:

---

(۱) تدبر قرآن ۳/ ۹۶،۹۷

(۲) فتح اللہ گولن: ۲۷ اپریل ۱۹۴۱ء کو پیدا ہوئے۔ ترک مبلغ اور مصنف ہیں۔ آپ نے دعوت و تبلیغ کے کام کا آغاز ازمیر کی جامع مسجد کستانہ بازاری سے کیا۔ ۱۹۹۰ء میں تعصب سے پاک افہام و تفہیم کی بنا پر ایک قائدانہ مبلغانہ تحریک "گولن تحریک" کا آغاز کیا۔ آپ کی تحریر کردہ کتابوں کی تعداد ۶۰ سے زیادہ ہے۔ جن میں تخلیق کی حقیقت، المیزان، چراغ راہ، تقدیر کتاب و سنت کی روشنی وغیرہ ہیں۔ ۲۰۱۳ء تک ترک صدر طیب اردگان کے زبردست اتحادی تھے۔ تاہم ۲۰۱۳ء کے بعد یہ اتحاد ختم ہو گیا۔ Eng. (http.//en.fgulen.com)

(۳) نور سرمدی فخر انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، محمد فتح اللہ گولن، ہارمنی پبلشرز، ایف ایٹ، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۲۵۷

﴿ إِذۡ قَالَ لِأَبِيهِ يَٰٓأَبَتِ لِمَ تَعۡبُدُ مَا لَا يَسۡمَعُ وَلَا يُبۡصِرُ وَلَا يُغۡنِي عَنكَ شَيۡـٔٗا ٥ يَٰٓأَبَتِ إِنِّي قَدۡ جَآءَنِي مِنَ ٱلۡعِلۡمِ مَا لَمۡ يَأۡتِكَ فَٱتَّبِعۡنِيٓ أَهۡدِكَ صِرَٰطٗا سَوِيّٗا ٥ يَٰٓأَبَتِ لَا تَعۡبُدِ ٱلشَّيۡطَٰنَۖ إِنَّ ٱلشَّيۡطَٰنَ كَانَ لِلرَّحۡمَٰنِ عَصِيّٗا ٥ يَٰٓأَبَتِ إِنِّيٓ أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٞ مِّنَ ٱلرَّحۡمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيۡطَٰنِ وَلِيّٗا ﴾(١)

ترجمہ: اس نے اپنے باپ سے کہا اے میرے باپ! آپ ایسی چیزوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں اور نہ دیکھتی ہیں اور نہ وہ کچھ آپ کے کام آنے والی ہیں۔ اے میرے باپ! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا تو آپ میری پیروی کریں میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ! آپ شیطان کی پرستش نہ کیجیے شیطان خدائے رحمن کا بڑا ہی نافرمان ہے۔ اے میرے باپ! مجھے ڈر ہے کہ آپ کو خدائے رحمن کا کوئی عذاب آ پکڑے اور شیطان کے ساتھی بن کے رہ جائیں۔

تدبر قرآن میں مولانا امین احسن صاحب اس باپ بیٹے کے درمیان ہونے والی گفتگو حق کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے باپ کی توجہ اس حقیقت کی طرف دلائی کہ آخر اپنے ہاتھوں کی گھڑی ہوئی ان پتھر کی مورتوں کو معبود مان کر پوجا کرنے کی کیا تک ہے کسی کو معبود بنالینا کوئی شوق اور تفریح کی چیز نہیں ہے اس کا تعلق تو انسان کی سب سے بڑی احتیاج سے ہے، انسان خدا کو اس لیے مانتا اور اس کی عبادت کرتا ہے کہ وہ اس کی دعا اور فریاد کو سنتا ہے اس کے دکھ درد کو دیکھتا اور اس کی ہر مشکل میں اس کی دست گیری کرتا ہے آخر یہ آپ کے اپنے ہی ہاتھوں کی گھڑی ہوئی مورتیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں۔ یہ آپ کے کس کام آسکتی ہیں کس مرض کی دوا ہیں جو آپ ان کے آگے جھکتے ہیں یہ گویا شرک کے بدیہی ہونے کی دلیل ہے کہ اس کے باطن سے قطع نظر اس کا ظاہر باطل شہادت دیتا ہے کہ یہ کھلی ہوئی سفاکیت اور عقل و فطرت سے بلکل بے جوڑ چیز ہے۔

دوسری بات یہ واضح فرمائی کہ خدا کے معاملے میں یہ طے کرنا کہ اس کا کوئی شریک ہے یا نہیں؟ اور ہے تو کون ہے؟ یہ مجرد ظن و گمان رکھنے والی چیز نہیں ہے۔ آدمی ایک خدا کو اس لیے مانتا ہے کہ فطرت اور عقل و آفات اور نفس کے اندر اس کی شہادت موجود ہے۔ اور ہر انسان جس کی فطرت سلیم ہو اس کے ماننے پر مضطر ہے لیکن دوسروں کو ماننے کے لیے کیا مجبوری ہے کہ خواہ مخواہ ان کو بھی شریک خدا بنا کر اپنا سر لادلے اس معاملے میں اعتماد کی چیز "العلم" یعنی وہ علم حقیقی ہے جو خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے آتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو دعوت دی کہ وہ ایسے معاملے میں مجرد وہم کی پیروی

---

(۱) سورۃ مریم: ۱۹/ ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵

نہ کریں۔ بلکہ ان کی پیروی کریں کیونکہ وہ ان کے سامنے اس علم حقیقی کو پیش کر رہے ہیں جو خدا کی طرف سے ان کے پاس آیا ہے اس علم سے اس راہ کی طرف رہنمائی ہو گی جو خدا تک پہنچانے والی سیدھی راہ ہے۔ "سیدھی راہ" یعنی یہ راہ بندے کو ہر واسطے اور ہر وسیلہ سے بے نیاز کر کے براہ راست خدا تک لے جانے والی ہے اور یہ راہ توحید کی راہ ہے۔

تیسری حقیقت یہ واضح فرمائی کہ شیطان کو سب سے زیاد ضد و کد اور قصہ آدم علیہ السلام اور ابلیس سے واضح ہے۔ کہ توحید کی صراط مستقیم سے ہی ہے۔ اس نے یہ قسم کھار کھی کہ وہ ذریت آدم کو اس صراط مستقیم سے برگشتہ کرنے کے لیے پورا زور لگا دے گا اور شرک میں مبتلا کر کے چھوڑے گا۔ خدائے رحمان کے ایسے کھلے ہوئے باغی کی ایسی وفادارانہ اطاعت در حقیقت اس کی عبادت ہے اور بد قسمت ہے وہ انسان جو خدا کو چھوڑ کر شیطان کی عبادت کرے۔

چوتھی حقیقت یہ واضح فرمائی کہ اب تک تو آپ کے لیے ایک عذر رکھا تھا کہ خدا کی ہدایت آپ کو نہیں پہنچی لیکن اب جب کہ خدا کی ہدایت آپ کو پہنچ چکی ہے آپ کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا اس وجہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں آپ خدا کی پکڑ میں نہ آجائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر اس انجام سے دوچار ہوں جو شیطان اور اس کے اولیاء کا مقدر ہے۔ (۱)

تدبر قرآن میں آیت مبارکہ کی تفسیر میں مولانا قدرے مشکل الفاظ استعمال کرتے ہیں جو یقیناً پڑھے لکھے لوگوں میں مقبول ہیں جیسا کہ مضطر سفاہت، بدیہی، ضد و کد وغیرہ ہیں ایک کم پڑھے لکھے قاری کے لئے ان الفاظ کے مفہوم سے آگاہی تھوڑا مشکل کام ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام اس اسلوب میں گہری دل سوزی اور درد مندی پائی جاتی ہے اور یہی اسلوب دعوت کی اصل بنیاد ہے آیت مبارکہ کی تفسیر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اندر اپنے باپ کی گمراہی پر جو گہرا اضطراب پایا جاتا ہے اس کی بہترین نمائندگی کی گئی ہے۔

دعوت و تبلیغ میں حق کے لئے حمیت کا اسلوب:

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کے لیے گہری درد مندی رکھتے تھے تاہم ہمیشہ ان کے دل میں اسلام کی محبت غالب رہی اور ان کے قول و عمل سے بھی اسی کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں اس حیثیت کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

﴿قَالَ أَرَاغِبٌ أَنتَ عَنْ ءَالِهَتِي يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَٱهْجُرْنِي مَلِيًّا﴾ (۲)

ترجمہ: وہ بولا (حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ) اے ابراہیم کیا تم میرے معبودوں سے برگشتہ ہو رہے ہو! اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا تم مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جاؤ۔

---

(۱) تدبر قرآن ۳/۲۵۸

(۲) سورۃ مریم: ۱۹/۴۶

مولانا امین احسن تدبر قرآن میں آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ قبائلی زندگی میں جس طرح آقاؤں کو اپنے غلاموں پر غیر محدود اختیارات حاصل ہوتے ہیں اسی طرح باپ کو اپنے بیٹوں اور بیٹیوں پر بالکل غیر محدود اختیارات حاصل تھے وہ ان کو قتل کر دیں، سنگسار کر دیں یا زندہ در گور کر دیں، کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا۔ جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ قَالَ سَلَٰمٌ عَلَيۡكَۖ سَأَسۡتَغۡفِرُ لَكَ رَبِّيٓۖ إِنَّهُۥ كَانَ بِي حَفِيّٗا ٥ وَأَعۡتَزِلُكُمۡ وَمَا تَدۡعُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ وَأَدۡعُواْ رَبِّي عَسَىٰٓ أَلَّآ أَكُونَ بِدُعَآءِ رَبِّي شَقِيّٗا ﴾(۱)

ترجمہ: ابراہیم نے کہا، اچھا میرا اسلام! میں آپ کے لیے اپنے رب سے مغفرت مانگوں گا وہ میرے حال پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں کو اور ان چیزوں کو جن کو آپ لوگ خدا کے ماسوا پوجتے ہیں چھوڑ کر علیحدہ ہو رہا ہوں اور صرف اپنے ہی رب ہی کی بندگی کروں گا امید ہے کہ اپنے رب کی بندگی کر کے میں محروم نہیں رہوں گا۔

امین احسن صاحب فرماتے ہیں کہ یہاں سَلَٰمٌ داعی اسلام کے مفہوم میں ہے۔ جس طرح ملاقات کے لیے شائستہ اور بابرکت طریقہ یہ ہے کہ وہ سلام کے ساتھ ہو اس طرح جدائی کے لیے بھی شائستہ طریقہ یہی ہے۔

" إِنَّهُۥ كَانَ بِي حَفِيّٗا " اس کو کہتے ہیں کہ جو کسی کی بڑی خبر رکھنے والا، اس کے لیے بڑا اہتمام کرنے والا اور اس اس کے لیے بڑا نہایت کرم فرمانے والا ہو۔(۲)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب باپ کو اتنا غضب ناک دیکھا تو فرمایا کہ بہتر ہے، اگر آپ کی رائے یہ ہے کہ میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں تو میرا اسلام لیجیے۔ میں یہاں سے چلا اب آپ سے تو کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں رہی لیکن میں اپنے رب سے آپ کے لیے مغفرت کی دعا کروں گا وہ میری بڑی خبر رکھنے والا ہے مجھے امید ہے کہ وہ میری دعا قبول فرمائے گا۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ باپ کے اس سنگ دلانہ رویہ کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ان کے لیے دعائے مغفرت کرنا ان کی غایت درجہ دردمندی اور رقت قلب کی دلیل ہے قرآن کے دوسرے مناجات سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے باپ کے لیے اس وقت تک دعا جاری رکھی جب تک اللہ نے آپ کو اس سے روک نہیں دیا۔ لیکن اس دردمندی کے ساتھ حق کی غیرت و حمیت کا جو تقاضا تھا وہ بھی انہوں نے پورا پورا ادا کیا۔ مروت یا خوف سے مغلوب ہو کر اپنی دعوت توحید کے معاملے میں کوئی لچک یا مداہنت گوارا نہیں کی بلکہ چلتے چلاتے صاف صاف سنا دیا کہ میں آپ لوگوں سے بھی کنارہ کش ہوتا ہوں اور

---

(۱) سورۃ مریم: ۱۹/ ۴۸،۴۷

(۲) تدبر قرآن ۴/ ٦٦٠

آپ لوگوں کے ان دیویوں اور دیوتاؤں سے بھی جن کو آپ لوگ خدا کے ماسوا پوجتے ہیں مزید وضاحت یہ بھی فرمادی کہ میں اپنے رب کے سوا نہ کسی اور کو پکارتا ہوں نہ پکاروں گا اور میں امید رکھتا ہوں کہ اپنے رب کو پکار کو محروم نہیں رہوں گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس اعلان برات میں جو اعتماد علی اللہ اور جو خلت سے بے نیازی ہے وہ لفظ لفظ سے نمایاں ہیں۔"وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ "کہہ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آزر اور اس کے حواریوں اور معبدوں کو بھی لات مار دی۔ پھر بات کو صرف مخفی پہلو ہی سے کہنے پر بس نہیں کیا بلکہ اس کو مثبت پہلو سے بھی آشکار کر دیا فرمایا"وَأَدْعُواْ رَبِّي "" میں صرف اپنے رب کو ہی پکارتا ہوں اس کے سوا کسی اور معبود سے آشنا نہیں۔یوں اپنے رب پر اپنے غیر متزلزل اعتماد کا اظہار فرمایا کہ میں اپنے رب کو پکار کر کبھی محروم نہیں رہا ہوں۔ امید ہے کہ اس آزمائش میں بھی اس کی نصرت اور رہنمائی میرے ساتھ ہو گی ایک طرف تو وہ نرمی ہے دوسری طرف سختی (بقول امین احسن صاحب موم کی طرح نرم پتھر کی طرح سخت)

درحقیقت نرمی و سختی کا یہی امتزاج اور ان کی باہم آمیزی ہے جو ایک داعی حق کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے جب تک موم کی طرح نرم اور پتھر کی طرح سخت نہ ہو وہ حق کی کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔[۱]

داعیان توحید کو جھٹلانا اور انہیں اذیتیں دینا، مشرکین کا ہمیشہ سے وتیرہ رہا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعوت توحید دینا شروع کی تو سب سے پہلی مخالفت ان کے اپنے گھر ہی سے شروع ہوئی یہاں تک کہ آپ کا مشرک باپ آپ کو سنگسار کرنے کی دھمکی بھی دیتا ہے تاہم آپ ان کی دھمکیوں اور ترش روئی کا جواب نہایت شفقت سے دیتے رہے اور معبودان باطلہ کی عدم اہلیت وعدم صلاحیت کو خوب واضح کرتے رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ اسوہ یہ باپ کے لیے دردمندی کے باوجود حق کے لیے حمیت کا رویہ تا قیامت آنے والے داعیان توحید کو شاندار اسوہ فراہم کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم کے اس اسلوب دعوت سے نرمی اور سختی دونوں کے استعمال کا سبق ملتا ہے تاہم حتی الامکان نرمی کو فوقیت دینی چاہیے کیونکہ نرم الفاظ سے دلوں کی سختی دھل جایا کرتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایثار و قربانی کا انمول اسلوب:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسالیب دعوت میں ایثار و قربانی کی معراج موجود ہے۔ دین حق کی تبلیغ اور نشر واشاعت میں ہر قسم کی تکلیف برداشت کی اور ہر طرح کی قربانی پیش کی۔ لیکن کسی بھی قدم پر ان کے پایہ استقلال میں لغزش نہ آئی، آپ علیہ السلام کو اپنے پیارے بیٹے کو قربان کرنے کا حکم ہوا اور بیٹا بھی وہ جو بڑھاپے کی اولاد تھا لیکن آپ نے بیٹے کی محبت کو بھی دین اسلام کی محبت پر غالب نہ آنے دیا۔ قرآن پاک نے اس صورت حال کو یوں بیان کیا ہے:

(۱) تدبر قرآن ۴/ ۲۶۱

﴿ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ ٱلسَّعْيَ قَالَ يَٰبُنَيَّ إِنِّيٓ أَرَىٰ فِي ٱلْمَنَامِ أَنِّيٓ أَذْبَحُكَ فَٱنظُرْ مَاذَا تَرَىٰۚ قَالَ يَٰٓأَبَتِ ٱفْعَلْ مَا تُؤْمَرُۖ سَتَجِدُنِيٓ إِن شَآءَ ٱللَّهُ مِنَ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴾[۱]

ترجمہ: پس جب وہ اس کے ساتھ چلنے پھرنے کی عمر کو پہنچا تو اس نے کہا، اے میرے بیٹے میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں تو غور کر لو تمہاری کیا رائے ہے اس نے جواب دیا کہ اے میرے باپ آپ کو جو حکم دیا جارہا ہے اس کی تعمیل کیجیئے آپ ان شاء اللہ مجھے ثابت قدموں میں پائیں گے۔

مولانا امین احسن اصلاحی آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہاں سعی سے مراد دوڑنے کی عمر ہے جب فرزند عزیز باپ کے ساتھ دوڑنے پھرنے کی عمر کو پہنچا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ہو رہی ہے کہ اس کو اپنے رب کی خاطر قربان کر دیں حضرت ابراہیم علیہ السلام دعوت حق کو سربلندی کرنے کی پاداش میں ہجرت پر مجبور کیے گئے اور وہ واحد چیز جو اس غربت میں ان کے لیے دلجمعی کا باعث تھی وہ ان کا یہی اکلوتا فرزند تھا اور اس کی عمر اس وقت اتنی ہو چکی تھی کہ وہ باپ کے ساتھ چلنے پھرنے اور چھوٹے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگ گیا تھا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر تیرہ برس کی تھی۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ اس عمر میں بیٹا باپ کی نگاہوں میں سب سے زیادہ محبوب ہوتا ہے غور کریں کہ کتنا سخت امتحان ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ڈالے جاتے ہیں[۲]۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی وفاداری میں کوئی شخص اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک اپنی سب سے زیادہ عزیز چیز اس کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہو جائے اس وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اس امتحان میں ڈالے گئے اگرچہ یہ ہدایت خواب میں ہوئی تھی اور خواب کی بات محتاج تاویل و تعبیر ہوتی ہے اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام چاہتے تو اس کی کوئی تاویل کر لیتے لیکن وہ ایک صداقت شعار اور وفا شعار بندے تھے اس وجہ سے اس کی کوئی تعبیر نکالنے کے بجائے وہ اس کی من و عن تعمیل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

اس سلسلے میں انہوں نے فرزند کے حوصلے کا بھی اندازہ کرنا چاہا فرمایا کہ بیٹے میں خواب دیکھتا ہوں کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں تمہاری کیا رائے ہے؟ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس خواب کو خواب کی بجائے امر الٰہی جانا اور فوراً جواب دیا کہ، والد ماجد! آپ کو جو حکم دیا جارہا ہے آپ بے دریغ تعمیل کیجیے اور میری طرف سے مطمئن رہے ان شاء اللہ آپ مجھے پوری طرح ثابت قدم پائیں گے۔

﴿ فَلَمَّآ أَسْلَمَا وَتَلَّهُۥ لِلْجَبِينِ ﴾[۳]

---

(۱) سورۃ الصافات: ۱۰۲/۳۷

(۲) کتاب پیدائش: ۳۱/۲

(۳) سورۃ الصافات: ۱۰۳/۳۷

اب یہاں اصل مرحلے یعنی قربانی کا بیان ہو رہا ہے اسلام کے معنی اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دینے کے ہیں یعنی باپ اور بیٹا دونوں امتحان کے لیے آمادہ ہوگئے باپ نے بیٹے کو ذبح کر دینے کے لیے چھری نکال لی اور بیٹے نے اپنے آپ کو ذبح کر دینے کے لیے حوالے کر دیا باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل بچھاڑ دیا پیشانی کے بل بچھاڑنے کی توجیہ بعض لوگوں نے یہ کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چاہا کے ذبح کرنے کے وقت بیٹے کا محبوب چہرہ سامنے نہ ہو تا کہ رقت قلب چھری چلانے میں مانع نہ ہو۔ لیکن امین احسن صاحب فرماتے ہیں کہ یہ توجیہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے جو باپ اپنے اکلوتے اور محبوب لخت جگر پر چھری چلانے کے لیے آستین چڑھائے گا وہ اس قسم کی تسلیوں کا محتاج نہیں ہو سکتا میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بیٹے کو عین سجدہ کی حالت میں قربان کرنا چاہا اس وجہ سے پیشانی کے بل لٹایا کہ خدا کے قرب کی سب سے زیادہ محبوب حالت اسلام میں یہی ہے۔ (۱)

امتحان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فیروز مندی:

قرآن پاک میں ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَنَٰدَيۡنَٰهُ أَن يَٰٓإِبۡرَٰهِيمُ ٥ قَدۡ صَدَّقۡتَ ٱلرُّءۡيَآۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجۡزِي ٱلۡمُحۡسِنِينَ﴾ (۲)

ترجمہ: اور ہم نے اس کو آواز دی اے ابراہیم پس تم نے خواب کو سچ کر دکھایا! بے شک ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ قریب تھا چھری چل جائے لیکن اللہ تعالی نے ان کو آواز دی کہ اے ابراہیم تو نے خواب کو سچ کر دکھایا اور یہ فیروز مندی جو اس امتحان میں تم نے کی یہ تمہاری خوب کاری اور تمہارے اخلاص و احسان کا صلہ ہے اللہ تعالی اپنے خوب کار بندوں کو اسی طرح اپنے امتحانوں میں سر فرازی بخشتا ہے۔

" قَدۡ صَدَّقۡتَ ٱلرُّءۡيَآۚ " میں یہ اشارہ ہے کہ خواب میں جو کچھ دکھایا جاتا ہے وہ محتاج تاویل تعبیر ہوتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو خواب دکھایا گیا اس کی اصل تعبیر یہ تھی کہ وہ اس بیٹے کو خدا کی نذر کر دیں یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ فی الواقع ذبح کریں۔ چنانچہ جب وہ بیٹے کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے تو جو خواب کا اصل منشا تھا وہ پورا ہو گیا۔

" إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجۡزِي ٱلۡمُحۡسِنِينَ " سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جو لوگ اللہ کے صدق و اخلاص اور اس کے امکانات کی تعمیل میں "احسان" کی روش اختیار کرتے ہیں یعنی ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ خدا کے ہر حکم کی تعمیل اسی طرح کریں جس طرح اس کے کرنے کا حق ہے ان کو اللہ تعالی یہ صلہ دیتا ہے یہ ایسے بڑے بڑے امتحانوں میں شاندار کامیابیاں

---

(۱) تدبر قرآن ۶/ ۴۸۶

(۲) سورۃ الصافات: ۳۷/ ۱۰۴، ۱۰۵

حاصل کرتے ہیں اور پھر اس کے صلے میں آخرت کی ابدی بادشاہی کی فیروز مندیاں پاتے ہیں بر عکس اس کے جن لوگوں کی روش دین کے معاملے میں فرار پسند رہتی ہے وہ آہستہ آہستہ خدا کی آزماؤشوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوتا ہے کہ آخرت کی کامیابیوں کی راہ ان کے لیے بالکل بند ہو جاتی ہے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس کامیابی پر اللہ کی طرف سے تحسین و آفرین ہے کہ یہ کوئی معمولی امتحان نہیں تھا بلکہ بہت بڑا امتحان تھا جس امتحان کو خود اللہ تعالی بڑا امتحان قرار دے رہے ہیں اس کے بڑے ہونے میں کیا شبہ ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسی کامیابی حاصل کی جس کی داد اللہ تعالی نے "قَدْ صَدَّقْتَ ٱلرُّءْيَآ" کے شاندار الفاظ سے دی تو اس میں شبہ نہیں کہ اس آسمان کے نیچے نہ اس سے بڑا کوئی امتحان پیش آیا نہ اس سے زیادہ شاندار کامیابی کسی نے حاصل کی۔(۱)

داعیان کرام و تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے آزمائش اور قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے کیونکہ جس طرح سونا آگ میں تپ کر کندن بنتا ہے اسی طرح داعیان کرام بھی آزمائشوں اور قربانیوں سے گزر کر ہی دعوت و تبلیغ کا علم سر بلند رکھ سکتے ہیں۔

یہ قربانی جانی بھی ہو سکتی ہے مالی بھی ہو سکتی ہے اور وقت کی بھی ہو سکتی ہے تاہم داعیان کرام کو ہمہ وقت اس کے لئے تیار رہنا چاہیے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت میں سوالات بطور استخفاف:

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنی قوم کو دعوت دیتے ہیں تو سوال وجواب کا طریقہ اختیار کرتے ہیں تاکہ مشرکین کے دماغ کی گرہیں کھل سکیں اور ان کے شکوک وشبہات دور ہو سکیں نیز سوال وجواب کے۔ ہر طریقے سے حق کی حقانیت کھل کر ان کے سامنے آگئی اور بتوں کی بے بسی ولاچاری ان پر واضح ہو گئی قرآن پاک میں اس سورت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿ وَٱتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَٰهِيمَ ﴾(۲)

ترجمہ: اور ان کو ابراہیم کی سرگزشت سناؤ۔

﴿ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِۦ مَا تَعْبُدُونَ ﴾(۳)

ترجمہ: جب کہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا! بھلا یہ تم کن چیزوں کی پرستش کرتے ہو۔

---

(۱) تدبر قرآن ۶/ ۴۸۵،۴۸۶

(۲) سورۃ الشعراء:۲۶/ ۶۹

(۳) سورۃ الشعراء:۲۶/ ۷۰

﴿قَالُوا۟ نَعۡبُدُ أَصۡنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَـٰكِفِينَ﴾(۱)

ترجمہ: انہوں نے جواب دیا ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور برابر ان کی پوجا پر جمے رہیں گے۔

مولانا امین احسن اصلاحی آیت مبارکہ کی تفسیر یوں کرتے ہیں۔

سوال بطور استخفاف: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال استفہام کی نوعیت کا نہیں بلکہ استخفاف کی نوعیت کا تھا یعنی یہ کیا فضول اور بے حقیقت چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو! ان کی قوم نے ان کا جواب حمیت جاہلیت کے پورے جوش اور غرور کے ساتھ دیا کہ ہم بتوں کو پوجتے ہیں۔ اور تمہارے علی الرغم اسی طرح ان کو پوجتے رہیں گے تم کتنا ہی زور لگاؤ لیکن ہم اپنے ان معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پھر سوال کیا:

﴿قَالَ هَلۡ يَسۡمَعُونَكُمۡ إِذۡ تَدۡعُونَ ۝ أَوۡ يَنفَعُونَكُمۡ أَوۡ يَضُرُّونَ﴾(۲)

ترجمہ: حضرت ابراہیم نے کہا کیا یہ تمہاری سنتے ہیں؟ جب تم ان کو پکارتے ہو یا تمہیں نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں!۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان بتوں کی بے حقیقی واضح کرنے کے لیے سوال کیا کہ جب تم ان سے دعا یا فریاد کرتے ہو تو کیا یہ تمہاری دعا اور فریاد سنتے ہیں یا تمہیں کوئی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں یا پہنچا سکتے ہیں آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں کہ تم ان کی پرستش کرتے ہو۔

﴿قَالُوا۟ بَلۡ وَجَدۡنَآ ءَابَآءَنَا كَذَٰلِكَ يَفۡعَلُونَ﴾(۳)

ترجمہ: انہوں نے کہا! بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسے ہی کرتے ہوئے پایا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے لوگوں نے جواب دیا کہ یہ باتیں ہم نہیں جانتے بس ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے سو ہم اسی طرح کرتے رہیں گے اپنے آباواجداد کے طریقے کو ہم تمہارے کہنے سے نہیں چھوڑ سکتے۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے اس دور کی باتیں نقل ہو رہی ہیں جب وہ تمام عقلی و نقلی اور آفاقی و نفسی دلائل سے اپنی قوم پر حجت تمام کر چکے تھے۔

آگے کی آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد انہوں نے قوم سے اعلان برأت کر کے ہجرت فرمائی کیونکہ اس مرحلے میں ظاہر ہے کہ نبی کی دعوت کا انداز بدل جاتا ہے اور قوم کے جواب کا انداز بھی بدل جاتا ہے پیغمبر جو کچھ کہنا

---

(۱) سورۃ الشعراء:۲۶/۷۱

(۲) سورۃ الشعراء:۲۶/۷۲،۷۳

(۳) سورۃ الشعراء:۲۶/۷۴

چاہتا ہے اس کی نوعیت قوم کی عقل اور اس کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی آخری کوشش ہوتی ہے اور قوم جو کچھ جواب دیتی ہے اس کی نوعیت آخری ضد اور ہٹ دھرمی کے مظاہرے کی ہوتی ہے۔(۱)

سیدنا ابراہیم السلام نے اپنی قوم کے مشرکوں سے جو سوال کئے وہ ایسی صفات ہیں جن کا ایک معبود حقیقی میں پایا جانا لازمی ہے، یعنی وہ پکارنے والے کی پکار یا فریاد کو سنتا ہو پھر اس کا جواب بھی دیتا ہو اس کی حاجت برداری کی طاقت بھی رکھتا ہو اور اسے نقصان اور تکلیف سے بھی بچا سکتا ہو، اگر کسی معبود میں یہ صفات نہ پائی جائیں تو وہ معبود باطل ہی ہو سکتا ہے حقیقی نہیں ہو سکتا اور یہ سوالات دراصل قریش مکہ سے ہی ان کے معبودوں کے متعلق ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قوم آپ کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں دے سکتی تھی۔ لے دے کے ان کے پاس جو جواب ہو سکتا تھا وہ یہی تھا کہ چونکہ ہمارے آباو اجداد ایسا کرتے آئے ہیں اور مدتوں سے ایسا ہوتا چلا آرہا ہے لہذا ہم بھی یہ کام نہیں چھوڑ سکتے ہمارے آباؤ اجداد ہم سے زیادہ سمجھدار بزرگ اور زیادہ نیک تھے آخر انہوں نے ان بتوں کی پرستش میں کچھ فائدہ دیکھا ہو گا تبھی انہوں نے یہ کام شروع کیا تھا آخر ان کے پاس بھی کوئی دلیل تو ہو گی۔(۲)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جھوٹے مدعیان اور قوم کے ساتھ مناظروں میں منطقیانہ گفتگو اور فلسفیانہ دلائل سے گریز کرتے ہوئے پر زور حسی اور مشاہداتی دلائل و براہین سے حق کو واضح کیا اور یہ دلائل ایسے پر تاثیر تھے کہ ہر کسی پر اثر کر گئے اگرچہ اپنے غرور اور خود سری اور اقرباپروری کی وجہ سے انہوں نے دعوت حق کو تسلیم نہ کیا تاہم بتوں کی لاچارگی ان پر ثابت ہو گئی۔

شیخ امین احسن اصلاحی نے آیت مبارکہ کی تفسیر میں کفار کی ذہنیت کو کھل کر واضح کیا ہے کہ وہ لوگ صرف آباؤ اجداد کی اندھادھند پیروی کے قائل تھے غور و فکر اور تدبر سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا۔

دعوت دین کی راہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک اہم قدم:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی قوم پر بتوں کی بے بسی کو ثابت کر دیا تو انہوں نے اس سلسلے میں ایک انقلابی قدم اٹھایا قرآن پاک میں اس صورت حال کو یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿ قَالَ بَل رَّبُّكُمۡ رَبُّ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ ٱلَّذِي فَطَرَهُنَّ وَأَنَا۠ عَلَىٰ ذَٰلِكُم مِّنَ ٱلشَّٰهِدِينَ ﴾(۳)

---

(۱) تدبر قرآن ۵ / ۵۲۲، ۵۲۳

(۲) تیسیر القرآن، مولانا عبد الرحمن کیلانی، مکتبہ السلام انٹرنیشنل، موہن پورہ، لاہور، ۱۴۳۵ھ، ۳/ ۳۴۶

(۳) سورۃ الانبیاء: ۲۱/ ۵۶

ترجمہ: اس نے کہا بلکہ تمہارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان کو پیدا کیا اور میں اسی پر تمہارے سامنے گواہی دینے والوں میں سے ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اس سے پہلے والی آیت میں اپنی قوم سے کہا کہ تم اور تمہارے باپ دادا کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ مولانا امین احسن صاحب فرماتے ہیں کہ یہ بات ان کے لیے اتنی انوکھی اور عجیب تھی کہ وہ یہ باور نہ کر سکے کہ کوئی شخص سوچ سمجھ کر ایسی بات زبان سے نکال سکتا ہے انہوں نے گمان کیا کہ یہ اکھڑ نوجوان نوجوانی کی ترنگ میں بے سوچے سمجھے بس یونہی ایک بات کہہ گزرا ہے چونکہ انہوں نے سوال کیا کہ کیا یہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کو جانتا ہے؟ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس نعرہ حق کو ایک غیر سنجیدہ اور لاابالیانہ نعرہ قرار دے کر لوگوں کو اس کے اثر سے بچانا چاہا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے جواب میں دعوت حق کا ایک قدم اور آگے بڑھا دیا فرمایا کہ پتھر اور مٹی کے بت تمہارے رب نہیں ہیں بلکہ تمہارا رب آسمانوں اور زمین کا وہ خداوند ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے اور میں تمہیں اس کی دعوت دیتا ہوں اور تمہارے اندر اس کی منادی کرتا ہوں۔ شہادت یہاں دعوت اور اعلان کے معنی میں ہے اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

﴿وَتَٱللَّهِ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَٰمَكُم بَعْدَ أَن تُوَلُّوا۟ مُدْبِرِينَ﴾[1]

ترجمہ: اور خدا کی قسم! جب تم یہاں سے رخصت ہو کر لوٹو گے تو میں تمہارے ان بتوں کے ساتھ ایک تدبیر کروں گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لگے ہاتھوں بقید قسم لوگوں کو اپنے اس ارادے سے بھی آگاہ کر دیا کہ جب آپ لوگ یہاں سے لوٹو گے تو میں ان بتوں کے ساتھ ایک خفیہ کاروائی کرنے کا عزم رکھتا ہوں۔ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعوت بت خانے کے اندر اسی اجتماع کے موقع پر دی ہے اسی وجہ سے فرمایا کہ جب آپ لوگ یہاں سے گھروں کو سدھاریں گے تو میں آپ کے ان خداؤں کی مرمت کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اصل اسکیم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مخفی رکھا (یہ جس صورت میں ظاہر ہوئی) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ مخصوص طریقہ بحث و استدلال کا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بحث واستدلال میں لطیف وپاکیزہ طنز سے جس طرح کام لیتے ہیں اسی طریقہ استدراج حجت ابراہیمی کی ایک نہایت نمایاں خصوصیت ہے۔ استدراج کا مطلب ہے کہ وہ بحث میں اپنے حریف کو۔ بالآخر وہ چاروں شانے چت گرتا ہے اور اسے خود اپنی زبان سے اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ یہی طریقی استدراج حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے حریفوں کو قائل کرنے کے لیے اس موقع پر استعمال فرمایا انہوں نے شب میں کوئی موقع نکال کر تمام چھوٹے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا صرف

---

(۱) سورۃ الانبیاء: ۲۱/ ۵۷

بڑے بت کو چھوڑ دیا اور کلہاڑا اس پہ رکھا کہ اگر نوبت مجھ سے باز پرس کی آئی تو میں کہہ دوں گا کہ یہ حرکت تو ان بڑے صاحب کی معلوم ہوتی ہے اور مجھ سے پوچھنے کے بجائے خود ان مظلوموں ہی سے کیوں نہ پوچھ لیتے۔ اگر وہ بولتے ہیں تو اپنی داستانِ غم خود ہی سنا دیں گے کہ یہ مصیبت ان پر کس کی لائی ہوئی ہے! ظاہر ہے کہ اس کے بعد وہ لازما کہیں گے کہ یہ تو بولتے نہیں تو ان سے کس طرح پوچھا جائے تو میں ان سے کہوں کہ کہ نادانو!! جو خود اپنے اوپر آئی مصیبت کو نہ دفع کر سکتے ہو نہ یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ مصیبت کس کے ہاتھوں ان پر آئی آخر وہ کس مرض کی دوا ہیں کہ تم ان کو معبود بنا کر ان کو ڈنڈوت کرتے ہو۔ یہی وہ اسکیم ہیں جس میں طنز تضحیک اور استدراج کا پہلو نمایاں ہیں۔[١]

﴿فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا إِلَّا كَبِيرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ﴾[٢]

ترجمہ: پس اس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا بجز ان کے بڑے کے تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔

" جُذَاذًا " پاش پاش ٹکڑے ٹکڑے ہوئی چیز کو کہتے ہیں یہ اس مخفی تدبیر کا بیان ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ارادے کو بروئے کار لانے کے لیے اختیار فرمائی۔ انہوں نے موقع نکال کر بڑے بت کو چھوڑ کر باقی سب بتوں کو پاش پاش کر دیا بڑے بت کو اس خیال سے چھوڑ دیا کہ جب اس معاملے کی تفتیش ہو تو ان احمق لوگوں سے کہہ سکیں کہ یہ بڑے بت کی کارستانی معلوم ہوتی ہے تو اس کی طرف رجوع کریں کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ اور اگر یہ کہیں کہ یہ تو بولتے نہیں ہیں تو پھر ان پر اتمام حجت کا موقعہ ہاتھ آئے کہ جب یہ بڑے چھوٹے سب ہی گونگے ہیں تو آخر ان گونگوں بہروں کو معبود بنانے کی کیا وجہ ہے؟[٣]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات بت شکنیوں کا منظر پیش کرتی ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید ثبوت ہے کہ بتوں کی الوہیت کا دعویٰ ہی سرے سے باطل ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے بیزاری کا اظہار فرمایا اور ان کی توہین کی اگر وہ کسی کا کچھ بگاڑ سکتے تو ضرور آپ علیہ السلام کو تکلیف پہنچاتے۔

ضیاء النبی میں پیر کرم شاہ صاحب فرماتے ہیں،

ان کے ہاں بت پرستی اگر عقیدے کا مسئلہ ہی ہوتا تو اس روز کے بعد شاید ان میں کوئی ایک بھی ان بتوں کو خدا ماننے کے لیے تیار نہ تھا لیکن یہاں نمرود کے سیاسی مفاد پر زد پڑتی تھی اس کا تخت شاہی ڈولنے لگا تھا۔[٤]

---

(١) تدبر قرآن: ۵/ ۱۵۹

(۲) سورۃ الانبیاء: ۲۱/ ۵۸

(۳) تدبر قرآن، ۵/ ۱۶۰

(۴) ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم، پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، گنج بخش روڈ، لاہور، ص ۳۱۹

دعوت کے فروغ کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مخاطبوں کے سامنے اپنی دعوت کے تمام مبادی اصول رکھ دیئے جن کے اندر نہایت گہرا منطقی ربط بھی ہے لیکن انہوں نے ان کو پیش کرنے میں دلیل کا اسلوب اختیار کرنے کی بجائے اپنی ذاتی تاثرات کے اظہار کا انداز اختیار فرمایا۔ آپ نے اپنی قوم کی نافرمانیوں سے اعلان برأت بھی کیا اور پھر وہاں سے ہجرت بھی کی اس مرحلے میں آپ نے قوم کو مخاطب کرکے بحث واستدلال کے انداز میں کچھ کہنا بے سود تھا اس وجہ سے انہوں نے اپنے ذاتی تاثرات نہایت بلیغ انداز میں ان کے سامنے رکھ دیئے کہ شاید اس طرح ان کے دل میں بات اتر جائے اگر دلوں میں زندگی کی کچھ رمق ہو تو یہ اسلوب بعض اوقات نہایت موثر ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنی دعوت کے فروغ کے لیے دعا فرمائی۔

﴿رَبِّ هَبۡ لِي حُكۡمٗا وَأَلۡحِقۡنِي بِٱلصَّٰلِحِينَ﴾[1]

ترجمہ: اے میرے رب! مجھے قوت فیصلہ عطا فرما اور مجھے زمرہ صالحین میں شامل کر اور بعد میں آنے والوں میں میرا نیک ذکر قائم رکھ۔

"رَبِّ هَبۡ لِي حُكۡمٗا" سے مراد یہاں وہ قوت فیصلہ ہے جو حضرات انبیاء کو خاص طور پر ہوتی ہے اس وقت چونکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت جیسا اہم قدم اٹھا رہے تھے اور اس بات کے محتاج تھے کہ آگے کے تمام مراحل میں ان کو صحیح قوت فیصلہ کی توفیق اور خدا کی رہنمائی حاصل ہو۔

"وَأَلۡحِقۡنِي بِٱلصَّٰلِحِينَ" حق کی خاطر اپنے خاندان اور اپنی قوم سے بھی انہوں نے اعلان برات فرمادیا اس وجہ سے یہ دعا بھی فرمائی کہ ان بُرے لوگوں کی جگہ اچھے لوگوں کی معیت اور رفاقت حاصل ہو۔

"﴿وَٱجۡعَل لِّي لِسَانَ صِدۡقٖ فِي ٱلۡأٓخِرِينَ ٨٤﴾"

لسان کے معنی یہاں شہرت اور چرچا کے ہیں اور اس کی وضاحت چونکہ "صدق" کی طرف ہے اس وجہ سے اس سے مراد ذکر جمیل ہوگا۔ اس میں پائیداری ودوام واستمرار کا مفہوم بھی پایا جائے گا۔

حضرت ابراہیم نے اپنی دعوت کے فروغ اور استحکام کی دعا فرمائی کہ آنے والی نسلوں میں یہ دعوت پھیلے اور اس کو پائیداری اور دوام نصیب ہو، سیدنا ابراہیم کی اس دعا کو جو قبولیت حاصل ہوتی ہے تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ بنی اسرائیل میں جتنے انبیاء اور رسول آئے سب انہی کی دعوت کو لے کر آئے۔ اور آخر میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعوت کو ایک عالمگیر اور زندہ وجاوید دعوت بنادیا۔؟[2]

---

(۱) سورۃ الشعراء:۲۶/ ۸۳

(۲) تدبر قرآن، ۵/ ۶،۷

معارف القرآن میں اس کی تفسیر یوں کی گئی ہے:

حضرت ابراہیم نے فرمایا اے میرے پروردگار مجھ کو حکمت یعنی جامعیت بین العلم والعمل میں زیاد کمال عطا فرما کیونکہ نفس حکمت تو وقت دعا کے بھی حاصل تھی اور مراقب قرب میں بھی مجھ کو اعلی درجے کے نیک لوگوں کے ساتھ شامل فرما۔

اس آیت مبارکہ میں "لسان" سے مراد ذکر ہے اور اسی کا نام نفع کے لیے ہے آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اے خدایا مجھے ایسے پسندیدہ طریقے اور عمدہ نشانیاں عطا فرما جس کی دوسرے لوگ قیامت تک تعریف کریں اور مجھے ذکر خیر اور عمدہ صفت سے یاد کیا کریں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی دعا قبول فرمائی۔ یہود ونصاری اور مشرکین مکہ تک ملت ابراہیمی سے محبت والفت رکھتے تھے اور اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں اگرچہ ان کا طریقہ ملت ابراہیمی کے خلاف کفر وشرک ہے مگر وہ دعوی کرتے ہیں کہ ہم ملت ابراہمی پر ہیں اور امت محمدیہ ﷺ تو بجا طور پر ملت ابراہیمی پر ہونے کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتی ہے۔[۱]

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا مناظرہ دربار نمرود میں:

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کے دربار میں گئے تو رسم ورواج کے مطابق آپ نے سجدہ نہ کیا حالانکہ دربار کا رواج تھا کہ ہر شخص دربار میں آتے ہی سجدہ کرتا نمرود نے سوال کیا "کہ آپ نے مجھے سجدہ نہیں کیا" تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میں اپنے پرودگار کے علاوہ کسی کو سجدہ نہیں کرتا" نمرود نے کہا تمہارا رب کون ہے؟؟ قرآن پاک میں اس صورت حال کو یوں بیان کرتا ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝٢٥٨﴾[۲]

ترجمہ: کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں اس وجہ سے حجت کی کہ خدا نے اس کو اقتدار بخشا تھا جب کہ ابراہیم نے کہا میرا رب تو وہ ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے وہ بولا کہ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں ابراہیم نے کہا کہ یہ بات ہے تو اللہ سورج کو مشرق

(۱) معارف القرآن، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، ادارہ المعارف، کراچی، ۱/۵۲۸، ۵۲۹

(۲) سورۃ البقرۃ: ۲/۲۵۸

سے نکالتا ہے تو اسے پچھم سے نکال دے تو وہ کافر یہ سن کر بھونچکارہ گیا اور اللہ ظالموں کو کامیاب نہیں کرتا۔

مولانا امین احسن صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "الذی" سے اگرچہ یہاں واضح نہیں ہے کہ کون مراد ہے لیکر مفسرین حضرات صاحب عام طور پر نمرود ہی کو مراد لیا ہے یہی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے یہ حضرت ابراہیم کا ہم عصر بادشاہ تھا اور جس کی طرف قرآن نے یہاں اشارہ کیا ہے۔

"فی ربہ" رب کے بارے میں بحث کی وجہیہ ہوتی ہو گی کہ اس زمانے میں عام طور پر جو بادشاہ ہوئے تھے وہ اپنے آپ کو کوتار بادشاہ geol king سمجھتے تھے یعنی ان کی قوم کے لوگ جو دیوتاؤں کو پوجتے تھے بادشاہ ان میں سب سے بڑے دیوتا کا مظہر جانا جاتا تھا۔ نمرود کی قوم جن دیوتاؤں کو پوجتی تھی قدیم صحیفوں اور قرآن دونوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سورج کو سب سے بڑے دیوتا کا درجہ حاصل تھا اس وجہ سے وہاں کا نمرود سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا رہا ہو گا۔ اس زعم کے ساتھ ظاہر ہے کہ اپنی خدائی اور کسی اور خدا کی خدائی کی دعوت اس کے لیے ایک بالکل ناقابل برداشت چیز تھی۔ چنانچہ جب ابراہیم نے اس بات کا اعلان کیا ہو گا کہ اب حقیقی صرف اللہ واحد ہی ہے اس کے سوا کوئی رب نہیں تو اس کی دعوت کی زد میں اس نے اپنی خدائی پر بھی پڑتی محسوس کی ہو گی اور حضرت ابراہیم کو بلا کر ان سے باز پرس کی ہو گی کہ "یہ کون رب ہے جس کی طرف تم دعوت دے رہے ہو"؟ رب تو میں ہوں کہ سورج دیوتا کا مظہر اور اس کا اوتار ہوں۔

أَنْ ءَاتَىٰهُ ٱللَّهُ ٱلْمُلْكَ میں عربی زبان کے اسلوب کے مطابق ان سے پہلے حروف جر محذوف ہے مطلب یہ ہے کہ اس خدائی کے گھمنڈ میں وہ جس وجہ سے مبتلا ہوا ہے کہ اللہ نے اس کو حکومت اور اقتدار بخشا ہوا تھا کہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمت پا کر وہ خدا کا شکر گزار اور فرمانبردار بنتا لیکن تنگ ظرفوں اور کم عقلوں کے لیے نعمت اکثر گمراہی کا باعث ہوتی ہے اور انہوں نے اسے شکر کی جگہ کفر کا سبب بنایا ہے جن لوگوں کو اقتدار حاصل ہو جاتا ہے جب وہ اس اقتدار کو اللہ کے فضل و کرم کی بجائے اپنے استحقاق علم اور اپنی تدبیر کا ثمرہ سمجھ بیٹھتے ہیں تو وہ اس بات کو بالکل بھول جاتا ہے کہ خدا یہ اقتدار بخش کر ان کا امتحان کر رہا ہے بلکہ وہ اشکبار میں مبتلا ہو کر خود اپنی خدائی کا تخت بچھانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے لیے تدبیر یہ اختیار کرتا ہے کہ خدا کے اوتار یا مطہر یا ظل اللہ کے روپ میں اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں چنانچہ دولت و نعمت اور اقتدار کا گھمنڈ ہمیشہ ضلالت کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب رہا ہے۔ بہت کم خوش قسمت ایسے نکلے ہیں جو اپنے آپ کو اس فتنہ سے بچا سکے ہیں، نمرود کے سوال کے جواب میں حضرت ابراہیم اپنے رب کی تعریف میں وہ بات کہی جو سب سے زیادہ واضح تھی یعنی میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے جو شخص بھی زندگی اور موت کے سوال پر غور کرتا ہے یہ سوال اس کو خدا کے ماننے پر مجبور کر دیتا ہے بشرطیکہ اس کے دماغ میں کوئی خلل نہ ہو لیکن نمرود کے ذہن میں اقتدار کا خناس سمایا ہوا تھا اس وجہ سے اس نے اس واضح حقیقت پر بھی یہ معارضہ کر دیا کہ موت اور زندگی پر تو میں بھی اختیار رکھتا ہوں جس کا چاہوں سر قلم

کر دوں جس کو چاہوں بخش دوں ظاہر ہے کہ یہ معارضہ ایک بالکل ہی احمقانہ معارضہ تھا اس لیے حضرت ابراہیم نے ایک بالکل دوسری بات فرمائی تھی حضرت ابراہیم چاہتے تو دونوں باتوں کے درمیان جو فرق تھا اس کو واضح کر دیتے لیکن انہوں نے محسوس کر لیا کہ ان کی واضح بات پر اس قسم کا احمقانہ معارضہ وہی کر سکتا ہے جو کٹ حجتی پر اتر آیا ہو اس وجہ سے انہوں نے اس کو مزید حجت کے لیے موقع دینا پسند نہ فرمایا۔[1]

انبیاء علیہم السلام مناظر نہیں داعی ہوتے ہیں:

اس وجہ سے انہوں نے خاص اس پہلو پر الجھنے کی بجائے اپنے رب کی ایک دوسری صفت بیان کر دی جس میں نمرود کے لیے کسی بحث کی راہ بالکل مسدود تھی انہوں نے فرمایا کہ "اچھا" اگر یہ بات ہے تو میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم ایک دن ذرا اسے مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔

حجت ابراہیمی کا یہ ایسا بھرپور وار تھا کہ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ یہاں بلاغت کا یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ حضرت ابراہیم نے خاص طور پر سورج کی تسخیر کا ذکر فرمایا جس کو نمرود کی نظر میں معبود اعظم کی حیثیت حاصل تھی اور وہ اپنے آپ کو اسی معبود اعظم کا مظہر بنائے ہوئے بیٹھا تھا۔

بہترین استدلال اور لطیف طنز کی کہ ایک نہایت خوب صورت مثال ہے۔

آخر میں فرمایا کہ "اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں بخشتا" اس میں ظالم لفظ خاص طور پر قابل غور ہے قرآن کی اصطلاح میں ظالم سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی نعمتوں اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو بے جا استعمال کرتے ہیں۔ جو اللہ کے انعامات کو اس کا فضل قرار دینے کی بجائے اپنا حق سمجھتے ہیں جو نعمتوں پر خدائے منعم کے شکر گزار ہونے کے بجائے غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہوتے ہیں امور ابلیس کی طرح اکڑتے ہیں جو خدا کی بندگی اور فرمانبرداری کی روش اختیار کرنے کی بجائے خود اپنی خدائی کے تخت بچھائے اور اپنے آپ کو رب ٹھہراتے ہیں فرمایا کہ جو لوگ اس ظلم میں مبتلا ہوتے ہیں ان پر ہدایت کی راہ نہیں کھلتی ایسے لوگوں کے سامنے حق جتنے ہی واضح طریقہ پر آئے وہ اس کو قبول کرنے کی بجائے بحث اور کٹ حجتی کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتے ہیں یہاں تک کہ اگر ان کو راہ ملتی نظر نہیں آتی تو وہ نمرود کی طرح ہکے بکے اور ششدر ہو کر رہ جاتے ہیں لیکن حق کو قبول پھر بھی نہیں کرتے۔[2]

"حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ مدلل گفتگو سن کر نہ صرف نمرود کے حمایتی بلکہ خود نمرود بھی حیران رہ گیا لیکن پھر بھی کفر اور ضلالت سے باز نہ آیا"۔[3]

---

(۱) تدبر قرآن، ۱/ ۵۹۹

(۲) تدبر قرآن، ۱/ ۶۰۰

(۳) تاریخ ابن کثیر، علامہ حافظ ابو الفداء عماد الدین ابن کثیر، ص ۱/ ۲۱۳، ۲۱۲

حضرت ابراہیم نے دشمن حق پر اس کا جاہل اور عاجز ہونا واضح کر دیا اور اسے لاجواب کر دیا اسی لیے اللہ نے فرمایا:

﴿فَبُهِتَ ٱلَّذِى كَفَرَ ۗ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّـٰلِمِينَ ﴿٢٥٨﴾﴾(١)

ترجمہ: یہ سن کر کافر ششدر رہ گیا اور اللہ بے انصافوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

مولانا امین احسن اپنی تفسیر میں غور و فکر اور تدبر کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں چنانچہ تفسیر ہذا میں بہترین استدلال اور ادب کی چاشنی بھی موجود ہے تفسیر میں جو داعیانہ انداز بیان ملتا ہے اس کے لئے عقلی استدلال اور مثالوں سے بات کو واضح کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انبیاء علیہ السلام مناظر نہیں بلکہ داعی ہوتے ہیں اس لئے وہ الجھنے کی بجائے اپنے رب کی صفات سے دعوت دیتے ہیں۔

---

(۱) سورۃ البقرۃ: ۲/ ۲۵۸

فصل چہارم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسالیب دعوت تفہیم القرآن کی روشنی میں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسالیب دعوت تفہیم القرآن کی روشنی میں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مشرک قوم کو کواکب پرستی کی غلطی سے آگاہ کرنا:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم ستارہ پرستی اور مظاہر پرستی میں اس قدر منہمک تھی کہ خدائے برتر کی قدرت مطلقہ اور اس کی احدیت وصمدیت کا تصور بھی ان کے دلوں میں باقی نہ رہا تھا۔ قوم ابراہیم علیہ السلام توحید سے دور اور شرک میں ڈوبی ہوئی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے بیزار تھے جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ ٱلَّيْلُ رَءَا كَوْكَبًا ۖ قَالَ هَٰذَا رَبِّى ۖ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَآ أُحِبُّ ٱلْءَافِلِينَ ﴾(۱)

ترجمہ: جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا کہا یہ میرا رب ہے مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں۔

﴿ فَلَمَّا رَءَا ٱلْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هَٰذَا رَبِّى ۖ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِى رَبِّى لَأَكُونَنَّ مِنَ ٱلْقَوْمِ ٱلضَّآلِّينَ ﴾(۲)

ترجمہ: پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ ہے میرا رب مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا۔

﴿ فَلَمَّا رَءَا ٱلشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَٰذَا رَبِّى هَٰذَآ أَكْبَرُ ۖ فَلَمَّآ أَفَلَتْ قَالَ يَٰقَوْمِ إِنِّى بَرِىٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ﴾(۳)

ترجمہ: پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیم پکار اٹھے اے برادران قوم! میں ان سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔

سید مودودی فرماتے ہیں کہ عصری تحقیقات کے نتائج اگر صحیح ہیں تو ان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم میں شرک محض ایک مذہبی عقیدے اور بت پرستانہ عبادات کا مجموعہ ہی نہ تھی بلکہ درحقیقت اس قوم کی پوری معاشی، تمدنی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کا نظام ہی اس عقیدے پر تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا اثر صرف بتوں کی

---

(۱) سورۃ الانعام:۶/ ۷۶

(۲) سورۃ الانعام:۶/ ۷۷

(۳) سورۃ الانعام:۶/ ۷۸

پرستش پر نہ تھا بلکہ ان کی دعوت کو قبول کرنے کے معنی یہ تھے کہ نیچے سے اوپر تک ساری سوسائٹی کی عمارت ادھیڑ ڈالی جائے اور اسے از سر نو "توحید الہ کی بنیاد پر تعمیر کیا جائے ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسی ابتدائی تفکر کی کیفیت بیان کی گئی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب ہوش سنبھالا تو ان کے گردوپیش چاند سورج اور ستاروں کی خدائی کے ڈنکے بج رہے تھے اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جستجو حقیقت کا آغاز اسی سوال سے ہونا چاہیے تھا کہ کیا ان میں سے کوئی رب ہو سکتا ہے؟ بالآخر وہ غور و فکر سے اس نتیجے پر پہنچے کہ ان میں سے کسی کے اندر ربوبیت کا شائبہ تک نہیں رب صرف وہ ہے جس نے انہیں پیدا کیا اس قصے کے الفاظ سے عام طور پر لوگوں کے ذہن میں یہ شبہ ہے کہ جب رات ہوتی ہے تب اس نے چاند دیکھا پھر تارا دیکھا پھر سورج دیکھا تو اس سے عام ناظر کے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ کیا اس سے پہلے انہوں نے سورج، چاند، ستاروں کو نہ دیکھا تھا؟ یہ شبہ بعض لوگوں کے لیے اس قدر ناقابل حل بن گیا کہ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش اور ان کی پرورش کے متعلق ایک غیر معمولی قصہ تصنیف کر لیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پرورش ایک غار میں ہوئی تھی جہاں وہ سورج، چاند ستاروں کے مشاہدے سے محروم رہ گئے تھے حالانکہ بات بالکل صاف ہے کہ نیوٹن کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے باغ میں درخت سے ایک سیب کو گرتے دیکھا تو اس کا ذہن اچانک اس سوال کی طرف متوجہ ہو گیا کہ اشیا آخر زمین پر کیوں گرا کرتی ہیں یہاں تک کہ وہ قانون جذب و کشش کے استنباط تک پہنچ گیا کیا نیوٹن نے کبھی کوئی چیز گرتے نہیں دیکھی تھی؟ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک چیز کو ہمیشہ دیکھتا رہتا ہے اور اس کے ذہن میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی مگر ایک وقت کسی چیز کو دیکھ کر ذہن میں یکایک ایک کھٹک پیدا ہو جاتی ہے جس سے فکر کی قوتیں ایک خاص سمت میں کام کرنے لگتی ہیں یا ذہن پہلے سے کسی سوال کی تحقیق میں الجھ رہا ہوتا ہے کہ اچانک کسی چیز پر نظر پڑتے ہی گتھی کا دوسرا سرا ہاتھ لگ جاتا ہے اور معاملہ سلجھ جاتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی روز راتیں آتی تھیں اور گزر جاتی تھیں لیکن وہ ایک خاص دن تھا جب ایک تارے کے مشاہدے نے ان کو اس راہ پر ڈال دیا جس سے بالآخر وہ توحید الہ کی مرکزی حقیقت تک پہنچ کر رہے۔(۱)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مشرک قوم کو آثار کائنات میں و فکر اور تدبر کرنے کی دعوت دی آپ نے ان معبودان باطلہ کی غیر حقیقی اور بے وقعت حالت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ جو چاند اور سورج کبھی طلوع ہوں اور کبھی چھپ جائیں وہ خالق اور مدبر نہیں ہو سکتے حصرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم چونکہ کواکب پرستی میں مبتلا تھی اس لیے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ آپ کے اس طرز عمل میں بھی داعیان توحید کے لیے شاندار اسوہ موجود ہے کہ جو شخص بھی کائنات میں غور و فکر کرے گا وہ کائنات کے رب کو پالے گا۔

---

(۱) تفہیم القرآن، ۱/ ۵۵۸

مودودی صاحب اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں ایک عام قاری کے ذہن میں پیدا ہونے والے وہم وشبہات کا بھرپور جواب دیتے ہیں اور نیوٹن کے کشش ثقل کے قانون کا حوالہ بہت خوبصورتی سے دیتے ہیں جس سے اعتراض کرنے والوں کے منہ بند ہو جاتے ہیں۔

مودودی نے اپنی تفسیر میں جابجا بے شمار سائنسی علوم کے حوالے سے مثالیں بیان کی ہیں تاکہ امت مسلمہ کے لئے ہی سائنسی معلومات کو قرآن کی روشنی میں دیکھنا ممکن ہو اور قاری یہ جان سکے کہ سائنس اپنی تمام تر ترقی کے باوجود قرآن کے تابع رہے گی اور یہ قرآن مجید کی تصدیق کرنے کا ذریعہ ثابت ہو گی اس لئے اسے بجا طور پر سائنسی تفسیر بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اعلان توحید:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب کائنات میں غور و فکر اور تدبر کیا تو انہوں نے خالق حقیقی کی وحدانیت کو پالیا۔

﴿ إِذْ قَالَ لَهُۥ رَبُّهُۥٓ أَسْلِمْ ۖ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴾(۱)

ترجمہ: اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا مسلم ہو جا تو اس نے فوراً کہا میں مالک کائنات کا مسلم ہو گیا۔

مودودی اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اعلان توحید کو بیان کرتے ہوئے لفظ "مسلم" کی جامع وضاحت کرتے ہیں کہ کیا مسلم وہ ہے جو خدا کے آگے سر اطاعت خم کر دے خدا ہی کو اپنا مالک اپنا آقا اور معبود جان لے جو اپنے آپ کو بالکل خدا کے سپرد کر دے اور اس ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرے جو خدا کی طرف سے آتی ہو اور اس طرز عمل کا نام اسلام ہے اور یہی انبیاء کا دین تھا جو ابتدائے آفرینش سے دنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں میں آئے۔

داعیان کرام کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کو توحید کی دعوت دینے سے پہلے خود توحید کو دل سے جانے اور اپنی زندگی کے تمام معاملات عقیدہ توحید کی روشنی میں انجام دیں۔

مشفق جد الانبیاء کا اپنے باپ کو دعوت توحید دینا احترام و شفقت کے ساتھ:

رحم دلی، نرمی اور شفقت ایک داعی کی بنیادی اور اہم ترین صفات ہیں۔ اگر داعی حضرات سخت اور درشت زبان استعمال کرنے والے ہوں ایسی صورت میں لوگ اسلام سے متنفر ہو جاتے ہیں اور مزید دور ہو جاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہایت نرم مزاج داعی، رحم دل بیٹے اور مشفق باپ تھے آپ جب اپنے والد کو دعوت توحید دیتے تو نہایت احترام اور شفقت کے ساتھ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

﴿ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَٰٓأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِى عَنكَ شَيْـًٔا ﴾(۲)

---

(۱) سورۃ بقرۃ: ۲/ ۱۳۱

(۲) سورۃ مریم: ۱۹/ ۴۲

ترجمہ: انہیں ذرا اس موقع کی یاد دلاؤ جب کہ اس نے اپنے باپ سے کہا ابا جان آپ کیوں ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتی ہے نہ دیکھتی ہے اور نہ آپ کے کام کو بنا سکتی ہے مزید فرمایا:

﴿يَـٰٓأَبَتِ إِنِّى قَدْ جَآءَنِى مِنَ ٱلْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَٱتَّبِعْنِىٓ أَهْدِكَ صِرَٰطًا سَوِيًّا﴾ (۱)

ترجمہ: ابا جان میرے پاس ایک ایسا علم ایک ہے جو آپ کے پاس نہیں آپ میرے پیچھے چلیں میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا ابا جان آپ شیطان کی بندگی نہ کریں شیطان تو رحمان کا نافرمان ہے۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ آپ آیت مبارکہ میں "لا تعبد الشیطن "یعنی شیطان کی عبادت نہ کریں اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد اور قوم کے دوسرے لوگ عبادت بتوں کی کرتے تھے لیکن چونکہ اطاعت وہ شیطان کی کر رہے تھے اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی اس اطاعت شیطان کو بھی عبادت شیطان قرار دیا اس سے معلوم ہوا کہ عبادت محض پوجا اور پرستش کا نام نہیں بلکہ اطاعت کا نام بھی ہے نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی پر لعنت کرتے ہوئے بھی اسکی بندگی بجالائے تو وہ اس کی عبادت کا مجرم ہے کیونکہ شیطان بہر حال اسی زمانے میں بھی لوگوں کا معبود نہیں رہا ہے بلکہ اس کے نام پر ہر زمانے میں لوگ لعنت بھیجتے رہے ہیں۔(۲)

ان آیات مبارکہ میں "یَاابَتِ" کے طرز خطاب پر غور کریں میرے بابا جان۔ میرے باپ یا میرے ابا جان ان الفاظ میں کس قدر احترام و انسیت پائی جاتی ہے۔ حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جانتے بھی ہیں کہ باپ مشرک ہے۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام اس طرح کا محبت اور شفقت بھرا انداز مخاطب استعمال نہ کرتے تو ان کے والد ان کی طرف متوجہ ہی نہ ہوتے۔

"حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعوت میں جذبہ ایمانی سے پہلے شفقت پدری کے خوابیدہ تاروں کو چھیڑا اور یہ دیکھا گیا ہے کہ بسا اوقات محبت ایمان سے پہلے دل میں گھر کرتی ہے ایسا بھی ممکن ہے کہ ایک شخص شفیق باپ تو ہو مگر مومن نہ ہو۔ اس کی شفقت کا سوتا جاری ہے اور ایمان کا سوتا خشک ہے۔ لہذا اگر اس کو دعوت دینا ہے تو اس دروازے سے داخل ہونا ہو گا جو کھلا ہے۔ ایک داعی و مبلغ جسے "حکمت" کی نعمت ملی ہے کبھی اس پہلو کو نظر انداز کرے گا تو خود اپنی ذات کو بھی نقصان پہنچائے گا اور دعوت و تبلیغ کو بھی۔ داعی و مبلغ اگر درشت مزاج ہو تو کامیاب نہیں ہو سکتا"۔(۳)

---

(۱) سورۃ مریم:۱۹/۴۳

(۲) تفہیم القرآن، ۳/۷۰

(۳) تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب، سید ابو الحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد، کراچی، ص۲۸، ۲۹

مشرکین کے لیے دعائے مغفرت کی ممانعت:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ ان کا باپ بتوں کی پرستش سے باز نہیں آرہا بلکہ اس نے الٹا آپ کو سنگسار کرنے کی دھمکی دی تو آپ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ قَالَ سَلَٰمٌ عَلَيۡكَۖ سَأَسۡتَغۡفِرُ لَكَ رَبِّيٓۖ إِنَّهُۥ كَانَ بِي حَفِيّٗا ﴾[1]

ترجمہ: ابراہیم نے سلام علیکم کہا(اور کہا کہ) میں آپ کے لیے اپنے پروردگار سے بخشش مانگوں گا بے شک وہ مجھ پر نہایت مہربان ہے۔

جبکہ سورۃ توبہ میں اس کو یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿ وَمَا كَانَ ٱسۡتِغۡفَارُ إِبۡرَٰهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوۡعِدَةٖ وَعَدَهَآ إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُۥٓ أَنَّهُۥ عَدُوّٞ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنۡهُۚ إِنَّ إِبۡرَٰهِيمَ لَأَوَّٰهٌ حَلِيمٞ ﴾[2]

ترجمہ: ابراہیم نے اپنے باپ کے لیے جو دعائے مغفرت کی تھی وہ تو اس وعدے کی وجہ سے تھی جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا، مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا حق یہ ہے کہ ابراہیم بڑا رقیق القلب اور خدا ترس اور بردبار آدمی تھا۔

ان آیات مبارکہ سے پہلے والی آیات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ نبی کو اور ایمان والوں کو زیب نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کرے چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں ان میں یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ جو شخص کھلا ہوا باغی ہو اس کے ساتھ ہمدردی اور محبت رکھنا اور اس کے جرم کو قابل معافی سمجھنا نہ صرف یہ کہ اصولاً غلط ہے بلکہ اس سے خود اپنی وفاداری مشتبہ ہو جاتی ہے اگر ہم محض اس بنا پر کہ وہ ہمارا رشتہ دار ہے یہ چاہیں کہ اسے معاف کر دیا جائے تو اس کے معانی یہ ہیں کہ ہمارے نزدیک رشتہ داری کا تعلق خدا کی وفاداری کی نسبت زیادہ قیمتی ہے اور یہ کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری محبت بے لاگ نہیں ہے؟[3]

اصل میں یہاں اشارہ ہے اس بات کی طرف جو اپنے مشرک باپ سے تعلقات منقطع کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہی تھی:

---

(۱)سورۃ مریم:۱۹/ ۴۷

(۲)سورۃ توبہ:۹/ ۱۱۴

(۳) تفہیم القرآن ۲/ ۱۶۶

﴿قَالَ سَلَٰمٌ عَلَيۡكَۖ سَأَسۡتَغۡفِرُ لَكَ رَبِّيٓۖ إِنَّهُۥ كَانَ بِي حَفِيّٗا﴾[1]

ترجمہ: آپ کو سلام ہے میں آپ کے لیے اپنے رب سے دعا کروں گا کہ وہ آپ کو معاف کر دے وہ میرے اوپر نہایت مہربان ہے۔

یہ دعا اول تو انتہائی محتاط لہجے میں تھی مگر اس کے بعد جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نظر گئی کہ میں جس شخص کے لیے دعا کر رہا ہوں وہ تو کھلم کھلا خدا کا باغی تھا اور اس کے دین سے سخت دشمنی رکھتا تھا تو وہ اس سے بھی باز آ گئے اور ایک سچے وفادار مومن کی طرح انہوں نے باغی کی ہمدردی سے تبری کر دی۔ متن میں "حلیم" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں "اواہ" کے معنی ہیں آہیں بھرنے والا اور بہت آہیں بھرنے والا زاری کرنے والا ڈرنے والا اور حسرت کرنے والا اور "حلیم" اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مزاج پر قابو رکھتا ہو نہ غصے اور دشمنی اور مخالفت میں آپے سے باہر نہ ہو اور نہ محبت اور دوستی اور تعلق کی خاطر میں حد اعتدال سے تجاوز کر جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے دعا مغفرت کی کیونکہ وہ نہایت رقیق القلب آدمی تھے اس خیال سے کانپ اٹھے کہ میرا یہ باپ جہنم کا ایندھن بن جائے گا اور حکیم تھے اور اس ظلم و ستم کے باوجود ان کی زبان اس کے حق میں دعا ہی کے لیے کھلی۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ان کا باپ خدا کا دشمن ہے تو اس سے تبری کی کیونکہ وہ خدا سے ڈرنے والے انسان تھے اور کسی کی محبت میں حد سے تجاوز کرنے والے نہ تھے۔[2]

داعی حضرات کا کام دعوت و تبلیغ اور حق کو پہنچا دینا ہوتا ہے تاہم مشرکین سے علیحدگی کا حکم ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس عمل کو شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں قانون کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چچا کے لیے دعائے مغفرت کے لیے منع فرما کے تمام مشرکین کے لیے دعائے مغفرت سے روک دیا البتہ ان کی زندگی میں ہدایت کی دعا کی جا سکتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے اسلوب سے داعیان کرام کو یہ سبق ملتا ہے کہ انہیں مشرکین میں دعوت و تبلیغ کے بعد بھی اگر اصلاح احوال کا راستہ نظر نہ آئے تو ان سے علیحدگی اختیار کر لیں اور مشرکین کے لئے دعائے مغفرت سے بھی اجتناب کریں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کو دعوت توحید مکالمہ کے انداز میں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو ہر طرح سے دعوت توحید دی لیکن ان کی قوم نے ان کی ایک نہ مانی قرآن پاک میں سورۃ الشعراء۔ سورۃ انبیاء، سورۃ العنکبوت، سورۃ ابراہیم، سورۃ الحجر، سورۃ انعام، سورۃ الذاریات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت اور ان کی قوم کی نافرمانی کو بیان کیا گیا ہے:

---

(۱) سورۃ مریم: ۱۹/ ۴۷

(۲) تفہیم القرآن ۳/ ۲۴۸

﴿ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِۦ مَا تَعْبُدُونَ ﴾[١]

ترجمہ: اور انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ سناؤ جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا تھا کہ یہ کیا چیزیں ہیں جن کو تم پوجتے ہو۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کا مدعا یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں کیونکہ ان بتوں کو وہ خود بھی دیکھ رہے تھے جن کی پرستش وہاں ہوتی تھی ان کا مدعا دراصل ان لوگوں کو اس طرح متوجہ کرنا تھا کہ ان معبودوں کی حقیقت کیا ہے جن کے آگے وہ سجدہ ریز ہوتے ہیں اسی سوال کو سورۃ الانبیاء میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے "یہ کیسی مورتیں ہیں جن کے تم گرویدہ ہو رہے ہو"۔

﴿ قَالُوا۟ نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَٰكِفِينَ ﴾[٢]

ترجمہ: انہوں نے جواب دیا کچھ بت ہیں جن کی ہم پوجا کرتے ہیں اور ان کی سیوا میں ہم لگے رہتے ہیں۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ قوم کا یہ جواب بھی محض خبر دینے کے لیے نہ تھا کہ ہم بتوں کی پوجا کرتے ہیں کیونکہ سائل و مسول دونوں کے سامنے یہ امر واقعہ عیاں تھا۔ اس جواب کی اصل روح اپنے عقیدے پر ان کا ثبات اور اطمینان تھا گویا دراصل وہ کہہ رہے تھے کہ ہم بھی جانتے ہیں کہ یہ لکڑی اور پتھر کے بت ہیں جن کی ہم پوجا کرتے ہیں۔ ہمارا دین یہی ہے کہ ہم ان کی خدمت میں لگے رہیں۔

﴿ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ o أَوْ يَنفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ﴾[٣]

ترجمہ: حضرت ابراہیم نے کہا کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انہیں پکارتے ہو؟؟ یا یہ تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟؟

﴿ قَالُوا۟ بَلْ وَجَدْنَآ ءَابَآءَنَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ ﴾[٤]

ترجمہ: انہوں نے جواب دیا "نہیں بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا کرتے پایا ہے۔"

مودودی صاحب آیات مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ قوم ابراہیم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوالات کے جواب میں کہا کہ ہماری اس عبادت کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ ہماری مناجاتیں اور دعائیں اور فریادیں سنتے ہیں یا ہمیں نفع اور

---

(۱) سورۃ الشعراء: ۲۶/ ۷۰

(۲) سورۃ الشعراء: ۲۶/ ۷۱

(۳) سورۃ الشعراء: ۲۶/ ۷۲، ۷۳

(۴) سورۃ الشعراء: ۲۶/ ۷۴

نقصان پہنچاتے ہیں اس لیے ہم نے ان کو پوجنا شروع کر دیا ہے بلکہ اصل وجہ اس عبادت کی یہ ہے کہ باپ دادا کے وقتوں سے یوں ہی ہوتا چلا آرہا ہے اسی طرح انہوں نے خود یہ اعتراف کر لیا کہ ان کے مذہب کے لیے باپ دادا کی اندھی تقلید کے سوا کوئی مقصد نہیں ہے دوسرے الفاظ میں گویا یہ کہہ رہے تھے کہ آخر تم نئی بات ہمیں کیا بتانے چلے ہو؟ ہم جانتے ہیں کہ یہ پتھر لکڑی کے بت کسی کام کے بگاڑنے یا سنوارنے کے لیے نہیں ہیں لیکن ہمارے جو بزرگ صدیوں سے ان کی پوجا کرتے چلے آ رہے ہیں تو کیا وہ سب تمہارے نزدیک بیوقوف تھے؟ ضرور کوئی وجہ ہو گی کہ ان بے جان مورتیوں کی پوجا کرتے رہے ہیں ہم بھی ان کے اعتماد پر کام کر رہے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿قَالَ أَفَرَءَيْتُم مَّا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ ﴾(1)

ترجمہ: اس پر حضرت ابراہیم نے کہا، کیا کبھی تم نے (آنکھیں کھول کر) ان چیزوں کو دیکھا جن کی بندگی تم اور تمہارے باپ دادا بجالاتے رہے؟

مودودی آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ کیا ایک مذہب کی صداقت کے لیے بس یہ دلیل کافی ہے کہ وہ باپ دادا کے وقتوں سے چلا آرہا ہے؟ کیا نسل پر نسل یوں ہی آنکھیں بند کر کے مکھی پر مکھی مارتی چلی جائے اور کوئی آنکھیں کھول کر نہ دیکھے کہ جن کی بندگی ہم بجالاتے رہیں ہیں کہ ان کے اندر کوئی خدائی صفت پائی جاتی ہے؟ یا نہیں اور وہ ہماری قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کے کچھ اختیار رکھتے ہیں بھی یا نہیں؟

﴿فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيٓ إِلَّا رَبَّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴾(2)

ترجمہ: میرے تو یہ سب دشمن ہیں بجز ایک رب العالمین کے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا مجھے یہ نظر آتا ہے کہ اگر میں پرستش کروں گا تو میری دنیا اور آخرت برباد ہو جائے گی اس لیے میرے نزدیک ان کو پوجنا دشمن کو پوجنا ہے۔

یہاں حکمت و تبلیغ کا ایک نکتہ قابل توجہ ہے کہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ تمہارے دشمن ہیں بلکہ یہ فرمایا کو وہ میرے دشمن ہیں اگر وہ کہتے کہ تمہارا دشمن ہے تو مخاطب کے لیے ضد میں مبتلا ہو جانے کا زیادہ موقع تھا وہ اس بحث میں پڑ جاتا کہ بتاؤ وہ ہمارے دشمن کیسے ہو گئے بخلاف اس کے جو انہوں نے کہا کہ وہ میرے دشمن ہیں تو اس سے مخاطب کے لیے یہ سوچنے کا موقع پیدا ہو گیا کہ وہ بھی اسی

---

(۱) سورۃ الشعراء: ۲۶/ ۷۵

(۲) سورۃ الشعراء: ۲۶/ ۷۷

طرح اپنے بھلے اور برے کی فکر کرے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی ہے۔ اس طریقے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام گویا ہر انسان کے اس فطری جذبے سے اپیل کی ہے جس کی بنا پر وہ خود اپنا خیر خواہ ہوتا ہے اور جان بوجھ کر بھی اپنا برا نہیں چاہتا انہوں نے اسے بتایا کہ میں تو ان کی عبادت مین سراسر نقصان دیکھتا ہوں اور دیدہ و دانستہ اپنی بدخواہی نہیں کر سکتا لہٰذا دیکھ لو کہ میں خود ان کی بندگی و پرستش سے قطعی اجتناب کرتا ہوں اس کے بعد مخاطب فطرتاً یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اس کی بھلائی کس چیز میں ہے اور کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ نادانستہ اپنی بدخواہی کرتا رہا ہو۔[۱]

مودودی صاحب نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان ہونے والی بات چیت کو انسانی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے بیان کیا ہے۔ دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرنے والے داعیان کرام کو بھی ہمیشہ انسانی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا کام کرنا چاہیے تاکہ مخاطب پر سکون ہو کر ان کی بات سن اور سمجھ سکے۔ ان کے تفسیری نکات اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ اس ماہر نفسیات کی طرح جدید فکر سے متاثر اذہان کے ذہنی اشکالات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ مولانا مودودی کے اسلوب تفسیر کی نمایاں خصوصیت قرآنی قصص سے استدلال کا خصوصی اہتمام ہے اس کے علاوہ مودودی بیک وقت ایک داعی بھی تھے ایک مفسر بھی اور انسانی نفسیات کا گہرا علم بھی رکھتے تھے لہٰذا انہوں نے تفسیر میں انسانی نفسیات کو اجاگر کیا ہے۔

غیر اللہ کی بے بسی کو عملی طور پر ثابت کرنا:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر اور قوم کو بت پرستی سے روکنے کے لیے جب اپنی تمام قوت صرف کر دی تو آپ نے ایک خفیہ تدبیر کی۔ قوم اپنے مذہبی میلے میں جا رہی تھی تو آپ علیہ السلام نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تاکہ آپ بت پرست قوم پر بتوں کی بے بسی واضح کر سکیں، قرآن پاک میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا گیا ہے،

﴿وَتَاللَّهِ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُم بَعْدَ أَن تُوَلُّوا مُدْبِرِينَ﴾[۲]

ترجمہ: اور خدا کی قسم! میں تمہاری غیر موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کی خبر لوں گا۔

علامہ مودودی فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم استدلال سے بات نہیں سمجھتے ہو تو میں تمہیں عملاً مشاہدہ کرادوں گا کہ یہ بے بس ہیں ان کے پاس کچھ اختیارات نہیں ہیں اور ان کو خدا بنانا غلط ہے رہی یہ بات کہ عملی تجربے اور مشاہدے سے یہ بات وہ کس طرح ثابت کریں گے تو اس کی تفصیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس موقع پر نہیں بتائی۔[۳]

---

(۱) تفہیم القرآن، ۳۳/۵۰۲

(۲) سورۃ الانبیاء: ۲۱/۵۷

(۳) تفہیم القران، ۳/۱۶۵

﴿فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا إِلَّا كَبِيرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ﴾[1]

ترجمہ: چنانچہ اس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور صرف ان کے بڑے بت کو چھوڑ دیا تاکہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے بت خانے میں آئے اور تمام بتوں کو توڑ دیا صرف بڑے بت کو چھوڑ دیا کہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ مودودی صاحب کہتے ہیں کہ یہاں "اس کی طرف کا اشارہ بڑے بت کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف بھی۔ اگر پہلی بات ہو تو یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے ان کے عقائد پر طنز کا ایک ہم معنی ہے۔ یعنی اگر ان کے نزدیک واقعی یہ خدا ہیں تو انہیں اپنے بڑے خدا کے متعلق یہ شبہ ہونا چاہیے کہ شاید بڑے حضرت ان چھوٹے حضرات سے کسی بات پر بگڑ گئے ہوں اور سب کا کچومر بناڈالا ہو یا پھر بڑے حضرت سے پوچھیں کہ حضور! آپ کی موجودگی میں کیا ہوا؟ کون یہ کام کر گیا اور آپ نے اسے روکا کیوں نہیں؟ اور اگر دوسرا مفہوم مراد لیا جائے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا منشا اس کاروائی سے یہ تھا کہ اپنے بتوں کا یہ حال دیکھ کر شاید ان کا ذہن میری طرف بھی منتقل ہو گا اور یہ مجھ سے پوچھیں گے تو پھر مجھ کو ان سے صاف بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔

اور یہ حضرت ابراہیم کی منہ مانگی مراد تھی کہ تمام لوگ بتوں کی بے بسی کا حال دیکھیں اور جان لیں کہ جن بتوں کو انہوں نے اپنے لیے قاضی الحاجات بنا رکھا ہے وہ خود کتنے بے بس ہیں۔[2]

ان آیات کی تفسیر میں مودودی صاحب انتہائی عام فہم انداز اختیار کرتے ہوئے بتوں کی بے بسی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کی جاہلیت پر طنز کرتے ہیں: کہ کیا معلوم بڑے بت جو موجود ہیں یہ ان چھوٹوں پر بگڑ گئے ہوں اور ان کا کچومر کر ڈالا ہو۔ گویا تفسیر میں ایسا انداز اختیار کیا گیا ہے کہ جس سے قاری کو بوریت محسوس نہیں ہوتی بلکہ لطیف طنز و مزاح کی چاشنی محسوس ہوتی ہے۔ تفہیم القرآن کے بارے میں یہ تجزیہ بالکل درست ہے کہ یہ اردو زبان کی عام فہم تفسیر ہے جو قرآن فہمی کا سب سے آسان ذریعہ ہے اور ترجمے کے نیچے تفسیر کی صورت میں آپ کو اتنی جاندار عبارات ملتی ہے کہ قاری مزید آگے پڑھنا چاہتا ہے۔

صبر واستقامت دعوت و تبلیغ میں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ساری زندگی صبر و استقامت کا اعلی نمونہ تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو دعوت حق دی تو انہوں نے آپ علیہ السلام کو سخت برا بھلا کہا لیکن آپ نے ہر موقعے پر صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا اور خدا کی

(۱) سورۃ الانبیاء:۲۱/ ۵۸

(۲) تفہیم لقرآن، ۳/ ۱۶۶

عبادت پر ڈٹے رہے۔ آپ کو نمرود نے آگ میں جلانے کا فیصلہ کیا لیکن آپ کے پایہ استقلال میں لغزش نہ آئی۔ اور آپ کی قوم نے بھی اس کی حمایت کی۔ کیونکہ وہ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دلائل کے سامنے لاجواب ہو چکے تھے۔

﴿فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِۦٓ إِلَّآ أَن قَالُواْ ٱقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ فَأَنجَىٰهُ ٱللَّهُ مِنَ ٱلنَّارِ ۚ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾[1]

ترجمہ: پھر جب اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا تو انہوں نے کہا قتل کر دو اسے یا جلا ڈالو اس کو آخر کار اللہ نے اسے آگ سے بچا لیا۔

آیات مبارکہ کی تفسیر میں مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معقول دلائل کا جواب ان کی قوم کے پاس نہ تھا اور ان کا جواب اگر تھا تو یہ کہ کاٹ دو اس زبان کو جو حق بات کہتی ہے اور جینے نہ دو اس شخص کو جو ہماری غلطی ہم پر واضح کرتا ہے اور ہمیں اس سے باز آنے کے لیے کہتا ہے "قتل کر دو یا جلا ڈالو" کے الفاظ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ پورا مجمع اس بات پر متفق تھا کہ حضرت ابراہیم کو ہلاک کر دیا جائے البتہ ہلاک کرنے کے طریقے میں اختلاف تھا کہ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ قتل کیا جائے اور کچھ کی رائے تھی کہ زندہ جلا دیا جائے تاکہ ہر اس شخص کو عبرت حاصل ہو جسے آئندہ کبھی ہماری سر زمین میں حق گوئی کا جنون لاحق ہو۔[2]

پھر آخر کار وہ آگ میں پھینک دیئے گئے مگر اللہ کے حکم سے آگ ٹھنڈی ہو گئی۔

ضیاء القرآن میں پیر محمد کرم شاہ صاحب اس کو یوں بیان کرتے ہیں"

جب دلائل ابراہیمی کے سامنے زچ ہو گئے تو نمرود اور اس کی قوم تشدد پر اتر آئے جو اہل باطل کا ہمیشہ سے دستور ہے۔ تجویز ہوئی کے آگ جلاؤ وہ خوب بھڑکے تو ابراہیم کو اس میں پھینک دو۔ آگ بھون کر خاکستر کر دے گی اور ایسے گستاخ کی اس سے کم اور کوئی سزا نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ کئی روز تک ایندھن اکٹھا ہوتا رہا۔ لوگوں نے ایندھن فراہم کرنے میں اپنے مذہبی جوش کا مظاہرہ کیا وہ نذریں مانتے تھے کے میرا یہ کام ہو گیا تو میں اتنے گٹھے لکڑیوں کے لے آوں گا آخر آگ جلائی گئی جب اس کے شعلے خوب بھڑک اٹھے اور دہکتے ہوئے انگاروں کی تمازت سے پرندے بھی دور بھاگنے لگے تو ان کو یہ مشکل پیدا ہوئی کہ ابراہیم کو آگ میں کس طرح پھینکا جائے۔ چنانچہ آپ کو منجنیق میں رکھا جانے لگا تو عالم بالا میں قیامت برپا ہو گئی۔

"الٰہی اس بھری دنیا میں صرف ابراہیم ہے جو تیرا نام لیتا ہے اسے یوں دست و بازو باندھ کر آتش کدہ میں پھینکا جا رہا ہے الٰہی اگر یہ شمع بجھ گئی تو دنیا تاریک ہو جائے گی پھر لا الہ الا اللہ کی صدائے دلنواز کون بلند کرے گا بارگاہ الٰہی سے فرشتوں کو

---

(۱) سورۃ العنکبوت:۲۹/ ۲۴

(۲) تفہیم القرآن، ۳/ ۶۹۱

اذن ملا جاؤ ابراہیم کی جو امداد تم کر سکتے ہو کرو جب ہوا اور بارش کے ملائکہ نے حاضر ہو کر اپنی خدمات پیش کیں تو آپ نے بڑے استغناء سے فرمادیا مجھے ان خدمات کی ضرورت نہیں "مجھے میرا خدا کافی ہے" جب منجنیق گھما کر آپ کو پھینکا جانے لگا تو جبریئل نے عرض کی میں حاضر ہوں کوئی حکم کوئی ارشاد؟ حضرت ابراہیم نے جواب دیا "اما الیک فلا" اے جبریل! مجھے تیری اعانت کی ضرورت نہیں۔ جبریل نے پھر کہا "خلیل! اپنے رب جلیل سے اپنے بچاؤ کی دعا تو مانگو" اس پر اس پیکر تسلیم ورضا نے جواب دیا "حسبی من سوالی علمه بحالی" جب وہ میرے حال کو جانتا ہے تو مجھے عرض کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

چنانچہ اس کی قضا کے سامنے ابراہیم نے پورے صبر و استقامت کے ساتھ اپنا سر جھکا دیا پھر آپ کو اس آتش کدے میں پھینکا گیا ادھر دہکتے ہوئے انگاروں اور بھڑکتے شعلوں کو حکم ملا۔ اے آگ! ابراہیم کے لیے ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی کا باعث بن جا۔ ابراہیم آکر آگ میں گرے تو وہاں گرمی کا نام و نشان نہ تھا بلکہ وہاں ٹھنڈک بھی اتنی جو باعث راحت وآرام ہو۔(۱)

دین حق بھی اپنے داعیوں سے اسی طرح مسلسل اور متواتر صبر و استقامت کا طلب گار ہے اور یہی صبر و استقامت ابراہیمی داعیان کرام کے لیے مشعل راہ ہے۔ یہی صبر کا اسلوب ہے جو داعی حضرات کو مایوسی سے بچاتا ہے یہی وہ اسلوب ہے جو حضرت نوحؑ نے ساڑھے نو سو سال تک اختیار کیا اور یہی وہ صبر ہے جو آقا دو جہاں سرور عالم ﷺ نے کیا اور نتیجے میں آپ ﷺ کی دعوت کو تیئس سال کی مختصر مدت میں وہ کامیابی حاصل ہوئی ہے جس پر ایک عالم انگشت بدانداں ہے دور حاضر کے داعیان کرام کے لئے یہی صبر کامیابی کی دلیل ہے جبکہ مایوسی جلد بازی ناکامی کا پہلا زینہ ہے۔

دربار نمرود میں حضرت ابراہیم کا پر تاثیر دلائل وبراہین سے حق کو واضح کرنا:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جھوٹے مدعیان ربوبیت اور قوم کے ساتھ مناظروں میں منطقیانہ گفتگو اور فلسفانہ دلائل سے گریز کرتے ہوئے پر زور حسی اور مشاہداتی دلائل کے ساتھ حق کو واضح کیا، قرآں پاک نے اس کو یوں بیان کیا ہے

﴿ أَلَمْ تَرَ إِلَى ٱلَّذِى حَآجَّ إِبْرَٰهِـۧمَ فِى رَبِّهِۦٓ أَنْ ءَاتَىٰهُ ٱللَّهُ ٱلْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَٰهِـۧمُ رَبِّىَ ٱلَّذِى يُحْىِۦ وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا۠ أُحْىِۦ وَأُمِيتُ ۖ قَالَ إِبْرَٰهِـۧمُ فَإِنَّ ٱللَّهَ يَأْتِى بِٱلشَّمْسِ مِنَ ٱلْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ ٱلْمَغْرِبِ فَبُهِتَ ٱلَّذِى كَفَرَ ۗ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٢٥٨﴾ ﴾(۲)

(۱) ضیاء القرآن، پیر محمد کرم شاہ، بختیار پرنٹرز، لاہور ۳/ ۱۷۵، ۱۷۶

(۲) سورۃ البقرۃ: ۲/ ۲۵۸

ترجمہ: کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا تھا؟ جھگڑا اس بات پر کہ ابراہیم کا رب کون ہے؟ اور اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا "زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے" ابراہیم نے کہا اچھا اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا، یہ سن کر وہ منکر ششدر رہ گیا مگر اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھایا کرتا۔

تفہیم القرآن کے مطابق یہاں اس شخص سے مراد "نمرود" ہے۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وطن (عراق) کا بھی بادشاہ تھا۔ جس واقعے کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے اس کی طرف کوئی اشارہ بائبل میں نہیں ہے مگر تلمود میں یہ پورا واقعہ موجود ہے اور بڑی حد تک قرآن کے مطابق ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ ابراہیم کا باپ نمرود کے ہاں سب سے بڑے عہدے دار کا منصب رکھتا تھا حضرت ابراہیم نے جب کھلم کھلا شرک کی مخالفت کی اور توحید کی تبلیغ شروع کی اور بتوں کو توڑ ڈالا تو ان کے باپ نے خود ان کا مقدمہ بادشاہ کے دربار میں پیش کیا اور پھر یہ گفتگو ہوئی۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اس جھگڑے میں جو بات باعث نزاع تھی وہ یہ تھی کہ ابراہیم علیہ السلام اپنا رب کس کو مانتے ہیں اور یہ نزاع اس وجہ سے پیدا ہوا تھا کہ اس جھگڑنے والے شخص یعنی نمرود کو خدا نے حکومت عطا کر رکھی تھی۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ قدیم ترین زمانے سے آج تک تمام مشرک سوسائٹیوں کی یہ مشترک خصوصیت رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو رب الارباب اور خدائے خدائگان کی حیثیت دیتے ہیں مگر اسی رب کو تنہا خدا اور معبود نہیں مانتے۔

خدائی کو مشرکین نے ہمیشہ دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک فوق الفطری خدائی جو سلسلہ اسباب پر حکمران ہے اور جسکی طرف انسان اپنی حاجات کے لیے رجوع کرتا ہے اس خدائی میں وہ فرشتوں، جنوں سیاروں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں۔

دوسری خدائی تمدنی اور سیاسی معاملات کی خدائی ہے جو قوانین فطرت وحیات مقرر کرنے کی مجاز ہے اس میں شاہی خاندانوں مذہبی پروہتوں کو شامل کیا جاتا ہے اکثر شاہی خاندان اس دوسرے معنی میں خدائی کے مدعی ہوتے ہیں۔

نمرود کا دعوی خدائی بھی اسی دوسری قسم کا تھا کہ وہ الہٰ نہیں ہے بلکہ اس کا دعوی اس امر کا تھا کہ اس ملک عراق کا اور اس کے باشندوں کا حاکم مطلق میں ہوں میری زبان قانون ہے۔ میرے اوپر کوئی بالاتر اقتدار نہیں جس کے سامنے وہ جواب دے ہو اور عراق کا وہ باشندہ باغی اور غدار ہے جو اس حیثیت سے مجھے اپنا رب نہ مانے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میں صرف ایک رب العالمین کو خدا اور معبود مانتا ہوں اور اس کے سوا سب کی خدائی اور ربوبیت کا قطعی طور پر منکر ہوں، چنانچہ آپ کے اس عقیدے کی ریاست اور اس کے مرکزی اقتدار پر زد پڑتی تھی اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام جرم بغاوت کے الزام میں نمرود کے سامنے پیش کیے گئے۔ اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلے فقرے سے ہی یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ رب اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تاہم نمرود اس کا جواب ڈھٹائی سے دے گیا کہ زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ کہا اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے ذرا مغرب سے نکال لا۔ تو نمرود کے لیے مزید کچھ

کہنا مشکل ہو گیا وہ خود بھی جانتا تھا کہ آفتاب وماہتاب اسی خدا کے زیر فرمان ہیں جس کو ابراہیم علیہ السلام نے رب مانا ہے۔ پھر وہ کہتا تو آخر کیا کہتا؟ مگر اس طرح جو حقیقت اس کے سامنے بے نقاب ہو رہی تھی اس کو تسلیم کر لینے کے معنی اپنی مطلق العنانی فرماں روائی سے دست بردار ہو جانے کے تھے جس کے لیے اس کے نفس کا طاغوت تیار نہ تھالہذا وہ ششدر رہ کر رہ گیا۔ خود پرستی کی تاریکی سے نکل کر حق کی روشنی کی طرف نہ آیا۔ اگر اس نے طاغوت کی بجائے خدا کو اپنا مالک مددگار بنایا ہوتا تو اس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ کے بعد راہ راست کھل جاتی۔ اس کے بعد بادشاہ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام قید کر دیے گئے۔ دس دن وہ جیل میں رہے جہاں بادشاہ کی کونسل نے ان کو زندہ جلانے کا فیصلہ کیا۔ (۱)

حضرت ابراہیم نے نہایت پر تاثیر دلائل کے ساتھ نمرود سے مناظرہ کیا اور کسی مقام پر بھی آپ علیہ السلام نے اشتعال انگیزی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ایسے دلائل و براہین پیش کیے کہ خود نمرود لاجواب ہو گیا۔ حضرات داعیان کرام کو بھی حضرت ابراہیم علیہ الاسلام کی طرح ایسے دلائل وبراہین پیش کرنے چاہیں جو دشمن اور باطل پرست کے قلب میں اتر جائیں اور وہ زبان سے خواہ اقرار حق نہ کرے لیکن اس کا ضمیر اسے قلب حق کے اقرار پر مجبور کر دے۔

مولانا آیت مبارکہ کی تفسیر میں استدلال کا خوبصورت انداز پیش کرتے ہیں جو طاقت حاکمیت نہ رکھتی ہو اور جس کے اختیارات کو پہلے ہی ایک بالاتر قانون نے محدود و پابند کر دیا ہو جسے بدلنے کا اسے اختیار نہ ہو وہ حاکمیت کی اہل تو نہیں ہو سکتی حاکمیت اس کی مانی جائے گی جس کی واقعی حاکمیت ساری کائنات پر قادر ہے اور جو دنیا اور جہاں کا مالک ہے اور جسے انسانوں پر بھی حاکمیت کا لاشریک حق حاصل ہے مولانا کی تفسیر دور جدید کے پڑھے لکھے طبقے کے لئے بہترین دلائل کے ساتھ اس اسلوب کی اہمیت واضح کرتی ہے۔

(۱) تفہیم القرآن ۱/ ۱۹۸، ۱۹۹

باب سوم

اولوالعزم انبیاء کے اسالیب دعوت (حصہ دوم)

فصل اول	حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسالیب دعوت تدبر قرآن کی روشنی میں
فصل دوم	حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسالیب دعوت تفہیم القرآن کی روشنی میں
فصل سوم	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اسالیب دعوت تدبر قرآن کی روشنی میں
فصل چہارم	حضرت عیسیٰ کے اسالیب دعوت تفہیم قرآن کی روشنی میں
فصل پنجم	حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسالیب دعوت تدبر قرآن کی روشنی میں
فصل ششم	حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسالیب دعوت تفہیم القرآن کی روشنی میں

فصل اول

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسالیب دعوت تدبر قرآن کی روشنی میں

حضرت موسیٰ علیہ السلام:

قرآن نے جن انبیاء کو اولوالعزم کہا ہے ان میں موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت نمایاں ہے۔ قرآن کی چھتیس سورتوں میں ان کا ذکر آیا ہے موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت عزم وہمت کی ایک درخشاں مثال ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوتی ذمہ داریاں بہت منفرد نوعیت کی تھیں اس لیے تائید ایزدی کے تجربے بھی اسی نوعیت کے منفرد اور اعلیٰ تھے۔ ان کی ذاتی زندگی اور دعوتی طریقہ کار داعیان کرام کے لیے دعوتی اسالیب اختیار کرنے میں مشعل راہ ثابت ہوں گے۔

نسب:

موسیٰ بن عمران بن قاہث بن عارز بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم۔[۱]

موسیٰ کی وجہ تسمیہ:

"موسیٰ" کی وجہ تسمیہ اہل لغت نے یہ بیان کی ہے: موسیٰ عبرانی زبان میں پانی سے نکالے ہوئے کے ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "مو" قبطی زبان میں پانی کو اور "سا" درخت کو کہتے ہیں۔

چونکہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے ڈر سے ان کی والدہ نے ایک صندوق میں رکھ کر درختوں کے نیچے پانی کی موجوں میں بہادیا تھا اس کے بعد خدا کے حکم سے آپ علیہ السلام زندہ سلامت نکال لیے گئے تھے اس لیے آپ علیہ السلام کا نام "موسیٰ" یعنی پانی سے نکالا ہوا پڑ گیا۔[۲]

خواب فرعون:

موسیٰ علیہ السلام مصر میں پیدا ہوئے اور مصر کے بادشاہ کو فرعون کہا جاتا تھا جس زمانے میں آپ علیہ السلام پیدا ہوئے اس وقت ولید بن مصعب مصر کا بادشاہ تھا۔ جس نے خواب دیکھا کہ ایک آگ تمام مصر میں قبطیوں کی املاک جلاتی ہوئی چلی آتی ہے اور جب وہ آگ بنی اسرائیل کے محلے سے گزرتی ہے تو وہ کسی کو بھی نہیں جلاتی اور بنی اسرائیل کے محلے سے ایک اژدھا نکلا اور فرعون کے اوپر دوڑ کر اس کو تخت پر سے اوندھا کر دیا۔ فرعون نے اپنے نجومیوں سے خواب کی تعبیر چاہی تو انہوں نے کہا،

تعبیر خواب:

نجومیوں نے کہا "بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری حکومت کے زوال کا باعث ہوگا"۔ چنانچہ فرعون مصر

---

(۱) تاریخ الانبیاء، ذوالفقار ارشد گیلانی، علم دوست پبلشرز، لاہور ۱۹۸۷ء، ص ۱۴۳

(۲) حیات انبیاء کا انسائیکلوپیڈیا، مرتبہ امیر علی خان، مشتاق کارنر، لاہور، ص ۴۲۶

نے بنی اسرائیل کے محلہ میں ایک ہزار پیادہ مقرر کر دیئے تا کہ بنی اسرائیل کے جس گھر میں لڑکا پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے اور لڑکیوں کو چھوڑ دیں دو سال تک بنی اسرائیل پر مسلسل یہ ظلم ہوتا رہا اور فرعون مصر کے دور میں بارہ ہزار لڑکے قتل کیے گئے اور نوے ہزار حمل ضائع کر دیئے گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور حفاظت

ادھر فرعون کی یہ تدبیریں تھیں ادھر تقدیر اس پر ہنس رہی تھی اور کہہ رہی تھی:

اے ظالم بادشاہ! جسے اپنی افواج کی کثرت پر، اپنے اقتدار کی طاقت پر اور وسیع سلطنت پر غرور ہے، اس عظیم خالق کی طرف سے جس کی تقدیر کا کوئی توڑ نہیں اور جس کے فیصلے کو رد کرنے کی کسی کی مجال نہیں۔ اس کی قدرت کاملہ سے فیصلہ ہو چکا ہے وہ بچہ تیرے ہی گھر پرورش پائے گا پھر تیری دنیا اور آخرت کی تباہی اسی کے ہاتھوں ہو گی کیونکہ آسمانوں اور زمین کے مالک کی یہ شان ہے کہ وہ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے وہی قدرت اور قوت والا ہے۔ (۱)

بائبل میں موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر کچھ اس طرح ہے،

And there went a man of the house of levi, and lore to the wife a daughter of levi. And the women conceived, and born a son. When she saw him that he was a good by child, she took for him an ark of bulrushes and doubled it with slime and and with pitch and pul the child therein and she laid it in the flags by the riverbank.

ترجمہ: اور لاوی کے گھرانے کے ایک شخص نے جا کر لاوی کی نسل کی ایک عورت سے بیاہ کیا۔ وہ عورت حاملہ ہوئی اور اس کے بیٹا ہوا اس نے یہ دیکھ کر کہ بچہ بہت خوبصورت ہے تین مہینے تک اسے چھپا کر رکھا اور جب اسے اور زیادہ نہ چھپا سکی تو اس نے سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا لیا اور اس پر چکنی مٹی اور ارل لگا کر بچہ کو اس میں رکھا اور دریا کے کنارے بہاؤ میں چھوڑ آئی۔ (۲)

قرآن پاک نے موسیٰ کی پیدائش کے سلسلے میں ابتدائی تفصیلات بیان نہیں کیں۔ تالمود میں موسیٰ کے والد کا نام عمرام بتایا گیا ہے قرآن اس کا تلفظ عمران کرتا ہے۔ قرآن اپنے بیان کا آغاز ام موسیٰ کی طرف وحی الہی سے کرتا ہے کہ جب بچے کے بارے میں خطرہ محسوس ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا۔

جیسا کہ ارشاد ربانی ہے،

---

(۱) حیات انبیاء کا انسائیکلوپیڈیا، مولانا امیر اعلی، ص ۴۲۷

(۲) کتاب خروج (Exodus) ۲۰/۱-۲۰

﴿ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ أُمِّ مُوسَىٰٓ أَنْ أَرْضِعِيهِ ۖ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِى ٱلْيَمِّ وَلَا تَخَافِى وَلَا تَحْزَنِىٓ ۖ إِنَّا رَآدُّوهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوهُ مِنَ ٱلْمُرْسَلِينَ ﴾(۱)

ترجمہ: ہم نے موسیٰ کی ماں کو اشارہ کیا کہ اس کو دودھ پلا پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ خوف و غم نہ کر ہم اسے تیرے پاس واپس لے آئینگے اور اس کو پیغمبروں میں شامل کریں گے۔

مولانا مودودی فرماتے ہیں

سب سے بڑی بات جو قرآن میں بیان کی گئی ہے اس کا ذکر اسرائیلی روایات میں نہیں ملتا یعنی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے یہ کام اللہ تعالیٰ کے اشارے پر کیا اللہ تعالیٰ نے ان کو پہلے ہی اطمینان دلا دیا تھا کہ اس طریقے پر عمل کرنے سے نہ صرف یا کہ تمہارے بچے کی جان کو کوئی خطرہ نہیں بلکہ ہم تمہارے بچے کو تمہارے پاس پلٹا لائیں گے اور یہ کہ تمہارا یہ بچہ آگے چل کر ہمارا رسول ہونے والا ہے۔(۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے محل میں:

مفسرین بیان کرتے ہیں کہ "لونڈیوں نے دریا میں بہتا ہوا صندوق نکالا اور فرعون کے محل میں فرعون کی بیوی حضرت آسیہ کے سامنے پیش کیا۔ آسیہ علیھم السلام کا نسب یہ ہے

آسیہ بنت فراحم بن عبید بن ریان بن ولید۔ یہ ریان بن ولید وہی ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر کا بادشاہ تھا بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ آسیہ علیھم السلام بنی اسرائیل سے تعلق رکھتی تھیں اور بعض مفسرین کا خیال ہے کہ وہ آپ کی پھوپھی تھیں (واللہ اعلم)(۳)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن جو صندوق کے بہاؤ کے ساتھ کنارے کنارے نگہداشت کرتی جارہی تھیں کہ انہوں نے دیکھا کہ صندوق تیرتے ہوئے شاہی محل کے کنارے آلگا۔ چنانچہ وہ خوش ہوگئی اور حالات معلوم کرنے کے لیے شاہی محل کی خادماؤں میں شامل ہوگئیں۔ فرعون کے گھر والوں نے جب صندق کو کھولا تو دیکھا کہ ایک حسین اور تندرست بچہ آرام سے لیٹا ہوا ہے فرعون کی بیوی نے بچے کو دیکھا تو باغ باغ ہوگئی اور انتہائی محبت سے پیار کیا۔ فرعون آیا تو اسے دیکھتے ہی ذبح کرنے کا حکم دیا۔ حضرت آسیہ علیھم السلام نے مزاحمت کرتے ہوئے فرمایا "قرة عين لى ولک" یہ تو میری اور تیری

---

(۱) سورة القصص، ۲۸/ ۷

(۲) تفہیم القرآن، ۳/ ۶۱۴

(۳) قصص الانبیاء، امام ابو الفداء ابن کثیر، ترجمہ مولانا عطا اللہ ساجد، دار السلام، ص ۳۷۲

آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ فرعون نے کہا" تیرے لیے تو ہے میرے لیے نہیں" زبان کی کہی ہوئی بات حقیقت بن جایا کرتی ہے۔ حضرت آسیہ علیہا السلام نے کہا تھا"عسیٰ ان ینفعنا" بہت ممکن ہے یہ بچہ جو تیرے خواب کی تعبیر بننے والا ہے تو ہماری محبت اور آغوش تربیت شاید اس کو مضر ہونے کے بجائے مفید ثابت کر دے مگر فرعون اور اس کے خاندان کو یہ کیا معلوم کہ خدا کی تقدیر ان پر ہنس رہی ہے کہ رب العالمین کی کرشمہ سازی دیکھو کہ تم اپنی بے خبری میں اپنے دشمن کی پرورش پر نگران مقرر کیے گئے ہو۔[(۱)]

مولانا اصلاحی نے فرعون کے ہاں موسیٰ علیہ السام کے بھیجے جانے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"پھر یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام دونوں کے دشمن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کرائی بلکہ اس کی تدبیر اور حکمت کا یہ بھی ایک کرشمہ ہے کہ اس نے فرعون سے اس کے اور اس کی قوم کے سب سے بڑے دشمن کی پرورش کرائی اور فرعون نے خود اپنے ہاتھوں اسے خطرے کا سامان کیا جس سے بچنے کے لیے اس نے نہ جانے کیا جتن کیے تھے۔[(۲)]

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ بچے کے دایہ دودھ پلائی مقرر کی جائے مگر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ سے کیے گئے وعدے کو پورا کرنے کے لیے بچے کی طبیعت میں یہ بات پیدا کر دی کہ وہ کسی عورت کے پستان کو منہ نہیں لگاتا تھا۔ چنانچہ وہاں موجود موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیرہ نے کہا کہ میں تم کو ایک ایسی دایہ کا پتا بتاؤں جو نہایت نیک اور اس خدمت کے لیے موزوں ہے چنانچہ فرعون کی بیوی نے دایہ کو لانے کا حکم دیا۔ ادھر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے بچے کی جدائی میں بے چین ہو کر اس پر آمادہ ہو گیئں کہ اپنے راز کو افشا کر دیں کہ بیٹی نے آکر پوری داستان سنا دی اور ان کو ساتھ لے کر شاہی محل پہنچ گئی اور بچے نے فوراً ان کا دودھ پینا شروع کر دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ان کو ہنسی خوشی گھر واپس لے آئیں اور اللہ کا وعدہ سچ ہوا۔

﴿فَرَدَدْنَاهُ إِلَىٰ أُمِّهِ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾[(۳)]

ترجمہ: غرض ہم نے موسیٰ کو اس کی والدہ کی طرف واپس پہنچا دیا تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ آزردہ خاطر نہ ہوں اور تاکہ وہ جان لے کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے"۔

---

(۱) قصص الانبیاء، خواجہ محمد اسلام، مکتبہ الیمان، لاہور، ص ۱۵۲

(۲) تدبر قرآن، ۳/ ۱۵۶

(۳) سورۃ القصص: ۲۸/ ۱۳

دودھ پلانے کے زمانے میں والدہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت آسیہ سے ملوانے لے جایا کرتی تھیں اور دودھ چھڑانے کے بعد فرعون کی بیوی کے سپر کر دیا اس کے بعد وہ شاہی محل میں زیر تربیت رہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب جوان ہوئے تو بہت قوی النسل ثابت ہوئے ان کی پرورش فرعون کے محل میں ہوئی اور وہ تمام طریقے اختیار کیے گئے جو شہزادوں کی تعلیم و تربیت میں اختیار کیے جاتے ہیں عہد نامہ جدید کی کتاب "اعمال" میں ہے کہ،

"موسیٰ نے مصریوں کے تمام علوم کی تعلیم پائی اور وہ کام اور کلام میں قوت والا تھا"۔(۱)

قرآن میں ہے،

﴿قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَٱغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهُۥٓ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ﴾(۲)

ترجمہ: پس جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اس کو علم و حکمت عطا کی۔ اور نیکو کاروں کو ہم اسی طرح صلہ دیتے ہیں۔

مولانا اصلاحی کے بقول:

جب موسیٰ علیہ السلام جسمانی اعتبار سے جوانی کو اور عقلی و مزاجی اعتبار سے اعتدال و توازن کی عمر کو پہنچے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ جوانی بجائے خود کوئی بڑی وقیع چیز نہیں اگر اس کے ساتھ عقلی و مزاجی اعتدال نہ ہو چنانچہ جب موسیٰ علیہ السلام کی عقل و مزاج میں توازن آ گیا تو ہم نے ان کو حکمت و معرفت سے نوازا" ﴿وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي ٱلْمُحْسِنِينَ ﴾ "اسی طرح جو لوگ خوب کار ہوتے ہیں ہم ان کو صلہ دیا کرتے ہیں محسنین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو صحیح طریقہ پر استعمال کریں۔(۳)

زندگی کا یہی وہ مرحلہ تھا جہاں سے ایک خاص واقعہ پیش آتا ہے اور زندگی نیا موڑ لیتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر میں گشت کرتے ہوئے اکثر ان حالات کا مشاہدہ کرتے رہتے اور گاہے بگاہے بنی اسرائیل کی مدد کرتے۔ آپ علیہ السلام بنی اسرائیل پر ہوتے مظالم کو دیکھ کر سخت کڑھتے ایک مرتبہ آپ علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک مصری ایک اسرائیلی کو بیگار کے لیے مجبور کر رہا ہے اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھتے ہی فریاد کی اور رونے لگا۔ آپ علیہ السلام نے پہلے تو اس آدمی کو سمجھایا لیکن جب وہ باز نہ آیا تو آپ علیہ السلام نے اسے زور کا طمانچہ مارا کہ وہ جہنم واصل ہو گیا۔ اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ارادہ نہ تھا آپ علیہ السلام نے اللہ سے معافی چاہی قرآن میں ہے کہ:

﴿قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَٱغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهُۥٓ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ﴾(۴)

---

(۱) عہد نامہ جدید، کتاب اعمال، ۷/ ۲۲

(۲) سورۃ القصص: ۲۸/ ۱۶

(۳) تدبر قرآن، ۵/ ۶۶۳

(۴) سورۃ القصص: ۲۸/ ۱۶

ترجمہ: اے میرے رب! میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تو مجھے معاف فرما دے اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا وہ بہت بخشش اور مہربانی کرنے والا ہے۔

اہلِ شہر میں مصری کے قتل کی خبر شائع ہو گئی مگر قاتل کا کچھ پتا نہیں تھا۔ مصریوں نے فرعون کے پاس استغاثہ کیا کہ یہ کام کسی اسرائیلی کا ہے فرعون نے کہا، "ساری قوم سے بدلہ نہیں لیا جا سکتا تم قاتل کا پتہ لگاؤ میں ضرور اسے کیفر کردار تک پہنچاؤں گا۔"

اگلے دن وہی اسرائیلی جس کے بچاؤ میں قبطی مارا گیا تھا وہ کسی دوسرے قبطی سے جھگڑ رہا تھا اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھتے ہی پچھلے دن کی طرح فریاد کی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسرائیلی کو دھمکاتے ہوئے فرمایا،

﴿ إِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِينٌ ﴾[1]

ترجمہ: بیشک تو صریح بے راہ ہے۔

اسرائیلی نے جب دیکھا کہ آپ علیہ السلام نے اس کی حمایت کے بجائے الٹا اسے ڈانٹ دیا تو وہ کہنے لگا،

﴿ فَلَمَّآ أَنْ أَرَادَ أَن يَبْطِشَ بِٱلَّذِى هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا قَالَ يَٰمُوسَىٰٓ أَتُرِيدُ أَن تَقْتُلَنِى كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِٱلْأَمْسِ ۖ إِن تُرِيدُ إِلَّآ أَن تَكُونَ جَبَّارًا فِى ٱلْأَرْضِ وَمَا تُرِيدُ أَن تَكُونَ مِنَ ٱلْمُصْلِحِينَ ﴾[2]

ترجمہ: اے موسیٰ کیا تو نے کل جیسے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا آج مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔

اسرائیلی کے اس واویلے سے آپ علیہ السلام کا راز کھل گیا اور کل تک جس فرعون نے آپ کو اولاد بنا کر پالا تھا اس نے آپ علیہ السلام کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کسی نیک بندے نے حالات سے آگاہ کر دیا اور حالات کی سنگینی کے پیشِ نظر آپ علیہ السلام کو مدین روانگی کا مشورہ دیا کیونکہ وہ فرعون کا درباری تھا اور آپ علیہ السلام سے گہری محبت رکھتا تھا چنانچہ آپ علیہ السلام نے ۳۰ برس کی عمر میں مدین کا سفر کیا۔[3]

---

(۱) سورۃ القصص: ۲۸ / ۱۸

(۲) سورۃ القصص: ۲۸ / ۱۹

(۳) تاریخ الانبیاء، ذوالفقار ارشد گیلانی، علم دوست پبلشرز، لاہور ۱۹۹۸ء، ص ۱۶۳

ماءِ مدین:

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین کی سرزمین میں قدم رکھا تو دیکھا کہ کنوئیں پر بھیڑ لگی ہے اور فاصلے پر دو لڑکیاں کھڑی ہیں جانوروں کو پانی پلانے کے لیے، آپ علیہ السلام نے ان کی پانی پلانے میں مدد کی۔ وہ لڑکیاں حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹیاں تھیں انہوں نے اپنے والد کے سامنے آپ علیہ السلام کے قوی اور طاقتور ہونے کی تعریف کی تو انہوں نے آپ علیہ السلام کو بلا بھیجا۔

حضرت شعیب علیہ السلام سے رشتہ مصاہرت:

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹیوں کے منہ سے آپ علیہ السلام کی تعریف سنی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شعیب علیہ السلام کو اپنے تمام حالات سنائے یہ سن کر حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا:

﴿قَالَ إِنِّيٓ أُرِيدُ أَنۡ أُنكِحَكَ إِحۡدَى ٱبۡنَتَيَّ هَٰتَيۡنِ عَلَىٰٓ أَن تَأۡجُرَنِي ثَمَٰنِيَ حِجَجٖۖ فَإِنۡ أَتۡمَمۡتَ عَشۡرٗا فَمِنۡ عِندِكَۖ﴾[1]

ترجمہ: انہوں نے کہا میں یہ چاہتا ہوں کہ ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کا تیرے ساتھ نکاح کر دوں کہ تو آٹھ سال تک میری ملازمت کرے اور اگر تو دس سال پورے کر دے تو یہ تیری طرف سے احسان ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اطمینان کے لیے حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا،

﴿وَمَآ أُرِيدُ أَنۡ أَشُقَّ عَلَيۡكَۚ سَتَجِدُنِيٓ إِن شَآءَ ٱللَّهُ مِنَ ٱلصَّٰلِحِينَ﴾[2]

ترجمہ: اور میں تجھ پر کوئی مشقت نہیں ڈالنا چاہتا تو مجھ کو ان شاء اللہ خوش معاملہ اور بھلے لوگوں میں سے پائے گا۔

چنانچہ آپ علیہ السلام کی شادی ہوگئی آپ علیہ السلام نے وعدے کے مطابق دس سال یا اس سے زیادہ عرصہ خدمت کی ہے۔ آپ علیہ السلام کو والدہ سے ملے کافی عرصہ ہو گیا تھا چنانچہ آپ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہم السلام سے رخصت چاہی انہوں نے بکریوں کا ریوڑ اور بہت سا سامان آپ علیہ السلام کو دے دیا اور آپ علیہ السلام مصر کے لیے روانہ ہو گئے۔

زمانہ نبوت کا آغاز اور شرف ہم کلامی:

موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت چونکہ مشیت ایزدی کی اسکیم کا بنیادی کردار ہے اس لیے ان کی زندگی کے ہر مرحلے کا تعین بھی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وہ اپنے طور پر ایسا اقدام کرتے ہیں۔ قرآن پاک کے بیان کے مطابق وہ موعود مدت پوری کرنے کے بعد

---

(۱) سورۃ القصص: ۲۸ / ۲۷

(۲) سورۃ القصص: ۲۸ / ۲۸

مصر جارہے ہوتے ہیں اور بائبل کے مطابق وہ بکریاں چرانے گئے ہوتے ہیں تو رات اور اندھیرے میں انہیں راستے کا پتا نہیں چلتا اس دوران انہیں آگ دکھائی دیتی ہے وہ قریب جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے شرف مخاطبت حاصل ہوتا ہے تاہم صداقت قرآن پاک کے بیان میں ہی موجود ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی زوجہ کے ساتھ مصر کا سفر کرتے ہیں تو سردی کا زمانہ تھا، راستہ نیا تھا، زوجہ حاملہ تھیں بکریوں کا ریوڑ ساتھ تھا۔ ان حالات میں آپ علیہ السلام کو آگ کی ضرورت پیش آئی۔[1]

اللہ تعالیٰ نے ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قصہ سنایا:

﴿وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ ۝ إِذْ رَأَىٰ نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّي آتِيكُم مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى﴾[2]

ترجمہ: اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھلا آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک موسیٰ علیہ السلام کا وہ واقعہ بھی پہنچا ہے جب کہ اس کو ایک آگ نظر آئی تو اس نے اپنی گھر والی سے کہا کہ تم ذرا ٹھہر جاؤ میں نے ایک آگ دیکھی ہے میں اس آگ میں سے شاید تمہارے لیے کچھ آگ لے آؤں یا اس آگ کے پاس کوئی راستہ بتانے والا پاؤں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ کی تلاش میں جاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ عجیب آگ ہے درخت پر روشنی نظر آتی ہے مگر نہ درخت کو جلاتی ہے اور نہ ہی گل ہوتی ہے یہ سوچتے ہوئے آگے بڑھے لیکن جوں جوں آگے بڑھتے ہیں آگ دور ہوتی جاتی ہے یہ دیکھ کر خوف محسوس کرتے ہوئے واپسی کا ارادہ کرتے ہیں تو آواز آتی ہے،

﴿إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾[3]

ترجمہ: بے شک میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں میری ہی عبادت کرو۔

دعوت و تبلیغ میں "توحید" کی حیثیت بنیادی ہے چنانچہ یہاں اللہ پاک خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توحید کی دعوت دے رہے ہیں۔

مزید فرمایا،

﴿يَا مُوسَىٰ إِنَّهُ أَنَا اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾[4]

---

(۱) سفیران خدا جلّ جلالہ، مسعود مفتی، خزینہ علم و ادب، لاہور جنوری ۲۰۰۵ء، ص ۶۱۴

(۲) سورۃ طٰہٰ: ۲۰/ ۹، ۱۰

(۳) سورۃ طٰہٰ: ۲۰/ ۱۴

(۴) سورۃ نمل: ۲۷/ ۹

ترجمہ: اے موسیٰ یہ میں ہوں اللہ زبردست اور دانا۔

﴿ فَلَمَّآ أَتَىٰهَا نُودِىَ مِن شَٰطِئِ ٱلْوَادِ ٱلْأَيْمَنِ فِى ٱلْبُقْعَةِ ٱلْمُبَٰرَكَةِ مِنَ ٱلشَّجَرَةِ أَن يَٰمُوسَىٰٓ إِنِّىٓ أَنَا ٱللَّهُ رَبُّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴾[1]

ترجمہ: اے موسیٰ میں ہی اللہ ہوں سارے جہان والوں کا مالک۔

﴿ إِنَّنِىٓ أَنَا ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنَا۠ فَٱعْبُدْنِى وَأَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ لِذِكْرِىٓ ﴾[2]

ترجمہ: بے شک میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کیجیو اور میری یاد کے لیے نماز کا اہتمام رکھیو۔

مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں کہ

یہی اولین تعلیم ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی اور یہی تعلیم ہمیشہ تمام انبیاء کو دی گئی ہے سب سے پہلے عقیدہ توحید ہے اس لیے کہ یہی مرکز دین ہے جہاں تک خدا کے ماننے کا تعلق ہے تو دنیا نے ہمیشہ خدا کو مانا ہے انکار کی حماقت موجودہ زمانے کی پیداوار ہے البتہ شرک کی ضلالت کسی نہ کسی شکل میں انسان پر حملہ آور ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ ہر نبی کو سب سے پہلے توحید کی تعلیم دی گئی ہے اور ہر نبی نے شرک کے خلاف جہاد کیا۔

دوسری چیز جس کی موسیٰ علیہ السلام کو ہدایت ہوئی وہ عبادت رب ہے اور یہ حق بلا شرکت غیر اس پاک ذات کا ہے۔ یہ بات خدا کی بندگی کے خلاف ہے کہ تسبیح تو اس کی کی جائے اور شریعت خود تصنیف کی جائے یا دوسرے کو یہ حق دیا جائے تیسری چیز نماز ہے۔ نماز انفرادی ہو یا اجتماعی خدا کے ذکر کی سب سے بڑی محافظ ہے نماز کے ذریعے بندہ اپنے عہد بندگی کو یاد کرتا ہے جو اس کے رب نے اس سے لیا ہے اور جس کا خدا سے اس نے اقرار کیا ہے اگر کوئی فرد یا امت نماز کو ضائع کر دے تو اس نے پورے دین کو ضائع کر دیا۔[3]

یوں دعوت و تبلیغ کے تین بنیادی ارکان توحید، عبادت رب اور نماز کی پہلی وحی میں ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تلقین کی گئی۔

معجزات موسیٰ علیہ السلام:

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کئی معجزات عطا فرمائے۔ قرآن کریم کے مطابق ان کی تعداد نو ہے

---

(۱)سورۃ القصص:۲۸/ ۳۰

(۲)سورۃ طہٰ:۲۰/ ۱۴

(۳)تدبر قرآن،۵/ ۳۱

﴿وَلَقَدۡ ءَاتَيۡنَا مُوسَىٰ تِسۡعَ ءَايَٰتِۭ بَيِّنَٰتٖۖ فَسۡـَٔلۡ بَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ إِذۡ جَآءَهُمۡ فَقَالَ لَهُۥ فِرۡعَوۡنُ إِنِّي لَأَظُنُّكَ يَٰمُوسَىٰ مَسۡحُورٗا ﴾(۱)

ترجمہ اور ہم نے دیں موسیٰ کو نو نشانیاں۔

یہ نشانیاں عصا، ید بیضا، سینن، نقص ثمرات، طوفان، جراد قمل، فضادع دم ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دعوت و تبلیغ:

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلے خود دعوت توحید دی۔ پھر اللہ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دعوت و تبلیغ یوں ہوا۔

﴿ٱذۡهَبۡ إِلَىٰ فِرۡعَوۡنَ إِنَّهُۥ طَغَىٰ ﴾(۲)

ترجمہ: تم فرعون کے پاس جاؤ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے۔

﴿وَأَدۡخِلۡ يَدَكَ فِي جَيۡبِكَ تَخۡرُجۡ بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوٓءٖۖ فِي تِسۡعِ ءَايَٰتٍ إِلَىٰ فِرۡعَوۡنَ وَقَوۡمِهِۦٓۚ إِنَّهُمۡ كَانُواْ قَوۡمٗا فَٰسِقِينَ ﴾(۳)

ترجمہ: نو نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے پاس جاؤ وہ بڑے ہی نافرمان لوگ ہیں۔

اسی طرح کا مضمون سورۃ الشعراء آیت نمبر ۱۰، ۱۱ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی،

﴿قَالَ رَبِّ ٱشۡرَحۡ لِي صَدۡرِي o وَيَسِّرۡ لِيٓ أَمۡرِي o وَٱحۡلُلۡ عُقۡدَةٗ مِّن لِّسَانِي o يَفۡقَهُواْ قَوۡلِي ﴾(٤)

ترجمہ: اے میرے پرودگار میرا سینہ کھول دے اور میرا کام آسان کر دے میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔

---

(۱) سورۃ الاسراء: ۱۷/ ۱۰۱

(۲) سورۃ طہ: ۲۰/ ۲۴

(۳) سورۃ النمل: ۲۷/ ۱۲

(۴) سورۃ طہ: ۲۰/ ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۶۸

حضرت موسٰی علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ بھی دعا کی کہ میرے بھائی ہارون کو میرا مدد گار بنا دے وہ مجھ سے زیادہ فصیح ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دعوت و تبلیغ کے فریضے کی انجام دہی کے لیے مانگے جانے والی یہ دونوں دعائیں قبول فرمائیں۔

حضرت موسٰی علیہ السلام اور حضرت ہاورن علیہ السلام کے فرعون کے دربار میں دعوت و تبلیغ:

اللہ تعالیٰ سے حکم ملتے ہی دونوں بھائی اور خدا کے سچے پیغمبر و نبی فرعون کے دربار میں پہنچے اور بغیر خوف و خطر اندر داخل ہو گئے اور حضرت موسٰی علیہ السلام نے کہا:

"فرعون! ہمیں خدا نے اپنا پیغمبر بنا کر تیرے پاس بھیجا ہے ہم تجھ سے دو باتیں چاہتے ہیں ایک یہ کہ خدا پر یقین لانا اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بنانا دوسرے یہ کہ ظلم سے باز آجا اور بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے نجات دے اور ہمیں یہ جرات نہیں ہو سکتی کہ خدائے تعالیٰ کے ذمہ غلط بات لگائیں"۔[۱]

ربوبیت الٰہی کی تحقیر:

حضرت موسٰی علیہ السلام نے اپنی رسالت کی بات کرتے ہوئے "رب العالمین" کا ذکر کیا ہے۔ فرعون نے رب العالمین کا مذاق اڑایا اور کہا کہ رب العالمین کیا چیز ہے؟ دعوت حق میں ایک مرحلہ دعوت کے حق میں مسکت دلائل مہیا کرنا ہے۔ موسٰی علیہ السلام نے اس گستاخانہ رویے کو بنیاد بنا کر دلائل مہیا کیے۔ فرعون نے جب ازراہ استہزا کہا

﴿قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ ٱلْعَٰلَمِينَ﴾[۲]

ترجمہ: "رب العلمین کیا ہے؟

تو موسٰی علیہ السلام نے کہا:

﴿قَالَ رَبُّ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَآ إِن كُنتُم مُّوقِنِينَ﴾[۳]

ترجمہ: تمہارا رب العالمین وہی ہے جو آسمانوں اور زمین اور جو کچھ اس کے درمیان ہے سب کا رب ہے اگر تم یقین لانے والے ہو۔

فرعون کا مطالبہ معجزات:

فرعون نے موسٰی علیہ السلام سے معجزات کا مطالبہ کیا۔ فرعون کے اس مطالبے پر موسٰی علیہ السلام نے بھرے دربار میں فرعون کے سامنے اپنی لاٹھی کو زمین پر ڈالا اس وقت اس نے اژدھے کی شکل اختیار کر لی اور یہ اسی گز کا اژدھا تھا اور منہ اسکا کھلا رہتا اور

---

(۱) قصص الانبیاء، خواجہ محمد اسلام، ص ۱۵۰

(۲) سورۃ الشعراء: ۲۶/ ۲۳

(۳) سورۃ الشعراء: ۲۶/ ۲۴

بہتر پاؤں مثل بڑے ہاتھی کے تھے اور بے شمار دانت تھے اور دم اس کی نیزے کی مانند تھی اور جس جگہ اس کا کف گرتا اس زمین کو بالکل جلا دیتا پھر اس جگہ پر کبھی گھاس نہ پیدا ہوئی۔[۱]

فرعون کے درباریوں نے اسے جادو سمجھا اور ان کے مقابلے کے لیے فرعون نے اپنے داعیان وارکان کے نام احکامات جاری کر دیئے کہ تمام قلمرو میں جو مشہور اور ماہر جادوگر ہیں ان کو دار الحکومت روانہ کیا جائے۔ بہر حال یوم جشن آ پہنچا۔ میدان جشن میں تمام شاہانہ کروفر کے ساتھ فرعون تخت نشین ہوا ایک جانب مصر کے مشہور جادوگروں کا گروہ اپنے سازوسامان سحر سے لیس کھڑا ہے۔ دوسری جانب خدا کے رسول حق کے پیغامبر اور سچائی اور راستی کے پیکر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کھڑے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں کو دعوت حق دینا:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق کی تبلیغ کا حق ادا فرماتے ہوئے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ حق کے مقابلے میں جھوٹ پر اصرار اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ لیکن جادوگروں نے ان کی ایک نہ سنی اور کہا،

﴿قَالُواْ يَـٰمُوسَىٰٓ إِمَّآ أَن تُلْقِىَ وَإِمَّآ أَن نَّكُونَ نَحْنُ ٱلْمُلْقِينَ ﴾[۲]

ترجمہ: جادوگروں نے کہا اے موسیٰ! یا تو آپ پہلے ڈال دیجیے یا ہم ڈالتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا تم پہلے ڈالو پھر جب ان جادوگروں نے ڈالا تو انہوں نے لوگوں کی آنکھوں کو باندھ دیا اور ان کو خوفزدہ کر دیا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر خدا کا ہاتھ تھا۔

﴿۞ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰٓ أَنْ أَلْقِ عَصَاكَ ۖ فَإِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ﴾[۳]

ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ کو حکم بھیجا کہ اے موسیٰ تو اپنا عصا ڈال دے اس عصا کا ڈالنا تھا کہ وہ اسی وقت اس سب جھوٹے طلسم کو نگل گیا جو وہ بنا رہے تھے۔

جادوگروں نے جو کہ اپنے فن کے ماہر تھے جب عصا موسیٰ کا یہ کرشمہ دیکھا تو وہ اس حقیقت کو سمجھ گئے اور جس کو اس وقت تک فرعون اور اس کے درباری لوگ پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے رہے وہ اس کو چھپا نہ سکے اور جادوگروں نے بھری مجلس میں یہ اقرار کر لیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا یا عمل جادو سے بالاتر خدا کا معجزہ ہے اس کا سحر سے کوئی واسطہ نہیں پھر وہ جادوگر سجدے میں گر پڑے اور اعلان کر دیا کہ ہم موسیٰ وہارون علیہما السلام کے پروردگار پر ایمان لائے کیونکہ وہ رب العالمین ہے۔

---

(۱) قصص الانبیاء، سید سعید علی شاہ، شبیر برادرز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۲۵۳

(۲) سورۃ اعراف: ۷ / ۱۱۵

(۳) سورۃ اعراف: ۷ / ۱۱۲

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا انخلا:

فرعون اس ذلت آمیز رسوائی اور رسوا کن شکست پر اس طرح سٹپٹایا کہ اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی، اس نے بنی اسرائیل میں سے آپ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں پر ظلم کی انتہا کر دی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ناپاک ارادہ کر لیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خبر ہو گئی اور آپ علیہ السلام کی جان بچ گئی۔ آپ علیہ السلام کو یہ اطلاع ایک مصری مرد مومن نے دی تھی۔ جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے،

﴿قَالَ يَٰمُوسَىٰٓ إِنَّ ٱلْمَلَأَ يَأْتَمِرُونَ بِكَ لِيَقْتُلُوكَ فَٱخْرُجْ إِنِّى لَكَ مِنَ ٱلنَّٰصِحِينَ﴾[1]

ترجمہ: اے موسیٰ یہاں کے سردار تیرے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں پس تو یہاں سے چلا جا مجھے اپنا خیر خواہ مان۔

جب معاملہ اس حد کو پہنچ گیا تو خدائے تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اب وقت آگیا کہ تم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر باپ دادا کی سرزمین کی جانب لے جاؤ۔

مصر سے فلسطین یا ارض کنعان جانے کے لیے دو راستے ہیں ایک خشکی کا راستہ اور وہ قریب ہے اور دوسرا بحر احمر (قلزم) کا راستہ۔ مگر خدائے تعالیٰ کی مصلحت کا تقاضا یہی ہوا کہ خشکی کی راہ چھوڑ کر دوری کی راہ اختیار کریں چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات بحیرات مرہ کی طرف روانہ ہوئے (یہ کڑوے پانی کی جھیلیں ہیں جو خلیج سویز سے متصل تھیں) بعد میں جغرافیائی تبدیلیوں سے یہ جھیلیں بحیرہ قلزم (خلیج سویز) سے منقطع ہو گئیں۔[2]

فرعون زبردست فوج لے کر رعمیس سے نکلا اور ان کا تعاقب کرتے ہوئے ان کے سر پر جا پہنچا جس سے بنی اسرائیل بہت خوفزدہ ہو گئے کہ ہم اتنے طاقتور لشکر کا مقابلہ کیسے کریں گے۔ اس وقت اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ سمندر پر اپنا عصا ماریئے۔ آپ علیہ السلام نے عصا مارتے ہوئے فرمایا، اللہ کے حکم سے پھٹ جا۔

فرمان الٰہی ہے،

﴿فَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰٓ أَنِ ٱضْرِب بِّعَصَاكَ ٱلْبَحْرَ ۖ فَٱنفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَٱلطَّوْدِ ٱلْعَظِيمِ﴾[3]

ترجمہ: ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ سمندر پر اپنی لاٹھی کو دے مار، پھر وہ پھٹ گیا پھر ہر ٹکڑا بڑے ٹیلے کی طرح ہو گیا۔

---

(۱) سورۃ القصص: ۲۸/ ۲۰

(۲) اطلس قرآن، دکتور شوقی ابو فیصل، ترجمہ حافظ محمد امین، ص ۱۴۲

(۳) سورۃ الشعراء: ۲۶/ ۶۳

چنانچہ سمندر درمیان سے پھٹ گیا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم نے بحفاظت سمندر پار کیا اور جب فرعون نے اسی راستے سے گزرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اسے اور اس کی فوج کو سمندر میں غرق کر دیا۔ یوں حق کامیاب ہوا اور باطل مٹ گیا اور یہ واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ عظیم قدرت والا ہے اور اس کا رسول جو شریعت لے کر آیا وہ برحق ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسالیب دعوت تدبر قرآن میں

جابر حکمران کو حصول تزکیہ کی دعوت:

﴿ اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ۝ فَقُلْ هَل لَّكَ إِلَىٰ أَن تَزَكَّىٰ ۝ وَأَهْدِيَكَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَتَخْشَىٰ ﴾ (۱)

ترجمہ: تم فرعون کے پاس جاؤ اس نے بہت سر اٹھایا ہے اس سے کہو کیا تم میں کچھ اپنے آپ کو سدھارنے کا جذبہ ہے کیا میں تمہیں تمہارے رب کی راہ دکھاؤں کہ تم اس سے ڈرنے والے بنو۔

مولانا امین احسن صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہ وہ پیغام حق ہے جو اللہ تعالیٰ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے کر فرعون کے پاس بھیجا تھا۔ فرمایا کہ فرعون کے پاس جاؤ اس نے بہت سر اٹھایا ہے "**طغی**" سے مراد یہاں اس کے رب اعلی کے ہونے کا دعوی اور بنی اسرائیل کے ساتھ جابرانہ رویہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خدائی میں کسی کا یہ دعوی کہ وہ لوگوں کا رب اعلی ہے سب سے بڑی بغاوت ہے اس بغاوت کی سرکوبی کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی خاص سند کے ساتھ اس فرعون کے پاس بھیجا۔ پھر آیت "﴿ فَقُلْ هَل لَّكَ إِلَىٰ أَن تَزَكَّىٰ ﴾ "سورۃ النازعات کی تفسیر میں فرماتے ہیں" حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا کہ فرعون سے کہو کہ تم میں کچھ رغبت پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی ہے کہ میں تمہیں اس کا طریقہ بتانے کی کوشش کروں؟ اس فقرے پر غور فرمایئے تو معلوم ہو گا یہ اس میں بیک وقت انتہائی درجے کی ناصحانہ شفقت بھی ہے اور ساتھ ہی وہ عظمت و جلالت بھی جو اللہ تعالیٰ یا اس کے سفیر کلام میں ہونی چاہیے مطلب یہ ہے کہ اب تک تمہاری جو روش رہی ہے وہ تو یہی بتاتی ہے کہ تم سے کسی خیر کی توقع نہ رکھی جائے لیکن اللہ تعالیٰ بڑا کریم ہے اب بھی گنجائش ہے کہ اگر تم سلامت روی کی زندگی اختیار کرنے کی رغبت ظاہر کرو تو یہ رستہ تم کو دکھانے کی کوشش کی جائے۔

لفظ "تَزَكّٰی" یہاں وسیع معنوں استعمال ہوا ہے یعنی خود سری انانیت اور ظلم وجور سے پاک زندگی جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے بندے کی ہوتی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب مزید فرماتے ہیں کہ انبیا علیہم السلام کی بعثت کا اصل مقصد لوگوں کے نفوس کا تزکیہ ہی رہا ہے اور یہ کام انہوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کی آیات کے ذریعے سے انجام دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بھی یہی ارشاد ہے کہ،

﴿ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ ﴾ (۲)

---

(۱) سورۃ النازعات: ۷۹/ ۱۷، ۱۸، ۱۹

(۲) سورۃ جمعہ: ۶۲/ ۲

ترجمہ: وہی ہے جس نے بھیجا امتیوں میں سے ایک رسول انہی میں سے جو ان کو سناتا ہے اس کی آیات اور ان کو پاکیزہ بناتا ہے۔

اسی مقصد کا اظہار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے فرمایا کہ اگر تم خدائی کے پندار سے ذرا الگ ہو کر اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو تو میں تم کو اللہ کی کچھ باتیں سناؤں" ﴿وَأَهۡدِيَكَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَتَخۡشَىٰ﴾ "یعنی اس وقت تو تمہارے اوپر اپنی خدائی کا بھوت سوار ہے اس وجہ سے بالکل بگٹٹ چل رہے ہو لیکن بات سننے اور سمجھنے کا کچھ شوق ہو تو میں بتاؤں کہ تمہارے تمام جہان کا رب کون ہے جس سے سب کو ڈرنا چاہیے کیونکہ پاکیزہ زندگی خدا کی خشیت سے اور خدا کی خشیت اس کی صحیح معرفت سے پیدا ہوتی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان دو فقروں میں فرعون کی توجہ اسی حقیقت کی طرف دلائی ہے"۔[1]

دعوت و تبلیغ کا اصل مقصد ہی تزکیہ نفس ہے کیونکہ جب نفس پاک ہوتا ہے اور اصلاح پر آمادہ ہو جاتا ہے تو ہی وہ امر بالمعروف کا داعی اور نہی عن المنکر کا حامی بنتا ہے۔

مولانا کے مطابق ایک داعی کو یہ اسلوب بھی اپنانا چاہیے کہ وہ اپنے مخاطب کو ایک دفعہ دعوت دے کر چند لمحوں کے لئے مخاطب کو بھی یہ وقت دے کہ وہ داعی کی دعوت کو پرکھ سکے اور اپنے ضمیر کی آواز کو سن سکے کہ کیا وہ اپنی اصلاح پر آمادہ ہے اور کیا داعی جو دعوت اسے دے رہا ہے اس کے لئے اس کا نفس تیار ہے۔

انبیاء کے اسالیب دعوت میں پہلوئے رفق:

کوئی بھی دعوت اس وقت تک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی جب تک نرم زبان کا استعمال نہ کیا جائے کیونکہ تلخ کلامی تو شیطان کا ہتھیار ہے جس سے نفرت بغض اور دشمنی کی ابتدا ہوتی ہے جیسا کہ قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس اسلوب دعوت کو یوں بیان کیا گیا ہے،

﴿ٱذۡهَبَآ إِلَىٰ فِرۡعَوۡنَ إِنَّهُۥ طَغَىٰ فَقُولَا لَهُۥ قَوۡلٗا لَّيِّنٗا لَّعَلَّهُۥ يَتَذَكَّرُ أَوۡ يَخۡشَىٰ﴾[2]

ترجمہ: تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، بے شک وہ بہت سرکش ہو گیا ہے پس اس کو نرمی کے ساتھ دعوت دو شاید وہ یاد دہانی حاصل کرے یا ڈرے۔

مولانا امین احسن صاحب فرماتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ میں طریقہ دعوت سے متعلق ہدایت ہے کہ دعوت بہر حال نرمی کے ساتھ دی جائے اس ہدایت کی ضرورت صرف اس پہلو سے نہیں تھی کہ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے سامنے ایک بے بس اسرائیلی کی حیثیت سے نہیں بلکہ "خدا کے سفیر" کی حیثیت سے جا رہے تھے اور ہاتھ میں عصائے موسوی

(۱) تدبر قرآن، ۹/ ۱۸۱

(۲) سورۃ طٰہٰ: ۲۰/ ۴۳، ۴۴

بھی تھا بلکہ نرمی دعوت حق کی فطرت ہے۔ حضرات انبیاء کرام کی بعثت تعلیم واصلاح کے لیے ہوئی اس وجہ سے ان کی دعوت اور ان کے انداز میں ایک "مسلم" کی شفقت اور ایک غمگسار کی دلسوزی ہمیشہ نمایاں رہی ہے۔ کسی نبی کے متعلق بھی یہ بات علم میں نہیں آتی کہ اس نے ہیکڑی جتائی یا دھونس جمائی ہو۔ سخت سے سخت حالات مین بھی ان کا طرز خطاب اور انداز جواب نہایت ہی نرم، مؤثر اور ہمدردانہ رہا ہے۔ ہیکڑی جتانا اور دھونس جمانا دنیا پرست لیڈروں کی خصوصیات میں سے ہے۔ موجودہ زمانے کے شیطانی پروپیگنڈے کی تو سمجھیے ساری بنیاد ہی اسی پر ہے۔

"﴿ لَّعَلَّهُۥ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ ﴾" حضرات انبیاء کرام کی دعوت و تعلیم کا اصل مقصد ہی ہوتا ہے کہ مخاطب میں تذکیر اور خشیت پیدا ہو جن کے اندر صرف غفلت ہوتی ہے وہ تو نبی کی تزکیر سے فوراجاگ پڑتے ہیں وہ گویاراستہ بھولے ہوئے ہوتے ہیں۔ بتانے والے نے جونہی ان کو بتایا وہ سیدھی راہ اختیار کر لیتے ہیں دوسرے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی گمراہی پختہ ہوتی ہے اس طرح کے لوگوں کے اندر اگر قبولیت حق کی صلاحیت ہوتی ہے تو نبی کے انذار سے خدا اور اس کی پکڑ کا کچھ خوف پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے لگتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال ہوتی ہے تو وہ ہدایت کی راہ بھی اختیار کر لیتے ہیں یہاں يَتَذَكَّرُ سے پہلی حالت کی طرف اشارہ ہے اور يَخْشَىٰ سے دوسری حالت کی طرف۔[1]

دعوت حق میں نرمی کے استعمال کی یہاں پر مولانا امین احسن صاحب بہت خوبصورت انداز میں نرمی کی وضاحت کرتے ہیں اور ہیکڑی جتائی یا دھونس جمائی جیسے روزمرہ کے الفاظ استعمال کرکے قاری کو مزید متوجہ کرتے ہیں۔

مولانا صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں موجودہ دور کے داعیان دین اور اصلاحی تحریکوں کے لئے حضرت موسیٰؑ پہلوئے رفق کو واضح کرتے ہیں کہ اگر نبی جو خدا کا سفیر بھی ہے اور عالم معجزات بھی رکھتا ہے اور تائید ایزدی کا یقین بھی رکھتا ہے وہ جب اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے تو بھی اس قدر نرمی اور شفقت سے کہ اس کی دلسوزی اس کے حرف حرف سے نمایاں نظر آئے تو آج ہم کیسے بنا سوچے سمجھے دوسروں پر دھونسیں جما سکتے ہیں؟ کیسے کفر کے فتوے لگا سکتے ہیں؟ داعی کا کام نرمی سے دلوں کو اصلاح پر آمادہ کرنا ہے۔

خیر خواہی اور تنبیہ ساتھ ساتھ:

انبیاء کرام کی دعوت کا ایک خصوصی اسلوب خیر خواہی چاہنا اور تنبیہ کرنا بھی ہے جیسا کہ قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس اسلوب کو یوں بیان کیا گیا ہے،

﴿ وَٱلسَّلَٰمُ عَلَىٰ مَنِ ٱتَّبَعَ ٱلْهُدَىٰٓ ٥ إِنَّا قَدْ أُوحِىَ إِلَيْنَآ أَنَّ ٱلْعَذَابَ عَلَىٰ مَن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ﴾[2]

---

(۱) تدبر قرآن، ۵/ ۵۳

(۲) سورۃ طہ: ۲۰/ ۴۷، ۴۸

ترجمہ: اور سلام ہے ان لوگوں پر جو ہدایت کی پیروی کریں ہم پر یہ وحی کی گئی ہے کہ ان لوگوں پر عذاب ہے جو جھٹلائیں اور اعراض کریں۔

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں مولانا انبیاء کے اسالیب دعوت میں سے خیر خواہی اور انذار دونوں کو اکٹھا بیان کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں اس فقرے میں خیر خواہی بھی ہے اور جس کی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہدایت کی گئی ہے آیت نمبر ۴۴ میں نہایت نرمی کے ساتھ دعوت دینا اور ساتھ ہی نہایت لطیف تنبیہ بھی ہے کہ سلامتی صرف ان لوگوں ے لیے ہے جو خدا کی ہدایت کی پیروی کریں مطلب یہ کہ اب تک تو تم نے جو کچھ کیا وہ کیا لیکن اب جب کہ خدا اور اس کے رسولوں کے ذریعے سے تمہارے پاس ہدایت آچکی ہے تو سلامتی کی راہ یہی ہے کہ اس کو سیدھے سیدھے اختیار کر لو ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

اس سے آگے والی آیت

﴿إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَىٰ مَن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ﴾(1)

میں اوپر والی آیت کے مضمر مضمون کو نہایت نرم خو انداز میں کھول دیا کہ ہم پر یہ وحی آتی ہے جو جھٹلائے اور اعراض کرے گا اس کے اوپر عذاب آئے گا۔ مولانا امین احسن صاحب فرماتے ہیں کہ اس آیت پر تدبر کیجیے تو کئی لطیف باتیں سامنے آتی ہیں ایک تو یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے عام لیڈروں کی طرح فرعون پر اپنی طرف سے عذاب کی کوئی دھونس جمانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کو صرف اللہ تعالیٰ کی اس وحی کی خبر دی جو ان پر آئی تھی کہ تکذیب اور اعراض کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ طریقہ انہوں نے اس لیے اختیار کیا کہ اپنی طرف سے فرعون کے لیے کوئی وجہ اشتعال نہ پیدا ہونے دیں۔ دوسرا یہ کہ انہوں نے فرعون کو مخاطب کر کے یوں نہیں فرمایا کہ اگر تو جھٹلائے گا اور اعراض کرے گا تو تجھ پر عذاب الٰہی آدھمکے گا۔

بلکہ بصیغہ عام یوں فرمایا کہ "جو ایسا کرے گا اس کا انجام یہ ہو گا"۔

تاکہ فرعون کے کانوں میں یہ بات پڑ بھی جائے اور اس کی انانیت کو ٹھیس بھی نہ پہنچے۔

تیسری یہ کہ کذب کے مفعول اور تولی کے متعلق دونوں کو یہاں حذف کر دیا گیا یوں نہیں فرمایا کہ جو ہماری رسالت کی تکذیب اور ہماری لائی ہوئی ہدایت سے اعراض کرے گا اس پر عذاب آئے گا اس لیے کہ یہ بات از خود واضح تھی اور اس کے اظہار سے بہر حال فرعون کے پندار کو چوٹ لگی، اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو دعوت میں نرمی جو تلقین فرمائی گئی تھی اس کا طریقہ بھی بتا دیا گیا کہ اس طرح دعوت دینا کہ بات بھی پہنچ جائے اور تمہاری طرف سے اشتعال طبع کا کوئی سبب بھی پیدا نہ ہو۔(2)

---

(۱) سورۃ طٰہٰ: ۲۰/ ۴۸

(۲) تدبر قرآن، ۵/ ۵۵

اور یہی اسالیب دعوت و تبلیغ میں داعیان کرام کے لیے نمایاں اسلوب اور راہ ہدایت ہے۔

وہ دوسروں کی ہدایت کے لئے انہیں یوں اصلاح پر آمادہ کریں کہ مخاطب اس میں اپنی ذلت اور کمتری بھی محسوس نہ کرے اور شیطان بھی انہیں یہ بہکاوا نہ دے سکے کہ تمہیں گمراہ سمجھا جارہا ہے اور نہ ہی دعوت میں ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جس سے دوسروں کی عزت نفس مجروح ہو۔

اسالیب دعوت میں تعلیم بالقلم کا اہتمام:

﴿وَكَتَبْنَا لَهُۥ فِى ٱلْأَلْوَاحِ مِن كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا۟ بِأَحْسَنِهَا ۚ سَأُو۟رِيكُمْ دَارَ ٱلْفَٰسِقِينَ﴾[1]

اور ہم نے اس کے لیے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی پس اس کو مضبوطی سے پکڑو اور اپنی قوم کو ہدایت کرو کہ اس کے بہتر طریقے کو اپنائیں میں عنقریب تم کو نافرمانوں کا ٹھکانہ دکھاؤں گا۔

مولانا امین صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ تختیوں پر اللہ تعالیٰ نے خود لکھا یا اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت موسیٰ علیہ السلام نے لکھا۔ تورات سے دونوں باتیں نکلتی ہیں:

"اور موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کے پاس جا کر خداوند کی تمام باتیں اور احکام ان کو بتا دیے اور سب لوگون نے ہم آواز ہو کر جواب دیا کہ جتنی باتیں خداوند نے فرمائی ہیں ہم ان سب کو مانیں گے اور موسیٰ علیہ السلام نے خداوند کی سب باتیں لکھ لیں"[2]

خروج میں ہی ایک دوسرے مقام پر اس بات کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ،

"اور موسیٰ علیہ السلام شہادت کی دونوں لوحیں لیے ہوئے الٹا پھرا اور پہاڑ سے نیچے اترا اور وہ لوحیں ادھر سے ادھر سے دونوں طرف سے لکھی ہوئی تھیں اور وہ لوحیں خدا ہی کی بنائی ہوئی تھیں اور جو لکھا تھا وہ بھی خدا ہی کا لکھا ہوا اور ان پر کندہ کیا ہوا تھا"۔[3]

قرآن کے الفاظ دونوں معنوں کو متحمل ہیں اور اصلاً دونوں میں کوئی فرق ہے بھی نہیں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت لکھا تو یہ اللہ نے ہی لکھا۔ ایک پل کی تعمیر ایک انجنیئر کرتا ہے لیکن بادشاہ یا حکومت کے حکم اور اس کے منصوبے اور نقشے کے تحت کرتا ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ بادشاہ یا حکومت نے پل بنایا قرآن کی حفاظت کا اہتمام

---

(۱)سورۃ اعراف:۷/ ۱۴۵

(۲)باب خروج ۲۴/ ۳-۴

(۳)باب خروج ۳۲/ ۱۵-۱۶

پیغمبر ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کے ہاتھ بے شک عمل میں آیا لیکن چونکہ اللہ کی ہدایت کے تحت عمل میں آیا اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے خود لیا ہے۔ یہ الفاظ اس اہتمام کو ظاہر کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو شریعت دینے کے معاملے میں فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام آئے انہوں نے اپنی امتوں کو زبانی تعلیم دی لیکن بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے تعلیم بالقلم کا اہتمام فرمایا ان کے پیغمبر نے صرف قول و عمل ہی سے ان کو نہیں بتایا اور سکھایا بلکہ ان کے لیے سب کچھ قلم بند بھی کر دیا کہ اللہ کی شریعت ان کو سب سے زیادہ محفوظ و مامون شکل میں ملے لیکن اس اہتمام کی انہوں نے کوئی قدر نہ کی۔ امین صاحب فرماتے ہیں کہ ان تختیوں میں دین و شریعت کی تمام باتیں اور جماعتی تنظیم و تشکیل سے متعلق تفصیلات درج تھیں۔[۱]

دعوت و تبلیغ میں قلم کا استعمال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور سے شروع ہوا اور یہی طریقہ آج کے دور میں بھی رائج ہے کیونکہ بعض دفعہ کہی ہوئی بات کی نسبت لکھی ہوئی بات زیادہ اثر رکھتی ہے لہٰذا داعیان کرام کے لیے تعلیم قرآن ضروری ہے تاکہ وہ قلم کے استعمال سے آگاہ ہوں اور قلم کو دعوت و تبلیغ کا ذریعہ بنایا جا سکے۔

اصلاحی صاحب نے دعوت و تبلیغ کے موضوع پر خود بھی بہت سے کام کیا ہے ان کی تصنیفات میں دعوت و اصلاح کو مرکزی حیثیت حاصل ہے ان کی تصنیف دعوت دین اور اس کا طریقہ کار، دعوت دین اور اس کے تقاضے، انبیاء کا طرز استدلال اور تفسیر تدبر قرآن ان کی تعلیم بالقلم یا دعوت بالقلم کا عملی ثبوت ہے۔

دعوت و تبلیغ کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوت اظہار و بیان عطا کیے جانے کی درخواست:

داعی دعوت و تبلیغ کے ہر مرحلے میں اللہ تعالیٰ کی مدد کا طلبگار اور نصرت کا خواہاں ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر کسی کام کو پایا تکمیل تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم میں یہ بات آئی کہ اب ان پر فریضہ رسالت کی ذمہ داریاں ڈال دی گئی ہیں اور اب انہیں فرعون کے پاس خدا کے رسول کی حیثیت سے دعوت و تبلیغ کے لیے جانا ہے تو انہوں نے فوراً یہ دعا کی،

﴿قَالَ رَبِّ ٱشْرَحْ لِى صَدْرِى ٥ وَيَسِّرْ لِىٓ أَمْرِى ٥ وَٱحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِى ٥ يَفْقَهُوا۟ قَوْلِى﴾[۲]

ترجمہ: اے میرے رب! میرے سینے کو میرے لیے کھول دے اور میری مہم کو آسان کر دے اور میر زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات سمجھیں۔

---

(۱) تدبر قرآن، ۳/ ۳۶۳

(۲) سورۃ طٰہٰ: ۲۰ / ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸

مولانا احسن صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام السلام کی مانگی ہوئی دعا کے ہر لفظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس بوجھ کو کس قدر بھاری محسوس کیا اور کس دلسوزی کے ساتھ اس بار گراں کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں اللہ تعالیٰ سے مدد اور رہنمائی کے لیے التجا کی انبیاء کرام کا سینہ ہوس سے پاک ہوتا ہے پھر بھی جب اللہ ان کو امامت کے منصب پر فائز کرتا ہے تو وہ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انہیں ہمت و قوت بخشے اور ان کی ہر قدم پر دستگیری فرمائے "﴿ قَالَ رَبِّ ٱشْرَحْ لِي صَدْرِي ﴾" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلی دعا ہی شرح صدر کے لیے فرمائی اگر ذمہ داری بھاری ہو تو ہر حساس آدمی کا سینہ بھینچتا ہے یہ ہی انسان کے فرض شناس ہونے کی دلیل ہے ظاہر ہے کہ سینے کی یہ خلش اللہ تعالیٰ کے فضل سے دور ہو سکتی ہے وہی دل میں ہمت و عزیمت ڈالتا ہے اور وہی علم ویقین کی روشنی عطا کرتا ہے۔"﴿ وَيَسِّرْ لِيٓ أَمْرِي ﴾" اندرونی خلش کے ازالہ کی دعا کے بعد یہ حالات کی ہمواری اور مہم کی کامیابی کے لیے دعا ہے کہ ہر چند یہ سخت مہم ہے لیکن اللہ ہر مشکل کو آسان کر سکتا ہے۔﴿ وَٱحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ٥ يَفْقَهُواْ قَوْلِي ﴾ یہ مقصد دعوت کے لیے قوت اظہار و بیان عطا کیے جانے کی درخواست ہے۔ امین احسن صاحب فرماتے ہیں کہ اس دور میں ابلاغ کا واحد ذریعہ کسی خطیب کی خطابت اور زبان آوری ہی تھی یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں خطیبوں کو سوسائٹی میں سب سے زیادہ عزت حاصل تھی عرب میں میں تو یہ حال تھا کہ جو شخص قبیلے کا خطیب ہوتا وہی اس کا زعیم اور قائد ہوتا۔ جوہر خطابت کے بغیر اس دور میں کوئی شخص قیادت وامارت کی ذمہ داریاں کماحقہ، ادا نہیں کر سکتا اب پریس کی ایجاد نے قلم کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے لیکن پریس کی ایجاد سے سے پہلے خطابت اور زبان آوری کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام زبان آور خطیب نہ تھے خطابت وزبان آوری ہر چیز نبوت ورسالت کے لوازم میں سے نہیں ہے لیکن دعوت و تبلیغ کے اعتبار سے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے اسی وجہ سے جب ان پر رسالت کی ذمہ داری ڈالی گئی تو ان کو اپنی اس کمی کا احساس ہوا اور شرح صدر کی دعا کے ساتھ انہوں نے اظہار بیان کی قوت بخشے جانے کی بھی دعا فرمائی کہ اے میرے رب میری زبان کو قوت اور روانی عطا فرما تا کہ میں اپنی اس دعوت کو یوں پیش کر سکوں کہ لوگ میری بات کو سنیں اور سمجھیں۔ (۱)

مولانا اصلاحی آیت مبارکہ کی تفسیر میں ابلاغ اور پریس کی اہمیت کو دعوت و تبلیغ میں اجاگر کرتے ہیں مولانا خود بھی اعلیٰ پائے کی خطیبانہ صلاحیتیں رکھتے تھے اور ان کے اصلاحی اور دعوتی مضامین ماہنامہ منبر، میثاق، ماہنامہ تدبر میں شائع ہوتے رہے ہیں مولانا دور حاضر کے داعیان کرام کے لئے بھی پریس کے استعمال اور اس کی آفادیت کو ظاہر کرتے ہیں اور یہ فی زمانہ دعوت کی اشاعت کا موثر ترین ذریعہ ہے۔

اسی مضمون کو سورۃ الشعراء کی آیت نمبر ۱۳ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

---

(۱) تدبر قرآن، ۵/ ۳۷، ۳۸

اقامت دین کی جدوجہد میں وسیلہ ظفر "صبر اور نماز":

انسانوں میں سب سے زیادہ نیک نفس عالی وقار اور بنی نوع انسان کے ہمدرد انبیاء علیہم السلام تھے مگر ان پاک ہستیوں نے بھی جب مخلوق خدا کو کائنات کا پیغام پہنچایا تو ان کی قوموں نے انہیں سخت تنگ کیا مگر انہوں نے صبر واستقلال کا دامن تھامے رکھا۔ سورۃ آل عمران کی آخری آیت میں ارشاد ہے،

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱصۡبِرُواْ وَصَابِرُواْ وَرَابِطُواْ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُونَ ﴾ (۱)

ترجمہ: اے ایمان والو صبر سے کام لو باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ حق کی خدمت کے لیے کمربستہ رہو اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ پورے کامیاب ہو۔

فرعون کے ظلم وستم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو صبر و تحمل کی نصیحت میں داعیان توحید ورسالت کے لیے استقامت واستقلال کا درس ہے۔ داعیان دعوت توحید کو ہمیشہ صبر کا دامن تھامے رکھنا چاہیے فرعون کی قتل وغارت اور طرح طرح کے عذابوں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو درج ذیل تسلی دی جو ہر داعی حق کے لیے تاقیامت تشفی کا باعث ہے،

﴿ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوۡمِهِ ٱسۡتَعِينُواْ بِٱللَّهِ وَٱصۡبِرُوٓاْۖ إِنَّ ٱلۡأَرۡضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن يَشَآءُ مِنۡ عِبَادِهِۦۖ وَٱلۡعَٰقِبَةُ لِلۡمُتَّقِينَ ﴾ (۲)

ترجمہ: موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد چاہو اور ثابت قدم رہو زمین اللہ کی ہے وہ جس کو اپنے بندوں میں سے چاہتا ہے اس کو اس کا وارث بناتا ہے اور انجام کار کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے۔

مولانا امین احسن صاحب اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اقامت دین کی جدوجہد میں "صبر اور نماز" دو بنیادی ارکان ہیں مزید تشریح فرماتے ہیں کہ قرآن میں تدبر کرنے والوں پر یہ حقیقت واضح ہے کہ اقامت دین کی جدوجہد میں کامیابی کا انحصار اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں پر رکھا ہے ایک صبر اور دوسرے نماز پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے اندر اقامت دین کی جو جدوجہد شروع کی اس میں اپنی قوم کو انہی دو چیزوں سے مدد حاصل کرنے کی تلقین کی اس آیت مبارکہ میں اگرچہ نماز کی بجائے "استعینو باللہ" یعنی اللہ کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے استعانت کا واحد ذریعہ نماز ہے۔ فرعون نے بنی اسرائیل کو دبانے کے لیے جو حربے آزمائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو صبر اور نماز کی تلقین

---

(۱) سورۃ آل عمران: ۳/ ۲۰۰

(۲) سورۃ الاعراف: ۷/ ۱۲۸

فرمائی فتنوں اور آزمائشوں میں استقامت بڑا کٹھن کام ہے اور یہ کام اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں اور اللہ کی مدد حاصل کرنے کا واحد ذریعہ "نماز" ہی ہے۔[۱]

مولانا امین صاحب سورۃ بقرۃ کی آیت نمبر ۱۵۳ کی تفسیر میں نماز اور صبر کو اقامت دین کی جدوجہد میں کامیابی کا انحصار قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ صبر اور نماز یہ دو ہتھیار ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حق و باطل کی کشمکش میں باطل کا مقابلہ کرنے کے لیے دیئے ہیں یہاں ایک اور لطیف نکتہ بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ جہاں جہاں نماز کا ذکر اقامت دین کی جدوجہد کے ساتھ ہوا یہ وسیلہ ہتھیار کی حیثیت سے ہوا ہے وہاں اول تو اس کے ساتھ صبر کا ذکر ہوا ہے ثانیا صبر کا ذکر ہر جگہ نماز پر مقدم ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق کو قائم کرنے اور باطل کو شکست دینے کی جدوجہد میں مقدم سے جو مطلوب ہے وہ مردانہ اقدام اور راہِ حق میں عزیمت و ستقامت ہے آدمی اگر اپنے اس جوہر کو نمایاں کرے اور ساتھ ہی نماز کا اہتمام کرے تو اس کے جوہر کو جلا ملتی ہے اور راہ حق کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کا سینہ کھلتا ہے اور اس کا دل ایمان ویقین سے لبریز ہوتا ہے لیکن آدمی اگر اپنے ارادے اور عزم کو حرکت نہ دے صرف کسی حجرے میں بیٹھا ہوا اللہ کا ورد کرتا رہے تو پھر اصلاح کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔[۲]

کاروان حق کو مسلسل رواں رہنا چاہیے ان کی جدوجہد مسلسل اور عمل پیہم ہونی چاہیے ان کی راہ میں وقتی تکالیف اور مشکلات آئیں تو انہیں صبر ورضا سے برداشت کرنا چاہیے کیونکہ کامیابی بالا آخر انہی کو ملتی ہے جو صبر اور نماز کا دامن تھامے رکھتے ہیں امین احسن صاحب سورۃ بقرہ کی تفسیر میں نماز کی اہمیت دعوت و تبلیغ میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس دعوت یا تحریک میں نماز کو اولیت واہمیت حاصل نہ ہو وہ تجدید دین اور اصلاح ملت کے نقطہ نظر سے ایک بے برکت بلکہ لا حاصل کام ہے کیونکہ وہ اس ریڑھ کی ہڈی سے بھی محروم ہے جس پر تجدید دین کی دعوت کا قالب کھڑا ہوتا ہے اور اس روح سے بھی محروم ہے جس سے اس قالب کو زندگی حاصل ہوتی ہے کیونکہ قرآن کے نزدیک نماز ہی وسیلہ ظفر ہے اور یہی اصلاح کا راستہ ہے اور جو لوگ یہ راستہ اختیار کریں وہی لوگ ملت کے حقیقی مصلح ہیں جن کا اجر اللہ ضائع نہیں کرے گا۔

کیونکہ نماز ہی دین کا ستون ہے نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے جو مانگو گے میرے اللہ دیں گے نماز پڑھ کر مانگنے سے تو تخت سلیمان ملا تھا آپ کو بھی وہ سب مل جائے گا جو آپ مانگیں گے۔

---

(۱) تدبر قرآن، ۳/ ۳۵۱

(۲) تدبر قرآن، ۱/ ۲۰۲

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دعوت و تبلیغ میں توکل علی اللہ:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی کمزوری اور قبول حق کی ہچکچاہٹ کو دیکھتے ہوئے ایمان باللہ کی حقیقت سمجھائی کہ ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی راہ میں کسی کا ڈر اور کسی کا لحاظ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ اور توکل کرنا چاہیے کیونکہ توکل کا تقاضا اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کرنا ہے اور یہی اسلام ہے اور توکل کو سورۃ یونس میں یوں بیان کیا گیا ہے،

﴿ وَقَالَ مُوسَىٰ يَٰقَوۡمِ إِن كُنتُمۡ ءَامَنتُم بِٱللَّهِ فَعَلَيۡهِ تَوَكَّلُوٓاْ إِن كُنتُم مُّسۡلِمِينَ ۝ فَقَالُواْ عَلَى ٱللَّهِ تَوَكَّلۡنَا رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَةٗ لِّلۡقَوۡمِ ٱلظَّٰلِمِينَ ۝ وَنَجِّنَا بِرَحۡمَتِكَ مِنَ ٱلۡقَوۡمِ ٱلۡكَٰفِرِينَ ﴾[۱]

ترجمہ: اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو اگر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر چکے ہو وہ بولے کہ ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا اے ہمارے رب ہمیں ظالموں کے ظلم کی آماجگاہ نہ بنا اور ہمیں اپنے فضل سے کافروں کے پنجہ ستم سے چھڑا۔

مولانا آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں کو ایمان باللہ کی حقیقت سمجھائی ہے کہ اگر ایمان کا اظہار کیا ہے تو اس ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی راہ میں کسی ڈر اور کسی کا لحاظ حائل نہیں ہونا چاہیے بلکہ سب سے بے نیاز اور بے پرواہ ہو کر اللہ کی راہ میں بڑھنا چاہیے اور اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے کہ جس نے یہ راہ کھولی ہے وہی اس میں پیش آنے والی مشکلات میں ناصر و مددگار ہو گا گویا ایمان کا لازمی تقاضا اللہ پر توکل ہے اور اس توکل کا لازمی تقاضا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالے کر دے اور یہ حوالگی اصل اسلام ہے۔

"﴿ فَقَالُواْ عَلَى ٱللَّهِ تَوَكَّلۡنَا ﴾" حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے ان کی تعلیم قبول کی اور چونکہ وہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ اس توکل کے معنی گوشہ نشینی کے ہیں بلکہ اللہ کی راہ میں سر فروشی اور جاں بازی کے ہیں اسی وجہ سے عزم با جزم کے اظہار کے ساتھ ہی انہوں نے دعا کی کہ اے ہمارے رب ہمیں ظالموں کے لیے فتنہ نہ بنانا یہاں فتنہ کے معنی ہدف اور نشانہ کے ہیں مطلب یہ کہ ان کو اتنی ڈھیل نہ دینا کہ وہ ہمیں ہمارے دین سے پھیرنے کے لیے ہم کو بلکل ہی مظالم کی آماجگاہ بنالیں اس سے معلوم ہوا اللہ پر توکل کے تقاضے پورے کرنے کے لیے جس طرح بندے کا عزم راسخ ہونا ضروری ہے اسی طرح ہر قدم پر اللہ تعالیٰ سے دعا و استعانت بھی ضروری ہے کہ وہ راہ کے فتنوں سے امان میں رکھے اور جو فتنے پیش آئیں ان سے عہدہ بر آ ہونے کی توفیق دے۔[۲]

---

(۲) سورۃ یونس: ۱۰/ ۸۶،۸۵،۸۴

(۲) تدبر قرآن، ۴/ ۸۰

توکل علی اللہ داعیان کرام کے لیے وہ اہم صفت ہے جو انہیں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہے اور کوئی ان کی دعوت و تبلیغ پر لبیک کہے نہ کہے وہ مایوس نہیں ہوتے اور توکل علی اللہ کرتے ہوئے اپنے مشن کو جاری رکھتے ہیں۔

طنز کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مخالفین کو مختصر مگر دندان شکن جواب:

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو جو پیغام دے کر فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا وہ پیغام وہ لے کر گئے اور ہدایت الٰہی کے مطابق اس کو فرعون تک انہوں نے پہنچا بھی دیا یہ سن کر فرعون بولا کہ،

﴿قَالَ فَمَن رَّبُّكُمَا يَٰمُوسَىٰ﴾[1]

ترجمہ: فرعون بولا! اے موسیٰ علیہ السلام تم دونوں کا رب کون ہے؟

یعنی تم جو رب کے رسول بن کر آئے ہو تو آخر وہ رب کون ہے؟ رب تو میں ہوں تو آخر تم میرے دربار میں اور کس رب کے رسول بن کر آئے ہو فرعون کا یہ سوال بطور طنز و تحقیر کے تھا کیونکہ بنی اسرائیل کے خدا کی حیثیت مصر میں ایک بے جان خدا کی تھی جس کا نام تو بنی اسرائیل اپنے گھروں میں شاید لیتے تو ہوں گے مگر عملی معاملات میں خدائی فرعون کی ہی تھی پہلی مرتبہ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام نے خدا کو فرعون کے سامنے ایک زندہ خدا کی حیثیت سے پیش کیا اور نہ صرف پیش کیا بلکہ اہم مطالبات بھی سامنے رکھے اور وہ بھی اس تنبیہ کے ساتھ کہا کہ اگر سلامتی چاہتے ہو تو ہماری بات مانو ورنہ اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تورات میں فرعون کے جواب کو یوں بیان کیا گیا ہے،

"فرعون نے کہا خداوند کون ہے کہ میں اس کی آواز سنوں کہ بنی اسرائیل کو جانے دوں؟ میں خداوند کو نہیں جانتا اور نہ ہی بنی اسرائیل کو جانے دوں گا۔"[2]

اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مختصر مگر دندان شکن جواب دیا،

﴿قَالَ رَبُّنَا ٱلَّذِىٓ أَعْطَىٰ كُلَّ شَىْءٍ خَلْقَهُۥ ثُمَّ هَدَىٰ﴾[3]

ترجمہ: حضرت موسیٰ نے جواب دیا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا فرمائی پھر اس کی رہنمائی کی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر شے اپنے مقصد وجود کے اعتبار سے ایک خاص قالب و ہیت رکھتی ہے اور پھر اس مقصد وجود کی تحصیل و تکمیل ے لیے اپنے اندر ایک جبلی رہنمائی بھی رکھتی ہے شہد کی مکھی کو جس مقصد کے لیے خالق نے پیدا کیا ہے اس کی تکمیل کے لیے اس کے ننھے سے وجود کے اندر اس کے خالق نے وہ تمام قوتیں اور صلاحیتیں

---

(۱) سورۃ طہٰ: ۲۰ / ۴۹

(۲) کتاب خروج، ۵ / ۲

(۳) سورۃ طہٰ: ۲۰ / ۵۰

ودیعت فرمائی ہیں اور پھر ان صلاحیتوں کے استعمال کا طریقہ بھی بتایا۔ بلبل کی نغمی سنجی طوطی کی شکر فشانی کوئل کی کوک کس کا الہام ہے ظاہر ہے کہ ان کے خالق تو وہی ہے جو سب کا رب بھی ہے۔

امین صاحب کائنات سے مزید مثالیں دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ صرف جاندار چیزوں تک ہی قدرت کا فیض محدود نہیں بلکہ چمن کے بیل بوٹے جو ثمر باری اور گل ریزی کرتے ہیں سوسن بنفشہ گلاب اور سرو وصنوبر جو چون آرائی کرتے ہیں یہ سیب انار اور انگور جو دعوت شوق دیتے ہیں آخر یہ کس کی عطا کردہ جبلت اور یہ کس کی بخشی ہوئی خلقت ہے یہ الگ مزاج رنگ وبو اور الگ الگ فوائد ونقصانات کون ودیعت کرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ جو کرتا ہے وہی رب ہے نا کہ ہر وہ شخص جو سر پر تاج اوڑھ لے اور خدائی کا دعوی دار بن بیٹھے اور رب بن جائے۔ (۱)

اسی طرح امین احسن اصلاحی صاحب یہاں کائنات سے بہت سی مثالیں دے کر بیان کرتے ہیں کہ رب کون ہے؟ لیکن اس موقع پر حضرت موسٰی علیہ السلام نے جو جواب دیا وہ نہایت مختصر الفاظ میں دیا لیکن اس کے اندر تفصیل نہایت طویل مضمر ہے اگرچہ الفاظ نہایت نرم ہیں لیکن جوابات نہایت دندان شکن ہے انہوں نے نہایت جامع الفاظ میں فرعون پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ رب ہونے کا حق دار تو وہی ہے جس نے خلق کو پیدا کیا اور ہدایت بخشی تمہارا حصہ نہ تو ہدایت میں ہے تو تم رب ہونے کے مدعی کس طرح بن بیٹھے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان پر خدا کی حجت قائم کر دینے کے لیے تو اس کی فطرت اور عقل کی رہنمائی ہی کافی ہے یہ تو اللہ کا مزید فضل وکرم ہے کہ اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں اور اپنی کتابوں اور صحیفوں کے ذریعے سے بھی انسان کی ہدایت کا انتظام کیا۔ فرعون کو اس تحقیر آمیز رویے میں پوچھے گئے سوالات پر جس طرح حضرت موسٰی علیہ السلام بنا غصہ دکھائے پر وقار انداز میں مختصر مگر جامع اور دندان شکن جواب دیتے ہیں اس سے حق کی حقانیت کھل کر واضح ہو جاتی ہے۔

حضرت موسٰی علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے اپنی تقصیر کا اعتراف:

توبہ واستغفار کا اسلوب بھی اسالیب دعوت میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ داعی خود بھی اپنے گناہوں اور لغزشوں کی بنا پر ہر وقت استغفار کرتا ہے اور لوگوں کو بھی اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ وہ گناہوں کی معافی طلب کرے ورنہ اگر گناہوں پر استغفار نہ کی جائے اور توبہ ومعافی کی طرف متوجہ نہ ہوا جائے تو دلوں کو زنگ لگ جاتا ہے اور دلوں کا زنگ انسانیت کی تباہی کی پہلی سیڑھی ہے جس کے بعد انسان انسانیت کے اعلی مقام سے دور اور حیوانیت کی شاہراہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ انبیاء کرام لغزشوں سے پاک اور معصوم عن الخطا ہوتے ہیں تاہم وہ بھی اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار طلب کرتے ہیں۔ حضرت موسٰی علیہ السلام جب جوان ہوئے اور ان کے اندر وہ محبت وغیرت پیدا ہوئی جو صالح جوانی اور علم ومعرفت کا خاصہ ہے تو وہ وقتاً فوقتاً شہر میں اپنے مظلوم بھائیوں کا حال دیکھنے کے لیے جانے لگے ایک دفعہ انہوں نے ایک اسرائیلی اور قبطی کو لڑتے ہوئے دیکھا اور

(۱) تدبر قرآن، ۵/ ۵۶

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو مظلوم دیکھ کر بتقضائے حمایت حق اس کی مدد کے لیے آگے بڑھے اور چاہا کہ بیچ بچاؤ کرادیں لیکن قبطی اپنی رعونت کے سبب ان سے الجھ پڑا انہوں نے اپنی مدافعت میں اسے گھونسا مارا تو وہ وہیں ڈھیر ہو گیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اس کے قتل کرنے کا ارادہ نہ تھا اور بے ارادہ جب یہ حادثہ پیش آگیا تو انہوں نے فوراً اپنی غلطی پہ سخت پشیمانی محسوس کی اور اپنے رب سے معافی مانگی کہ:

﴿قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾[1]

ترجمہ: اے رب میں نے اپنی جان پر سخت ظلم ڈھایا تو مجھے معاف فرمادے۔

چونکہ ان سے غلطی بے ارادہ ہوئی تھی پھر بھی انہوں نے فوراً معافی مانگی جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا اللہ تعالیٰ غفور والرحیم ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھرپور جوانی کے ساتھ اپنی حکمت و معرفت سے بھی نوازا تھا اور یہ اسی حکمت و معرفت کا کرشمہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام تو ایک تگڑے جوان ہونے کی وجہ سے اس پر فخر سے پھولے نہ سماتے بالخصوص ایک قبطی کے اس طرح قتل کو تو وہ اپنا ایک زندہ وجاوید کارنامہ سمجھتے لیکن انہوں نے اپنے دشمنوں کے مقابلے میں اپنی ایک غیر ارادی غلطی کو بھی اپنا ایک جرم سمجھا اور اپنے رب سے اس کی فوراً معافی مانگی اور جب اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا تو انہوں نے کہا،

﴿قَالَ رَبِّ بِمَا أَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ﴾[2]

ترجمہ: اس نے کہا اے رب! چونکہ تو نے مجھ پر فضل فرمایا تو میں عہد کرتا ہوں کہ میں مجرموں کا مددگار کبھی نہیں بنوں گا۔

پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی غیر ارادی غلطی کے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے استغفار طلب کی اور پھر جب اللہ نے انہیں معافی کی بشارت دے دی تو انہوں نے شکر ادا کیا کیونکہ نعمت صالحین کے لیے شکر میں اضافہ کرتی ہے اس وجہ سے جب اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ فضل فرمایا کہ ان کو معافی دے دی تو انہوں نے یہ عہد فرمایا کہ اب میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا۔ دعوت وتبلیغ میں ایک داعی کی ذات دوسروں کے لیے نمونہ ہوتی ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود بھی اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کی اور بنی اسرائیل کو بھی بچھڑے کو معبود بنانے کے بعد استغفار کی طرف متوجہ کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لیے اور اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کے لیے بھی معافی کی دعا مانگی۔[3]

سورۃ اعراف میں ہے،

---

(۱) سورۃ القصص: ۲۸/ ۱۶

(۲) سورۃ القصص: ۲۸/ ۱۷

(۳) تدبر القرآن: ۵/ ۶۶۳

﴿قَالَ رَبِّ ٱغۡفِرۡ لِي وَلِأَخِي وَأَدۡخِلۡنَا فِي رَحۡمَتِكَۖ وَأَنتَ أَرۡحَمُ ٱلرَّٰحِمِينَ﴾ [۱]

ترجمہ: تب موسیٰ نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

مولانا امین صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ گوسالہ پرستی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کے عذر کو قبول کیا کہ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ وہ اپنا سر دے کر بھی اس فتنہ کو روک نہیں سکتے تھے تو ان کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ اس سے اپنے آپ کو الگ رکھیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتظار کریں صورت معاملہ واضح ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اور اپنے بھائی کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگی اور پہلے اپنے لیے مغفرت مانگی اس لیے دعائے مغفرت میں صحیح آداب یہی ہے اور اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ حمیت حق کے جوش میں بھائی سے اگر کوئی زیادتی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائے۔ [۲]

دعوت و تبلیغ کی کامیابی کے لیے توبہ واستغفار لازمی ہے اور داعیان کرام کے لیے بہترین اسلوب بھی۔ توبہ استغفار تو ہر انسان کے لئے ضروری ہے لیکن داعی حضرات کے لئے تو اس لئے بھی زیادہ ضروری ہے کہ شیطان انہیں گمراہ کرنے کی کوشش نہ کرے اور وہ اپنے دل میں اس غرور و تکبر کو جگہ نہ دے کہ وہ دین کی بڑی خدمت کر رہے ہیں یا وہ خود کو متقی پرہیز گار اور اعلی انسان جبکہ دوسروں کو گناہ گار اور حقیر و ذلیل نہ سمجھے کیونکہ غرور و تکبر کے دلوں میں آجانے سے تمام اعمال ضائع ہو جاتے ہیں انسان خود کو دین کا ٹھیکہ دار سمجھتا ہے جبکہ توبہ استغفار سے اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل ہوتی ہے اور عاجزی و انکساری پیدا ہوتی ہے جس سے لوگ متاثر ہو کر داعی کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔

---

(۱) سورۃ اعراف:۷/ ۱۵۱

(۲) تدبر قرآن ۳/۳۶۹

فصل دوم

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسالیب دعوت تفہیم القرآن کی روشنی میں

حضرت موسٰی علیہ السلام کا ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق بلند کرنا:

حضرت موسٰی علیہ السلام کو رسالت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد جو سب سے پہلا حکم دیا گیا وہ یہی تھا کہ فرعون کو دعوت حق دی جائے۔ اللہ تعالیٰ کو حضرت موسٰی علیہ السلام کے مزاج اور انداز بیان کی تیزی کا بھی پتا تھا اور فرعون کے غرور اور طغیان کا بھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں معجزات سے بھی نوازا۔ قرآن پاک میں حضرت موسٰی علیہ السلام کی دعوت توحید کو یوں بیان کیا گیا ہے،

﴿هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ ۝ إِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ۝ فَقُلْ هَل لَّكَ إِلَىٰ أَن تَزَكَّىٰ﴾[۱]

ترجمہ؛ کیا تمہیں موسٰی کے قصے کی خبر پہنچی ہے؟ جب اس کے رب نے اسے طوی کی مقدس وادی میں پکارا تھا کہ فرعون کے پاس جا وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس سے کہہ کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں اور اس کا خوف تیرے اندر پیدا ہو۔

مودودی صاحب آیت مبارک کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ حضرت موسٰی علیہ السلام کو پہلا حکم ہی فرعون کو دعوت دینے کا ملا فرعون کی سرکشی کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خالق اور خلق دونوں کے مقابلے میں سرکشی کرنا ہے خالق کے مقابلے میں فرعون کی سرکشی یہ تھی کہ اس نے اعلان کر رکھا تھا کہ "وہ رب ہے "(نعوذ باللہ) اور خلق کے مقابلے میں اس کی سرکشی یہ تھی کہ اس نے اپنی مملکت کے باشندوں کو مختلف گروہوں اور طبقوں میں بانٹ رکھا تھا کمزور طبقوں پر وہ ظلم ڈھاتا تھا اور قوم کو اس نے غلام بنا رکھا تھا۔[۲]

حضرت موسٰی علیہ السلام نے فرعون جیسے خدائی کے دعویدار اور ظالم حکمران کے سامنے نہایت جرأت سے کلمہ حق بلند کیا۔

سورۃ الشعراء کی تفسیر میں مولانا اس مضمون کو یوں بیان کرتے ہیں" حضرت موسٰی علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی دعوت کے دو جز تھے: ایک فرعون کو اللہ کی بندگی کی طرف بلانا جو تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا اصل مقصد رہا ہے دوسرے بنی اسرائیل کو فرعون کے بند غلامی سے نکالنا جو مخصوص طور پر انہی دونوں حضرات کا مشن تھا۔ قرآن مجید میں کسی جگہ صرف پہلے جز کا ذکر کیا گیا ہے اور کسی جگہ صرف دوسرے جز کا"۔[۳]

---

(۱) سورۃ النازعات:۷۹/ ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸

(۲) تفہیم القرآن، ۶/ ۲۴۱

(۳) تفہیم القرآن، ۳/ ۴۸۳

مودودی صاحب سورۃ النازعات کی آیت مبارکہ ۱۵ تا ۱۸ کی تفسیر میں مزید فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا پہلا مقصد فرعون اور اس کی قوم کو کو راہ راست دکھانا ہے ان آیات میں بھی موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے سامنے صرف حق کی تبلیغ پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔[۱]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ربانی نرم زبان میں گفتگو:

نرم زبان میں گفتگو اسالیب دعوت کی جان ہے کیونکہ نرم زبان اور شفقت مزاجی سے دل تسخیر ہوتے ہیں اور دل تسخیر ہو جائے تو قومیں تسخیر ہو جایا کرتی ہیں اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے سامنے نرم زبان میں طریق دعوت کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا ہے،

﴿ اذْهَبَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ۝ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ ﴾[۲]

ترجمہ: تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اس نے بڑی سرکشی کی ہے اسے نرمی سے سمجھاؤ شاید وہ وہ سمجھ لے یا ڈر جائے۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ آدمی کے راہ راست پر آنے کی دو ہی شکلیں ہیں یا تو وہ تفہیم و تلقین سے مطمئن ہو کر صحیح راستہ اختیار کرے یا پھر اگر برے انجام سے ڈر کر سیدھا ہو جاتا ہے۔[۳]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے سے داعیان الی اللہ کو یہ درس ملتا ہے کہ وہ دعوت توحید دیتے وقت نیز امر بالمعرف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے وقت سامعین کے ساتھ نرم اور شائستہ انداز گفتگو اختیار کریں کیونکہ سختی اور درشتی سے لوگ متنفر ہو جاتے ہیں اور دعوت حق سے دور ہو جاتے ہیں غالباً یہ ہدایات اس وقت دی گئی جب موسیٰ علیہ السلام مصر پہنچ گئے اور حضرت ہارون علیہ السلام بھی ساتھ شامل تھے ان ہدایات میں دو چیزیں واضح ہیں ایک ذکر الٰہی اور دوسری نرم بات تیسری بات کا تعلق مقصد دعوت یا نتیجہ دعوت سے ہے اور حق کی طرف بلانے والوں کے لیے لازمی ہے کہ ان کی زبان شیریں اور رویہ ہمدردانہ اور گفتگو شفیقانہ ہو جو لوگ دین کے نمائندوں کی حیثیت سے سختی اور کرختگی کا رویہ اختیار کرتے ہیں وہ لوگوں کو دین سے مزید متنفر کرتے ہیں جب کہ نرم خوئی اور خوش خلقی دعوت و تبلیغ کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

تبلیغ حق سے پہلے رب تعالیٰ سے مدد کی استدعا:

فرعون کے پاس جانے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی:

---

(۱) تفہیم القرآن، ۶/ ۲۴۳

(۲) سورۃ طٰہٰ: ۲۰/ ۴۳، ۴۴

(۳) تفہیم القرآن، ۳/ ۹۴

﴿قَالَ رَبِّ ٱشْرَحْ لِي صَدْرِي ٥ وَيَسِّرْ لِيٓ أَمْرِي ٥ وَٱحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ٥ يَفْقَهُواْ قَوْلِي﴾[1]

ترجمہ: اے میرے رب! میرے سینے کو میرے لیے کھول دے اور میری مہم کو آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات سمجھیں۔

مودودی آیت مبارک کی تفسیر بڑے خوبصورت انداز میں کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میرے دل میں اس منصب عظیم کو سنبھالنے کی ہمت پیدا کر دے اور میرا حوصلہ بڑھا دے چونکہ یہ ایک بہت بڑا کام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کیا جا رہا تھا جس کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت تھی اس لیے آپ علیہ السلام نے دعا کی کہ مجھے وہ تحمل وہ بے خوفی اور وہ عزم عطا کر دے جو اس کے لیے درکار ہے۔

دعوت و تبلیغ میں داعی حضرات کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی دعوت کو تمام طبقوں میں پھیلا دیں دعوت دینے کے معاملے میں کسی کے دنیاوی مرتبے سے متاثر نہ ہوں بلکہ وہ عوام وخواص حکمران اور رعایا سب کو دعوت حق دیتے ہیں۔

مودودی فرماتے ہیں کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بچپن میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے گھر پرورش پا رہے تھے ایک روز انہوں نے فرعون کے سر کا تاج اتار کا اپنے سر پر رکھ لیا اس پہ سوال پیدا ہوا کہ بچے کا یہ کام ارداتاً ہے یا محض طفلانہ فعل ہے آخر کار تجویز پیش کی گئی کہ بچے کے سامنے سونا اور آگ دونوں ساتھ رکھے جائیں چنانچہ دونوں چیزیں سامنے رکھی گئیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اٹھا کر آگ منہ میں رکھ لی اس طرح ان کی جان تو بچ گئی مگر زبان میں ہمیشہ کے لیے لکنت آگئی۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ قصہ اسرائیلی روایات سے منتقل ہو کر ہمارے ہاں کی تفسیروں میں بھی رواج پا چکا ہے لیکن عقل اسے ماننے سے انکار کرتی ہے اس لیے کہ اگر بچے نے آگ پر ہاتھ مارا بھی ہو تو یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ انگارے کو اٹھا کر منہ میں لے جا سکے بچہ تو آگ کی جلن محسوس کرتے ہی ہاتھ کھینچ لیتا ہے منہ میں لے جانے کی نوبت ہی کہاں آسکتی ہے؟ قرآن کے الفاظ سے جو بات ہماری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے اندر خطابت کی صلاحیت نہ پاتے تھے اور ان کو اندیشہ تھا کہ نبوت کے فرائض ادا کرنے کے لیے تقریر کی ضرورت کبھی پیش آئی جس کا انہیں اس وقت تک اتفاق نہ ہوا تھا تو ان کی طبیعت کی جھجک مانع ہو جائے گی اس لیے انہوں نے دعا فرمائی کہ یا اللہ میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ میں اچھی طرح اپنی بات لوگوں کو سمجھا سکوں یہی چیز تھی جس کا فرعون نے ایک مرتبہ ان کو طعنہ دیا تھا کہ "یہ شخص تو اپنی بات بھی پوری طرح بیان نہیں کر سکتا" "لا یکاد یبین" (الزخرف ۵۲) یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ہکلے یا توتلے آدمی کو اپنا رسول مقرر فرمائے رسول ہمیشہ شکل وصورت شخصیت اور صلاحیتوں کے لحاظ سے بہترین لوگ ہوتے ہیں جن کے ظاہر اور باطن کا ہر پہلو دلوں اور نگاہوں کو متاثر کرنے والا ہوتا ہے کوئی رسول ایسے عیب کے ساتھ نہیں بھیجا گیا اور نہیں

---

(۱) سورۃ طہٰ: ۲۰ / ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸

بھیجا جاسکتا تھا جس کی بنا پر وہ لوگوں میں مضحکہ خیز بن جاتا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور آپ علیہ السلام زوردار تقریر کرنے لگے قرآن ان کے بعد کی جو تقریریں آتی ہیں وہ کمال فصاحت وطاقت لسانی کی شہادت دیتی ہیں۔[1]

مودودی کے ہاں اس اقتباس سے داعی حضرات کے یہ اوصاف سامنے آتے ہیں

١ داعی حضرات کو کار دعوت میں کامیابی کے لئے اللہ سے مدد کی استدعا کرنی چاہیے

٢ داعیان کرام کو باصلاحیت وباعمل ہونا چاہیے

٣ داعی حضرات کو زبان پر عبور حاصل ہونا چاہیے اور فصاحت وبلاغت کا شاہکار ہونا چاہیے

دعوت وتبلیغ میں اللہ سے مددگار طلب کرنا:

حضرت موسیٰ علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی رسالت کی ادائیگی کے سلسلے میں شریک ومددگار کی خواہش ظاہر کی چنانچہ قرآن پاک میں ہے،

﴿وَأَخِي هَارُونُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِي إِنِّي أَخَافُ أَن يُكَذِّبُونِ﴾[2]

ترجمہ: اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے تو اس کو ایک معاون کی حیثیت سے میرے ساتھ بھیجئے کہ وہ میری تائید کرے مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ میری تکذیب کریں گے۔

مودودی صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس ڈر سے میں وہاں نہیں جانا چاہتا بلکہ مطلب یہ تھا کہ کوئی انتظام ہونا چاہیے ایسا نہ ہو کہ میرے پہنچتے ہی کسی بات چیت اور ادائے حق رسالت کی نوبت آنے سے پہلے وہ لوگ مجھے الزام قتل میں گرفتار نہ کرلیں کیونکہ اس صورت میں تو وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا جس کے لیے مجھے اس مہم پر بھیجا جارہا ہے بعد کی عبارت سے بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس گذارش کا مدعا ہرگز یہ نہیں تھا کہ وہ ڈر کے مارے نبوت کا منصب قبول کرنے اور فرعون کے ہاں جانے سے انکار کرنا چاہتے تھے اس واقعے کو بائبل اور تالمود میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ بائبل کا بیان ہے کہ

"پہلی مرتبہ جب خدا نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا سو اب آ میں تجھے فرعون کے پاس بھیجتا ہوں کہ تو میری قوم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا" میں کون ہوں جو فرعون کے پاس جاؤں اور بنی اسرائیل کو مصر سے نکال

---

(١) تفہیم القرآن، ٣/ ٩٢

(٢) سورۃ القصص: ٢٨/ ٣٤

لاؤں؟ پھر خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہت کچھ سمجھایا معجزے عطا کیے مگر موسیٰ علیہ السلام نے پھر بھی کہا خداوند میں تیری منت کرتا ہوں کسی اور کے ہاتھ سے جسے تو چاہے پیغام بھیج دے"۔[۱]

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ تالمود کی روایت تو اس سے بھی دو ہاتھ آگے جاتی ہے اس کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان سات دن تک اس بات پر ردو کد ہوتی رہی اللہ کہتا رہا کہ نبی بن مگر موسیٰ علیہ السلام کہتے کہ میری زبان نہیں کھلتی آخر اللہ نے کہا میری خوشی یہی ہے کہ تو نبی بن اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا لوط کو بچانے کے لیے آپ نے فرشتے بھیجے ہاجرہ جب سارا کے گھر سے نکلی تو اس کے لیے آپ نے فرشتے بھیجے اب اپنے خاص بچوں کو (بنی اسرائیل) کو مصر سے نکلوانے کے لیے آپ مجھے بھیج رہے ہیں؟ اس پر خدا ناراض ہو گیا اور اس نے رسالت کے منصب میں ہارون کو شریک کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام کی اولاد کو محروم کر دیا۔ مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ یہ قصے کہانیاں ان کتابوں سے لی گئی ہیں جن کے متعلق بے شرم لوگ کہتے ہیں کہ قرآن میں ان سے قصے نقل کیے گئے ہیں۔[۲]

تفسیر تفہیم القرآن کی ایک اہم خصوصیت تقابل ادیان بھی ہے مولانا ان آیات کی تفسیر میں جن میں تاریخی واقعات ہوتے ہیں وہاں اہل کتاب کی مقدس کتب تورات انجیل اور دیگر آیات کا حوالہ بالعموم دیتے ہیں تا کہ ایک تو ان کتابوں کا تحریف شدہ ہونا ثابت ہو اور پھر ان سے مستشرقین اور مخالفین کے اس الزام کو رد کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن اہل کتاب کی مقدس کتاب سے یا ان کے علماء سے سیکھا ہے اس کے علاوہ وہ ان کتب میں موجود خلاف واضح اور متضاد امور کی نشان دہی کرتے ہیں۔

مودودی صاحب آیت مبارک کی تفسیر میں دوسرے مذاہب کی کتابوں کے حوالے سے مضمون کو اس لیے واضح کر رہے ہیں کہ داعیان حضرات دعوت و تبلیغ کے دوران اصل مضمون اور تحریف شدہ کتب کے مضامین کی وضاحت کر سکیں۔

دعوت و تبلیغ بذریعہ دلائل:

دعوت و تبلیغ میں ایک مرحلہ وہ ہوتا ہے جس میں داعی حضرات کو دعوت کے حق میں دلائل مہیا کرنے ہوتے ہیں تا کہ لوگوں کے دماغ میں شیطان نے جو وسوسے پیدا کر رکھے ہیں ان کو دور کیا جاسکے فرعون کے دربار میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعوت توحید کو بلند کیا تو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مختلف سوالات کیے فرعون نے جب نخوت سے پوچھا،

﴿قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ ٱلْعَٰلَمِينَ﴾[۳]

---

(۱) باب خروج، ۳/ ۱۳

(۲) تفہیم القرآن، ۳/ ۹۵

(۳) سورۃ الشعراء: ۲۶/ ۲۳

ترجمہ: فرعون نے کہا یہ رب العالمین کیا ہوتا ہے؟

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو رب لعالمین کے رسول کی حیثیت سے پیش کیا اور فرعون کو وہ پیغام پہنچایا جس کے لیے وہ مامور کیے گئے تھے۔ یعنی ہم کو رب العالمین نے اس لیے بھیجا ہے کہ اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دو چنانچہ اس پیغام کی تبلیغ کے بعد فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا یہ رب العالمین کیا ہوتا ہے؟ جس سے اس کا باغیانہ کردار واضح ہوتا ہے مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اس کا یہ سوال موسیٰ علیہ السلام کے اس قول پر تھا کہ میں رب العالمین (یعنی تمام جہانوں کے آقا کی طرف سے بھیجا گیا ہوں کہ تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جس کی نمائندگی کے مدعی ہیں وہ سارے جہان والوں پر حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ رکھتا ہے جو ایک فرمانروا کی حیثیت سے ایک فرمان بھیج رہا ہے کہ تو رعایا کے ایک حصے کو میرے نامزد کردہ نمائندے کے حوالے کر دے اس پہ فرعون پوچھتا ہے کہ سارے جہان والوں کا مالک و فرمانروا کون ہے جو مصر کے بادشاہ کو اس کی رعایا کے ایک ادنیٰ افراد کے ہاتھوں حکم بھیجتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا،

﴿قَالَ رَبُّ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَآ إِن كُنتُم مُّوقِنِينَ﴾[1]

ترجمہ: موسیٰ نے جواب دیا آسمانوں اور زمین کا رب اور ان سب چیزوں کا رب جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے اگر تم یقین لانے والے ہو۔

یعنی میں زمین پر بسنے والی کسی فانی مخلوق اور فانی مدعی کی طرف سے نہیں آیا ہوں بلکہ اس کی طرف سے آیا ہوں جو آسمان اور زمین کا مالک ہے اگر تم اس بات کا یقین رکھتے ہو کہ اس کائنات کا خالق و مالک اور فرمانروا ہے تو تمہیں یہ سمجھنے میں زحمت نہیں ہونی چاہیے کہ سارے جہان والوں کا رب کون ہے۔ فرعون نے کہا،

﴿قَالَ لِمَنْ حَوْلَهُۥٓ أَلَا تَسْتَمِعُونَ ٥ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ ءَابَآئِكُمُ ٱلْأَوَّلِينَ ٥ قَالَ إِنَّ رَسُولَكُمُ ٱلَّذِىٓ أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ﴾[2]

ترجمہ: فرعون نے اپنے گردوپیش کے لوگوں سے کہا سنتے ہو؟ موسیٰ نے کہا تمہارا رب بھی اور تمہارے ان آباؤاجداد کا رب بھی جو گزر چکے ہیں فرعون نے حاضرین سے کہا تمہارے یہ رسول صاحب جو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں بالکل ہی مجنوں معلوم ہوتے ہیں۔

---

(۱) سورۃ الشعراء:۲۶/ ۲۴

(۲) سورۃ الشعراء:۲۶/ ۲۵،۲۶،۲۷

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ فرعون نے کہا تھا اپنے درباریوں سے سنتے ہو؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ میں ان جھوٹے ارباب کا قائل نہیں ہوں جو آج ہیں اور کل نہ تھے اور کل تھے مگر آج نہیں ہیں تمہارا یہ فرعون جو آج تمہارا رب بنا بیٹھا ہے کل نہ تھا اور کل تمہارے باپ دادا جن فرعونوں کو رب مانتے تھے وہ آج نہیں ہیں میں صرف اس رب کی حاکمیت و فرمانروائی مانتا ہوں جو آج بھی تمہارا اور اس فرعون کا رب ہے اور اس سے پہلے جو تمہارے اور اس کے باپ داداد گزر چکے ہیں ان سب کا رب بھی وہی ہے یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام واضح دلائل کے ساتھ توحید کو بیان کرتے ہیں مزید فرماتے ہیں کہ اب تو مجھے پاگل قرار دیا جارہا ہے لیکن آپ لوگ اگر عاقل ہیں تو خود سوچیے کہ حقیقت میں رب یہ بے چارہ فرعون ہے جو زمین کے ایک ذرا سے رقبے پر بادشاہ بنا بیٹھا ہے یا وہ جو مشرق و مغرب کا مالک ہے اور مصر سمیت ہر اس چیز کا مالک ہے جو مشرق و مغرب سے گھری ہوئی ہے۔ میں تو صرف اسکی حاکمیت و فرمانروائی مانتا ہوں اور اس کی طرف سے یہ حکم اس کے بندے کو پہنچا رہا ہوں۔[1]

سورۃ طہ میں اس مضمون کو یوں بیان کیا گیا ہے،

﴿قَالَ فَمَن رَّبُّكُمَا يَٰمُوسَىٰ ○ قَالَ رَبُّنَا ٱلَّذِيٓ أَعۡطَىٰ كُلَّ شَيۡءٍ خَلۡقَهُۥ ثُمَّ هَدَىٰ ○ قَالَ فَمَا بَالُ ٱلۡقُرُونِ ٱلۡأُولَىٰ ○ قَالَ عِلۡمُهَا عِندَ رَبِّي فِي كِتَٰبٖۖ لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى﴾[2]

ترجمہ: فرعون نے کہا اچھا تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ؟ موسیٰ نے جواب دیا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی پھر اس کو راستہ بتایا فرعون بولا اور پہلے جو نسلیں گزر چکی ہیں ان کی پھر کیا حالت ہوئی؟ موسیٰ نے کہا اس کا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتے میں محفوظ ہے میرا رب نہ چوکتا ہے نہ بھولتا ہے۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ دونوں بھائیوں میں سے اصل صاحب دعوت چونکہ موسیٰ علیہ السلام تھے اس لیے فرعون نے ان کو مخاطب کیا فرعون کے اس کلام کا منشا یہ تھا کہ تم دونوں کس کو رب بنا بیٹھے ہو؟ مصر اور اہلِ مصر کا رب تو میں ہوں سورۃ نازعات میں اس کا یہ قول ہے (انا ربکم الاعلی) اے اہل مصر تمہارا رب اعلی میں ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بڑے مدلل انداز میں جواب دیا ہم ہر معنی میں صرف اس کو رب مانتے ہیں جس نے دنیا کی ہر چیز بنائی ہے ہر چیز کو بناوٹ جو شکل و صورت جو قوت و صلاحیت اور جو صفت و خاصیت حاصل ہے اسی کے عطیے اور بخشش کی بدولت ہے پاؤں کو جو مناسب ترین ساخت درکار تھی وہ اس کو بخشی اسی طرح ہاتھ کو بھی اس کی مناسب ترین ساخت بخشی

---

(۱) تفہیم القرآن، ۳/ ۶۷۰

(۲) سورۃ طہ: ۲۰/ ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸

غرض دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے اپنی ساخت سے کام لینے اور اپنے مقصد تخلیق کو پورا کرنے کا طریقہ اس نے سکھایا ہے مچھلی کو تیرنا اور چڑیا کو اڑنا اسی کی تعلیم سے آیا ہے درخت کو پھل پھول دینے اور زمین کو نباتات اگانے کی ہدایت اس نے دی ہے غرض وہ ساری کائنات اور اس کی ہر چیز کا صرف خالق ہی نہیں ہادی اور معلم بھی ہے۔

اس بے نظیر جامع اور مختصر جملے میں حضرت موسٰی علیہ السلام نے صرف یہ نہیں بتایا کہ ان کا رب کون ہے بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ وہ رب کیوں ہے؟ اور اس کے سوا کسی اور کو رب نہیں مانا جا سکتا یہاں دعوی کے ساتھ اس کی دلیل بھی اس فقرے میں آگئی ہے ظاہر ہے کا جب فرعون اور اس کی رعایا کا ہر فرد اپنے خاص وجود کے لیے اللہ کا ممنون احسان ہے اور جب ان کا اپنا جسم اللہ کی دی ہوئی ہدایت کے بغیر کام نہیں کر سکتا تو فرعون کا یہ دعوی کہ وہ لوگوں کا رب ہے اور لوگوں کا یہ ماننا کہ واقعی فرعون ان کا رب ہے سراسر حماقت اور مذاق کے سوا کچھ نہیں پھر فرعون نے حضرت موسٰی علیہ السلام سے کہا اور پہلے جو نسلیں گزر چکی ہیں ان کی تمہارے نزدیک کیا پوزیشن ہے؟ کیا وہ سب گمراہ تھے؟ کیا سب عذاب کے مستحق تھے؟ اس نے اہل مصر کے دلوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے خلاف ایک تعصب بھڑکا دیا اہل حق کے خلاف ہمیشہ یہ ہتھکنڈا استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت حکیمانہ جواب دیا اور اس سے حکمت تبلیغ کا ایک بہترین سبق حاصل ہوتا ہے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے کہ ہاں وہ سب جاہل اور گمراہ تھے اور سب جہنم کا ایندھن تھے تو یہ حق گوئی کا زبردست نمونہ ہوتا۔ مگر یہ جواب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بجائے فرعون کے مقصد کی زیادہ خدمت انجام دیتا مگر حضرت موسٰی علیہ السلام نے کمال دانائی کے ساتھ ایسا جواب دیا جو بجائے خود حق پہ تھا اور اس نے فرعون کے زہریلے دانت بھی توڑ دیئے آپ علیہ السلام نے فرمایا وہ لوگ جیسے بھی تھے اپنا کام کر کے خدا کے ہاں جا چکے میرے پاس ان کی نیتوں اور اعمال کو جاننے کا کوئی ریکارڈ نہیں ان کا ریکارڈ اللہ کے ہاں محفوظ ہے نہ کوئی چیز خدا کی نگاہ سے بچی ہے اور نہ اس کے حافظے سے کوئی شے محو ہے ان سے جو کچھ معاملہ بھی خدا کو کرنا ہے وہی جانتا ہے مجھے اور تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان کا موقف کیا تھا اور انجام کیا ہو گا؟ ہمیں تو اس کی فکر ہونی چاہیے کہ ہمارا انجام کیا ہو گا؟ اور ہمیں کس انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔(۱)

مودودی صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں حضرت موسٰی علیہ السلام کے فرعون کے دربار میں دیئے گئے دلائل کو نہایت خوبصورت اور جامع انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ شرک پر کڑی ضرب پڑتی ہے۔

مودودی صاحب کے اسلوب سے دین کو ایک بہترین اسلوب ملتا ہے وہ یہ کہ اگر داعی کا مخاطب اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے کوئی ایسا سوال رکھے جس کے واضح جواب سے داعی کی دعوت میں بات سننے کی بجائے صورتحال بگڑتی نظر آئے تو حکمت سے کام لے جیسا کہ فرعون نے جب موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ ہم سے پہلے جو نسلیں گزر چکی ہیں ان کی تمہاری نزدیک کیا پوزیشن ہے کیا وہ سب گمراہ تھے اگر حضرت موسٰی علیہ السلام اس کا جواب ہاں میں دیتے تو اس سے مخاطب بھڑک اٹھتا اس لئے

---

(۱) تفہیم القرآن، ۳/ ۹۶، ۹۹

انہوں نے حکمت سے کام لیتے ہوئے جواب دیا کہ مجھے اور تمہیں ان کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ان کا معاملہ ان کے اللہ کے ساتھ ہے اور کچھ بھی اللہ کی نظر سے پوشیدہ نہیں داعیان کرام کو چاہیے کہ دعوت و تبلیغ میں مخاطبین کے ساتھ جب بھی ایسا موقع پیش آئے تو وہ پر اثر اور نرمی کے ساتھ ان کے اعتراضات کو رد کرے نہ خود جذبائیت کا مظاہر کرے نہ مخالفین کے اندر کے تعصب کو ہوا دیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا خصوصی اسلوب "معجزات کا اظہار"

ہدایت ربانی کے مطابق موسیٰ علیہ السلام نے نرم لہجے میں توحید الہی پر دلائل مہیا کیے۔ یہ دلائل ایسے جامع اور موثر تھے کہ فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا لیکن پھر بھی وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ آخر حکم ربانی سے موسیٰ علیہ السلام نے عقلی دلائل کے بعد مشاہداتی و معجزاتی دلائل پیش کرنے کا فیصلہ کیا جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے کہ،

﴿قَالَ أَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِينٍ ٥ قَالَ فَأْتِ بِهِۦٓ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ﴾(۱)

ترجمہ: موسیٰ نے کہا اگرچہ میں لے آؤں تیرے سامنے ایک صریح چیز بھی؟ فرعون نے کہا: "اچھا تو لے آ اگر تو سچا ہے"۔

مودودی صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو توحید فی العبادات کی دعوت دی تو اس چیز نے اسے غضبناک کر دیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود کو رب العالمین کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صاف صاف بتایا کہ جس رب العالمین کا وہ پیغام لائے ہیں وہ کون ہے تو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دھمکی دی کہ تم نے میرے اقتدار اعلی کے سوا کسی اور کے اقتدار اعلی کا نام بھی لیا تو جیل کی ہوا کھاؤ گے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، کیا تو اس صورت میں بھی میری بات ماننے سے انکار کرے گا اور مجھے جیل بھیجے گا جب کہ میں اس امر کی ایک صریح علامت پیش کر دوں کہ میں واقعی اس خدا کا فرستادہ ہوں جو رب العالمین رب السماوات والارض رب المشرق والمغرب ہے۔ اس پر فرعون نے کہا اچھا تو لے آ اگر تو سچا ہے۔ سورۃ الشعراء آیت نمبر ۳۱ کی تفسیر میں مولانا فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوال پر فرعون کا یہ جواب خود ظاہر کرتا ہے کہ اس کا حال قدیم و جدید زمانے کے عام مشرکین سے مختلف نہ تھا وہ دوسرے تمام مشرکین کی طرح فوق الفطری معنوں میں اللہ تعالیٰ کے الٰہ الالٰہہ ہونے کو مانتا تھا کہ کائنات میں اس کی قدرت تمام دیوتاؤں سے برتر ہے اس وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا کہ اگر تجھے مامور من اللہ ہونے کا یقین نہیں ہے تو میں ایسی صریح نشانیاں پیش کروں جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ میں اس کا بھیجا ہوا ہوں اور اسی وجہ سے اس فرعون نے بھی جواب دیا کہ تم اس دعوے میں سچے ہو تو کوئی نشانی لاؤ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اللہ کی یا اس کے مالک کائنات ہونے میں

(۱) سورۃ الشعراء: ۲۶/ ۳۰، ۳۱

اسے کلام ہوتا تو نشانی کا سوال نہ پیدا ہوتا نشانی کی بات تو اس صورت میں تھی جب کہ اللہ تعالیٰ کا وجود اس کا قادر مطلق ہونا تو مسلم ہے بحث تو اس امر میں تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں یا نہیں یعنی داعی حق ہے یا نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ مطالبہ سننے کے بعد اپنے عصا کو زمین پر مارا تو وہ اژدھا بن گیا قرآن پاک میں اس کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

﴿فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ﴾[١]

ترجمہ: موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک صریح اژدھا تھا۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن میں کسی جگہ اس کے لیے حیۃ (سانپ) اور کسی جگہ جان (جو بالعموم چھوٹے سانپ کے لیے بولا جاتا ہے) کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اور یہاں اسے ثعبان (اژدھا) کہا جارہا ہے اس کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں کہ حیۃ عربی زبان میں سانپ کی جنس کے لیے مشترک نام ہے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اور ثعبان کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ جسامت کے اعتبار سے وہ اژدھے کی طرح تھا اور جان کا لفظ اس لیے کہ اس کی پھرتی اور تیزی چھوٹے سانپ جیسی تھی۔[٢]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر فرعون کو اللہ کی طرف سے عطا کردہ دوسرا معجزہ دکھایا کہ شاید یہ ظالم حکمران دعوت حق کی حقیقت کو جان سکے قرآن پاک میں اس بات کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

﴿وَنَزَعَ يَدَهُۥ فَإِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنَّٰظِرِينَ﴾[٣]

ترجمہ: پھر اس نے اپنا ہاتھ بغل سے کھینچا اور وہ سب دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا۔

قرآن پاک میں سورۃ طٰہ میں اس مضمون کو یوں بیان کیا گیا ہے،

﴿وَٱضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوٓءٍ ءَايَةً أُخْرَىٰ﴾[٤]

ترجمہ: اور ذرا اپنا ہاتھ اپنے بغل میں دبا چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا دوسرا معجزہ ید بیضاء دکھایا اپنے ہاتھ کو اپنی بغل میں دبا کر باہر نکالا تو وہ ایسے روشن ہو گیا جیسے سورج ہو (مودودی صاحب یہاں ید بیضاء کے لیے سورج کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں جب کہ بعض مفسرین کرام ید بیضاء کو ستارے جتنا روشن قرار دیتے ہیں)۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی بغل میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا

---

(١) سورۃ الشعراء: ٢٦ / ٣٢

(٢) تفہیم القرآن، ٣ / ٦٨٨

(٣) سورۃ الشعراء: ٢٦ / ٣٣

(٤) سورۃ طٰہ: ٢٠ / ٢٢

تو برص کے مریض کی طرح سفید تھا جب دوبارہ اسے بغل میں رکھا تو وہ اصلی حالت میں آگیا اور اس کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ فرعون کو برص کی بیماری تھی جسے وہ چھپائے ہوئے تھا اس لیے اس کے سامنے یہ معجزہ پیش کیا گیا کہ دیکھ یوں آنا فانا برص کا مرض پیدا بھی ہوتا ہے اور کافور بھی ہو جاتا ہے لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اول تو ذوق سلیم اس سے ابہ کرتا ہے کہ کسی نبی کو برص کا معجزہ دے کر بادشاہ کے دربار میں بھیجا جائے دوسرے اگر فرعون کو مخفی طور پر برص کی بیماری تھی تو ید بیضاء صرف اس کی ذات کے لیے معجزہ ہو سکتا تھا، اس کے درباریوں پر اس معجزے کا کیا رعب طاری ہوتا لہٰذا صحیح بات وہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں سورج کی سی چمک پیدا ہو جاتی تھی جسے دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جاتیں قدیم مفسرین میں سے بھی بہتوں نے اس کے یہی معنی لیے ہیں۔[1]

مفسر کی تفسیر صرف قرآنی علوم کے شائقین کے لیے ہی نہیں بلکہ منحرفین اور معترضین کے لیے اپنے اندر دلائل کے اعتبار سے وافر سامان ہدایت اور اسلوب کے اعتبار سے انتہائی جاذبیت کا سامان رکھتی ہے مودودی صاحب کا اسلوب یہ بتاتا ہے کہ داعی کا مخاطب اگر کسی بات پر بھڑک اٹھے تو دعوت تبلیغ میں نہایت حکیمانہ انداز اختیار کیا جائے تاکہ مخاطب کے دلائل پر حاوی ہو اور اس کی برانگیختگی بھی جاتی رہی۔ تفسیر تفہیم القرآن اسی اسلوب کی نمائندہ تفسیر ہے۔

---

(۱) تفہیم القرآن، ۳/ ۹۱

فصل سوم

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اسالیب دعوت تدبر قرآن کی روشنی میں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

تعارف:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے سب سے آخری اور مشہور نبی ہیں۔ خاتم الانبیا و المرسلین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے درمیان پانچ سو اکہتر سال کا فاصلہ ہے۔ آپ کی والدہ کا نام مریم بنت عمر اور یحیٰ علیہ السلام خالہ زاد بھائی ان سے چھ ماہ چھوٹے تھے۔ مریم نے منت مانگی تھ ی کہ جو بچہ پیدا ہو گا میں اس کو اللہ کے گھر بیت المقدس کی نظر کروں گی حضرت عیسی علیہ السلام مریم علیہا السلام کے بطن سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے اس لیے عیسیٰ ابن مریم کہلائے [1]

عیسیٰ کی وجہ تسمیہ:

یحیٰ عبرانی یا سریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی عربی زبان میں ایسے سفید اونٹ کے ہیں جس میں ہلکا بھورا پن بھی ہو جس کی وجہ سے ایسے اونٹ کی خوبصورتی میں اضافہ ہو جاتا ہے حضرت عیسیٰ کا حسن و جمال بھی ایسا ہی تھا اسی مناسبت سے آپ کا نام عیسیٰ رکھا گیا۔ قرآن حکیم میں اکثر جگہ نام مبارک عیسیٰ سے یاد کیا گیا ہے یعنی ۶ بار عیسیٰ ۱۱ جگہ مسیح اور ایک جگہ عبد اللہ کے لقب سے یاد کیا گیا ہے اور بیشتر جگہ کنیت ابن مریم (۲۳ بار) یاد کیا گیا ہے۔ [2]

عیسیٰ کی ولادت کی بشارت:

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے پہلے تو مریم کی بزرگی و شرف کی بشارت دی تو حضرت مریم کو بہت تعجب ہوا اور مریم نے کہا! میرے ہاں لڑکا کیونکر ہو گا؟ حالانکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب دیا گیا کہ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرلیتا ہے تو بس اس کو صرف اتنا کہہ دیتا ہے کہ ہو جا چنانچہ وہ ہو جاتا ہے۔

جب مریم علیہا السلام کی ولادت کی بشارت سے دل مضبوط ہو گیا تو اسکے بعد ولادت سے پہلے کی کیفیت کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے اور جب ولادت کا وقت قریب آیا تو حضرت مریم بیت الحم چلی گئی وہاں درختوں کے جھنڈ میں حضرت عیسی پیدا ہوئے۔ یہودی لوگ ان درختوں کے پتے تبرک کے طور پر لے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ زیارت کے لیے جاتے ہیں۔ [3]

---

(۱) انبیائے قرآن، محمد جمیل احمد، ص ۳۱۹

(۲) انبیائے قرآن، جمیل احمد، ص ۳۲۱

(۳) تاریخ الانبیاء، ذوالفقار ارشد گیلانی، ص ۱۸۷

بیت الحم سے واپسی اور قوم کی چہ مگیوں کا جواب:

حضرت مریم علیہا السلام بچے کو گود میں اٹھائے واپس آئی تو آپکی قوم نے آپ پر طرح طرح کے الزام لگانے شروع کر دیے حضرت مریم نے چپ کا روزہ رکھا ہوا تھا اس لیے آپ نے بچے کی طف اشارہ کر دیا وہ لوگ کہنے لگے ہم بھلا اس سے کس طرح بات کر سکتے ہیں جو ابھی گود کا بچہ ہے۔[1]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بولنے پر قوم کا رد عمل:

ابھی یہ چہ مگوئیاں ہو رہی تھی اور حضرت عیسیٰ دودھ پی رہے تھے دودھ چھوڑ کر قدرت خداوندی سے بولے "میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھ کو کتاب دی ہے اور اسنے مجھ کو نبی بنایا ہے اور میں جہاں کہیں بھی ہوں مجھ کو خدا نے بابرکت کیا ہے۔ اور جب تک میں زندہ رہوں مجھ کو نماز اور زکوۃ کا حکم دیا ہے اور اپنی ماں کا مجھ کو اس نے خدمت گزار بنایا اور اس نے مجھ کو سرکش و بدبخت نہیں بنایا شیر خوار بچے کی یہ عاقلانہ باتیں سن کر قوم حیران رہ گئی اور اس کی مریم سے بدگمانی عقیدت میں بدل گئی ساتھ ہی یہ بھی سمجھ گئی کہ عیسیٰ عام بچوں کی طرح نہیں ہے۔[2]

عیسیٰ علیہ السلام اور نبوت:

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر ۳۰ سال ہوئی تو ان پر نزول وحی کا آغاز ہوا اس کے بعد حضرت عیسی نے پورے زور و شور سے دعوت و تبلیغ کا آغاز کر دیا۔ ان کی تبلیغ میں حکمت و دانائی کے ساتھ ساتھ احکام الٰہی پر شدت سے عمل کرنے اور کرانے کا جزبہ بھی پایا جاتا تھا انہوں نے اپنے مواعظ میں ان مذہبی لوگوں کو خاص طور پر ہدف تنقید بنایا جنھوں نے مذہب کے نام پر یہ دکانداری قائم کر رکھی تھی انہوں نے اعلان ثبوت کے چند دن بعد ایک پہاڑی سے وعظ کیا جسے خطبہ کو Serman on the mount لکھتے ہیں۔

نبوت کے انعام کے ساتھ حضرت عیسی کی صداقت کو نمایاں کرنے کے لیے معجزے بھی عطا کیے گئے اور اس کو روح القدس یعنی جبریل علیہ السلام سے قوت دی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کتب سماویہ کی اور دانائی کی باتوں کی اور تورات اور انجیل کی تعلیم دی اور بنی اسرائیل کے لیے رسول مقرر کیے گئے۔[3]

---

(۱) قصص الانبیا، عطا اللہ ساجد، ص ۲۳۱

(۲) ایضاً

(۳) اٹلس قرآن، شوقی ابو خلیل، مترجم محمد امین، ص ۲۱۱

قوم کی طرف سے حضرت عیسیٰ کی تکذیب:

دنیا کی قوموں کی یہ تاریخ رہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی رہنمائی کے لیے اپنے کسی نبی کو بھیجا تو اس کی تکذیب کی گئی اسکو جھٹلایا۔ معجزات کا انکار کیا۔ عیسی علیہ السلام کی قوم نے بھی وہی تاریخ دوہرائی اور آپ کے معجزات کو جادو قرار دیا حضرت عیسی نے ان سے کہا کہ مجھے اللہ نے تمہاری طرف اس لیے بھیجا ہے کہ میں تمہیں ان باتوں سے آگاہ کروں جن میں تم اختلاف کرتے ہو تم اللہ سے ڈرو میرا کہا مانو اللہ ہی میرا اور تمہارا رب ہے تم اس کی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے اتنا سمجھانے کے باوجود بنی اسرائیل کے بہت سے گروہوں نے آپس میں اختلاف ڈال دیا، سو ایسے ظالموں کے لیے ایک دردناک عذاب سے بڑی تباہی ہے۔ (۱)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا جز ماننے والے:

حضرت عیسی علیہ السلام کی قوم نے انہیں خدا یا خدا کا جز ماننا شروع کر دیا حالانکہ حضرت عیسی علیہ السلام نے بہت دفعہ انھیں ان کی اس گمراہی سے روکنا چاہا لیکن وہ لوگ نہ مانے اور اس بات پر قائم رہے کہ عیسیٰ ابن مریم ہی عین خدا ہے اور وہ لوگ اللہ کی ذات کے ساتھ شرک کرنے لگے تھے حضرت عیسی علیہ السلام اپنی قوم کے ان مشرکانہ سے بے نیاز رہتے تھے تاہم وہ عام لوگ کی ہدایت اور فلاح و بہبود کی طرف متوجہ رہتے پھ جیسے جیسے عوام ان سے متاثر ہونے لگے خواص یعنی مذہبی لوگ، کاہن اور قریبی انکے ہی ان کے مخالف ہوتے گئے کیونکہ انہیں اپنی مزہبی سیادت ختم ہوتی نظر آرہی تھی۔ (۲)

آپ کی ولادت کے وقت قیصر روم بادشاہ تھا اس نے کچھ ایسے خواب دیکھے جن سے اس کو یہ خطرہ ہونے لگا کہ میری حکومت ختم ہونے والی ہے ادھر مریم نے بغیر باپ کے معجزانہ طور پر آپ کی پیدائش ہوئی اور آپ نے گہوارے میں کلام کیا تھا جس کی وجہ سے قیصر روم کو ماں بیٹوں سے عداوت شروع ہو گئی اور دونوں کے قتل کا منصوبہ بنالیا اسی خطرہ کی بنا پر آپ کی والدہ آپ کو لے کر مصر چلی گئیں اور تقریبا بارہ سال وہیں رہیں وہاں پر آپکی تبلیغ سے بارہ آدمی آپ پر ایمان لے آئے قرآن میں ان کو حواری کہتے ہیں یہودی پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ آپ واقعی اللہ کے نبی ہیں۔ اس لیے آپ کو ٹھکانے لگانے کی فکر میں لگ گئے۔ (۳)

حوارین عیسیٰ علیہ السلام

حواری کے لغت میں کئی معنی بیان کیے گئے ہیں۔

---

(۱) قصص الانبیاء، خواجہ محمد اسلام، ص۳۶۹

(۲) قصص الانبیاء، ابن کثیر، ص۴۱۶

(۳) ایضاً

لسان العرب کے مطابق:

حواری کے معنی (۱) مخلص (۲) رفیق (۳) ساتھی (۴) سفید پوش (۵) دھوبی کے ہیں۔ [۱]

قرآن مجید میں یہ لفظ عیسی علیہ السلام کے ان بارہ ساتھیوں کے لیے بولا گیا ہے جنہوں نے عیسی علیہ السلام کی دعوت پر اسلام قبول کیا اور اللہ کے مقبول بندوں میں ان کا شمار ہوا۔

حوارین کی مائدہ کے لیے درخواست:

حوارین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ کیا تیرا رب ایسے کر سکتا ہے کہ ہم پر آمسان سے دستر خوان کھانے کا اتار دے۔ حضرت عیسی علیہ السلام نے انہیں ایسی بات کرنے سے منع فرمایا تو انہوں نے کہا ہمارا مقصد ہے کہ ہم اس خوان میں سے کچھ کھائیں بھی اور ہمارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو جائے کہ آپ ہی سچے نبی ہیں اور ہم پر اس نزول مائدہ پر گواہی دینے والوں میں سے ہو جائیں۔

حضرت عیسی علیہ السلام کو جب اس متعلق یقین ہو گیا کہ ان لوگوں کی فرمائش خلوص پر مبنی ہے تو آپ نے دعا کی کہ اے میرے پرودگار ہمارے لیے آسمان سے کھانے کا دستر خوان نازل فرما تا کہ ان کے لیے خوشی کا باعث ہو اور یہ دستر خوان تیری قدرت کا ایک نشان ہو جائے چنانچہ آپ کی دعا پر مائدہ کا تحفہ پہنچ گیا جس میں تلی ہوئی مچھلیاں، تر و تازہ پھل اور روٹیاں رکھی تھیں ایک روایت کے مطابق یہ خوان چالیس دن تک نازل ہوتا رہا حکم یہ تھا کہ اس دستر خوان سے فقراء، بیمار لوگ کھائیں تندرست و توانا ہر گز نہ کھائیں مگر مالدار لوگوں نے بھی اس میں سے کھانا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں یہ کھانے والے آدمی سور اور بندر بنا دیئے گئے۔ مائدہ کا دستر خوٗان اتوار کو اترتا تھا اس لیے نصاریٰ کے ہاں اتوار کے دن عید سمجھا جاتا ہے جیا کہ مسلمانوں کے لیے جمعہ کو عید المومنین سمجھا جاتا ہے۔ [۲]

حضرت عیسیٰ کی نبوت اور دعوت و تبلیغ:

نبوت ملنے کے بعد آپ تین سال انہاک کے ساتھ تبلیغ کرتے رہے آپ نے نہ شادی کی نہ اپنے رہنے سہنے کے لیے کوئی گھر بنایا آپ شہر شہر قریہ قریہ پیغام خداوندی سناتے اور دین حق کی دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیتے رہے جہاں کہیں رات آگئی وہیں بغیر بوریے کے رات گزارنے کے لیے ٹھہر جاتے اور ساری رات عبادت میں گزار دیتے تھے۔ تماانبیاء کے ہاں اعلان نبوت کے ساتھ ہی دعوت کے بنیادی موضوعات پر اظہار خیال ہوتا ہے دلائل و براہین دیے جاتے ہیں مخالفین کے اعتراضات کے جوابات پر معجزات دکھائے جاتے ہیں دعوت کے عمومی موضوعات کے ساتھ ساتھ اس کے بعض قوموں کے لیے خصوصی

---

(۱) لسان العرب، ابن منظور، ص۳۱۹

(۲) قصص الانبیاء، عطاالله ساجد، ص۴۱۶

موضوعات بھی ہوتے ہیں جن کا مخاطب قوم کے معاشی یا اخلاقی جرم سے ہوتا ہے جیسے لوط علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کی قوموں کے جرائم انبیا سابقین کے بر عکس حضرت عیسیٰ کی دعوت کا آغاز ہی معجزے سے ہوتا ہے مسیح کی حیثیت منفرد ہے کہ انہوں نے گہوارے میں اعلان نبوت کیا گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جھولے میں ہی دعوت و تبلیغ کا فریضہ سر انجام دیا۔ (۱)

قتل کی سازش:

یہودیوں نے آپ کو قتل کرنے یا سولی پر چڑھانے کی تیاریاں شروع کر دی چنانچہ یہودیوں نے پہلے تو اس جگہ کا محاصرہ کیا جہاں حضرت مسیح اور آپ کے حواری جمع تھے۔ پھر اپنے ایک آدمی کو اس جگہ بھیجا کہ جا کر آپ کو قتل کر دے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے پہلے ہی آسمان پر اٹھوالیا اور جو آدمی آپ کے قتل کے لیے اندر گیا تھا اسکی صورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ کر دی گئی اس آدمی کو اندر بھیجنے والے جب اسکی مدد کے لیے باہر والے آدمی اندر داخل ہوئے تو اپنے آدمی کو مسیح سمجھے اور پکڑ کر اس کو قتل کر دیا وہ شور مچاتا رہا ہے میں مسیح نہیں میں تمہارا آدمی ہوں مگر وہ جوش میں ہوش کھو بیٹھے اور اس کو قتل کر دیا اس کے بعد لاش دیکھی تو کہنے لگے اس کا چہرہ تو مسیح جیسا ہے چہرہ کے علاوہ سارا بدن ہمارے ساتھی کا معلوم ہوتا ہے کسی نے کہا کہ یہ مقتول اگر مسیح ہے تو ہمارا جو آدمی اندر داخل ہوا تھا وہ کہاں ہے؟ اور اگر یہ ہمارا آدمی ہے تو مسیح کہاں گئے؟؟ چنانچہ قرآن کریم کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہودیوں نے دھوکے میں اپنے ہی آدمی کو مسیح سمجھ کر سولی پر چڑھا دیا اور اللہ تو الیٰ نے مسیح علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا اور ہم تجھے اپنی طرف اٹھالیں گے کا وعدہ ایسا پورا فرمایا کہ دشمن حیران و پریشان ہو کر سوچتے رہ گئے کہ یہ کیا ہو گیا ہے؟ (۲)

---

(۱) قصص الانبیاء، ابن کثیر، ص ۴۲۰

(۲) دعوۃ وارشاد، محمد عین الحق، ص ۱۷۴

حضرت عیسی علیہ السلام کے اسالیب دعوت تدبر قرآن میں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اعمال صالحہ اختیار کرنے کے لیے نصیحت کا اسلوب

﴿قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ٥ وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ٥ وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا﴾ (۱)

ترجمہ: میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے نبی بنایا اور میں جہاں بھی ہوں اس نے مجھے سر چشمہ خیر و برکت ٹھہرایا اور جب تک جیوں اس نے مجھے نماز اور زکوۃ کی ہدایت فرمائی ہے اور مجھے ماں کا فرمانبر دار بنایا ہے مجھے سر کش اور بد بخت نہیں بنایا ہے مجھ پر سلامتی ہے جس دن میں مروں گا اور جس دن زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔

گہوارے میں دعوت و تبلیغ:

حضرت عیسی علیہ السلام نے دعوت کے آغاز گہوارے سے ہی کر دیا تھا او کہا انی عبد اللہ میں اللہ کا بندہ ہوں یعنی کوئی میری خلاف عادت ولادت سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ میں کوئی مافوق بشر ہستی ہوں میں اللہ کا ہی بندہ ہوں عبرانی میں ابن کا لفظ بندہ اور بیٹے دونوں کے لیے آتا ہے موقع و محل سے اس کا تعین کرتے ہیں حضرت مسیح کی واضح تعلیمات کی موجودگی میں اس لفظ کی تاویل میں کسی ابہام کی گنجائش نہیں تھی لیکن پال نے اس کو فتنہ بنالیا اور تثلیث کا گورکھ دھندا اختیار کر لیا۔

حضرت عیسی علیہ السلام کی تورات کی پیروری کی ہدایت:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آیت مبارکہ کی روشنی میں دوسری بات یہ فرمائی کہ خدا نے مجھے کتاب و نبوت سے سرفراز فرمایا اور میں جہاں کہیں بھی ہوں میرا وجود وہاں کے لیے سراپا خیر و برکت ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جہاں تک شریعت کا تعلق ہے تورات ہی کہ شریعت پر عامل اور اس کے دای اور مدد تھی البتہ انہوں نے اس پر حکمت کا اضافہ فرمایا ہی حکمت کے وعظ میں جو منتشر اور ناتمام حالت میں ہمیں انجیلوں میں ملتے ہیں یہ وہ لعل ولہر ہیں جو وہ اپنی زبان مبارک سے ہر دشت و چمن میں برساتے ہوئے گزارتے تھے اور جس دل میں ذرا بھی زندگی کی رمق ہوتی تھی اس کو زندہ وجاوید کر دیتے تھے۔ (۲)

دین و شریعت کی بنیاد ہی نماز اور زکوۃ کے اسلوب پر ہے:

---

(۱) سورۃ مریم: ۱۹/ ۳۰-۳۲

(۲) تدبر قرآن، ۴/ ۶۴۸

﴿وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا﴾[1]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گہوارے میں کلام کرتے ہی جو تیسری بات فرمائی وہ یہ تھی کہ مجھے زندگی بھر کے لیے نماز اور زکوۃ کی ہدایت ہوتی ہے دراصل یہی وہ چیزیں ہیں جو تمام دین و شریعت کی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں اس وجہ سے تمام آسمانی شرائع میں سب سے پہلے ان کا ذکر آتا ہے۔ ان کی ظاہری شکلیں مختلف ادیان میں مختلف رہی لیکن بندگی رب اور ہمدردی خلق کی روح ان کی شکل میں محفوظ رہی ہے۔ نماز آدمی کو اس کے رب سے صحیح طور پر جوڑتی ہے اور زکوۃ سے اس کا تعلق خدا کے ساتھ طور پر استوار ہوتا ہے انھی دو چیزوں کی استواری پر تمام دین کا انحصار ہے اگر کوئی شخص ان کو ڈھادے تو وہ تمام دین کو ڈھادے گا اگرچہ وہ دین کے نام پر کتنی ہی لاف زنی کرے۔

﴿وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا﴾[2]

ترجمہ: اور مجھے ماں کا فرمابردار بنایا مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چوتھی بات یہ فرمائی کہ خدا نے مجھے اپنی ماں کا فرمابردار بنایا مجھے سرکش و بدبخت نہیں بنایا یعنی ہر چند کہ میری ولادت کی نوعیت خاص ہے میرے اوپر میرے رب کے ابعامات بھی خاص ہیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں اپنی ماں کا فرمانبردار بیٹا ہوں ساتھ ہی یہ حقیقت بھی بیان فرمادی کہ جو اپنے ماں باپ کا فرمانبردار نہیں وہ جبار و شقی ہے۔ حضرت مسیح کے ان ارشادات سے انجیل کی بعض روایات کی تردید ہوتی ہے۔[3]

اسلوب حکمت:

﴿وَلَمَّا جَاءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُم بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُم بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ﴾[4]

یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقصد بعثت اور ان کی دعوت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی فہایت واضح نشانیوں کے ساتھ آئے اور بنی اسرائیل کو دعوت دی کہ میں تمہارے پاس کوئی نیا دین نہیں بلکہ وہی دین لے کر آیا ہوں جس کی تعلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دی البتہ حکمت دین جس سے تم اپنے آپ کو محروم کرلیا ہے وہ لے کر آیا ہوں تاکہ تم میں رعنائی زندگی پیدا ہو تاکہ بعض ان اختلافات میں امر حق واضح کروں جن میں تم مبتلا ہو گئے ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی نئی شریعت کے داعی

(۱) سورۃ مریم:۱۹/۳۰

(۲) سورۃ مریم:۱۹/۳۱

(۳) تدبر قرآن، ۴/۶۴۹

(۴) سورۃ الزخرف:۴۳/۶۳

نہیں تھے بلکہ وہ تورات کی مصدق تھے البتہ انہوں نے حکمت یعنی روح دین اور مغز دین سے بنی اسرائیل کو آشنا کرنا چاہا لیکن انہوں نے اسکی قدر نہ کی بلکہ اپنی اس ظاہر پرستی میں مبتلا رہے جن میں مبتلا تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اصل دین تو ان کے اندر سے غائب ہو گیا البتہ کچھ رسوم رہ گئے جن کو ادا کر کے وہ مطمئن ہو جاتے کہ اللہ اور اس کے دین کے تمام حقوق سے سبکدوش ہو گئے۔ اگر دین کی حکمت غائب ہو جائے صرف رسوم والفاظ باقی رہ جائیں تو اس کا الزمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ دین کے اندر طرح طرح کے اختلافات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کو دور کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ حضرت عیسی علیہ السلام نے بھی دعوت و تبلیغ میں اسی تعلیم حکمت کے ذریعے سے ان کے مذہبی اختلافات کو دور کرنا چاہا لیکن یہود نے اس حکمت کی قدر نہیں کی جس کا نتیجہ یہ نلا کہ ان کے اختلافات برابر بڑھتے رہے یہاں تک کہ وہ اپنے اس انجام کو پہنچ گئے جو ان کی ان ناقدریوں کو لازمی نتیجہ تھا۔[1]

تمام انبیاء کی دعوت میں حکمت کا اسلوب مشترکہ رہا ہے کیونکہ یہ حکمت ہی کا سلوب ہے جو داعی حضرات کو یہ عزم رکھتا ہے جس داعی میں حکمت کا سلوب ہوتا ہے وہ دعوت و تبلیغ میں اس کا بھرپور استعمال کرتا ہے ہے اور ایک رستے کو بند یکھ کر بیٹھ نہیں جاتا بلکہ چٹانیں منہ دیکھتی رہتی اور دریا کسی دوسرے راستے سے نکل جاتا ہے اسی طرح داعی حضرات حکمت سے لوگوں کے حالات وموقع محل کے مطابق دعوت کے لیے مختلف طریقے استعمال کرتا ہے۔

حضرت عیسیٰ کی دعوت میں توحید "وانذار "کا اسلوب:

﴿ فَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝٦٣ إِنَّ ٱللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمۡ فَٱعۡبُدُوهُۚ هَٰذَا صِرَٰطٞ مُّسۡتَقِيمٞ ﴾[2]

ترجمہ: تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو بے شک اللہ ہی میرا رب ہے ااور تمہارا بھی رب ہے تو اس کی بندگی کرو یہی سیدھی راہ ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی تمام الوالعزم انبیاء کی طرح توحید کی دعوت دی اپنی بندگی کی دعوت نہیں دی انجلیوں میں جو یہ آتا ہے کہ میرا باپ اور تمہارا باپ اس کی تعبیر قرآن نے ﴿ إِنَّ ٱللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمۡ ﴾ کے الفاظ سے فرمائی ہے وہ اللہ تعالیٰ کو جس معنی میں اپنا باپ کہتے ہیں اسی معنی میں دوسروں کا باپ بھی کہتے تھے ﴿ هَٰذَا صِرَٰطٞ مُّسۡتَقِيمٞ ﴾ یعنی خدا تک پہنچنے کی سیدھی راہ یہ ہے اگر کسی اور کو خدا کا شرک بنا دیا جائے تو یہ سیدھی راہ کج یا مسدود ہو جاتی ہے۔

---

(۱) تدبر قرآن، ۷/ ۲۴۵

(۲) سورۃ الزخرف: ۴۳/ ۶۴

مولانا امین احسن فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعوت کو نہایت واضح اور قطعی الفاظ میں توحید کی دی لیکن ان کی امت کے اندر سے مختلف گروہوں نے مختلف مذہب اختیار کیے اور تلیثیت اور کفارہ کے طریقے ایجاد کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم توحید کا بالکل خاتمہ کر دیا ان ہی لوگوں کے لیے ایک دردناک دن کے عذاب کی ندا کی ہے۔[1]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا موعظۃ الحسنۃ کا سلوب دعوت:

موعظۃ الحسنۃ کا اسلوب تمام انبیاء علیہ السلام کی دعوت کا مشترکہ اسلوب رہا ہے۔ اس کا اسلوب دعوت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اگر مخاطب سے بحث کے لیے کوئی مشترکہ بنیاد مل سکتی ہو تو اسی پر گفتگو کو آگے بڑھایا جائے خواہ مخواہ اپنی اتفراوین کی دھونس جمانے کی کوشش نہ کی جائے جیسا کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا:

﴿قُلْ يَـٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَـٰبِ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَقُولُوا۟ ٱشْهَدُوا۟ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾[2]

ترجمہ: کہ دو کہ اے اہل کتاب اس چیز کی طرف آ و جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مشترک ہے کہ یہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھرائیں اور نہ ہم سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھرائے اگر وہ اس چیز سے اعراض کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں۔

امین احسن اصلاحی آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

یہاں یا اھل الکتاب کا خطاب اگرچہ یہود و نصاریٰ دونوں کے لیے یکساں ہے لیکن نصاریٰ چونکہ خاص طور پر مخاطب ہیں اس لیے روئے سخن ان کی طرف زیادہ ہے توحید ہر نئی دعوت کا مشترکہ نقطہ آغاز ہے اس اسلوب کی انفرادیت یہ ہے کہ مخاطب سے بحث کے لیے کوئی مشترکہ بنیاد مل سکتی ہو تو اسی پر گفتگو کو آگے بڑھایا جائے خواہ مخواہ اپنی انفرادیت کی دھونس جمانے کی کوشش نہ کی جائے چنانچہ قرآن نے یہاں یہی طریقہ اختیار فمرای ہے۔ جہاں تک تورات کا تعلق ہے تو اس میں توحید کی تعلیم بہت وضاحت سے دی گئی ہے البتہ انجیل سے کچھ حوالے یہاں دیے جاتے ہیں کہ توحید کے معاملے میں سب سے زیادہ

(۱) تدبر قرآن، ۷/ ۲۴۶

(۲) سورۃ آل عمران: ۳/ ۶۴

گمراہی نصاریٰ کو ہی پیش آتی تھی چنانچہ سیوع نے جواب دیا تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اس کی بندگی کر۔ تو سیوح نے جواب دیا" اول حکم یہ ہے کہ اے بنی اسرائیل سن! خداوند ہمارا ایک ہی خدواند ہے"۔[1]

"اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھے خدائے واحد و برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے برحق جانیں۔[2]

آیت مبارکہ کی تفسیر امین احسن اصلاحی اہل کتاب کو دعوت دینے کے لیے مشترکہ نقاط کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں کہ داعی حضرات کو دعوت و تبلیغ میں آغاز ہمیشہ مشترکہ بنیادوں سے کرنا چاہیے تاکہ مخاطب میں ہٹ دھرمی نہ پیدا ہو۔

جماعت سے داعی کی نصرت طلب کرنے کا اسلوب:

جماعت سے داعی کی نصرت کا مطالبہ کرنا اور ان کے ساتھ دعوت و تبلیغ میں تعاون کرنا بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اسلوب خاص ہے چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ فَلَمَّآ أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ ٱلْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنصَارِىٓ إِلَى ٱللَّهِ ۖ قَالَ ٱلْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ ٱللَّهِ ءَامَنَّا بِٱللَّهِ وَٱشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴾[3]

ترجمہ: پس جب عیسیٰ علیہ السلام ان کی طرف سے کفر کت بھانپ لیا تو اس نے دعوت دی کہ کون میرا مددگار بنتا ہے اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار اور آپ گواہ رہیے کہ ہم مسلم ہیں۔

امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں کہ حواری کا لفظ عربی میں عبرانی سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے اسکے لغوی مفہوم میں اہل لغت کا اختلاف ہے ہمارے نزدیک اس کے معنی خیر خواہ حامی ناصر اور مددگار کے ہیں جس طرح لفظ انصار مدینہ کے ان جانثاروں کے لیے خاص ہوا جنھوں نے ابتدائے دعوت ہی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا اسی طرح حوارین کا لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان خاص شاگردوں کے لیے استعمال ہوا جو آپ پر ایمان لائے ہر طرح کے حالات میں آپکے ساتھ رہے آپ نے پوری شفقت اور دلسوزی سے شب و روز ان کی تعلیم و تربیت کی جو بالا آخر آپ کے داعی نقیب اور آپ کے پیغام بن کر بنی اسرائیل کی ایک ایک بستی میں پہنچے۔

من انصاری الی اللہ سے ایک طرف تو جوش دعوت کا اظہار ہے دوسری طرف ان کے اس اقدام اور اس عزم و جزم کا اظہار ہے کہ جو اللہ کے سواہر معیت اور رفاقت سے بلکل بے نیاز ہو جاتا ہے غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ دعوت کی اس للکار میں یہ مضمون بھی مضمر ہے کہ تو اپنے رب کی راہ پر چل یہ دیکھو میں چل کھڑا ہوا ہوں ان جس کے اندر حوصلہ ہو وہ اس وادی پر خار

---

(۱) مرقس: ۱۲/ ۲۹-۳۰

(۲) تدبر قرآن، ۲/ ۱۱۳

(۳) سورۃ آل عمران: ۳/ ۵۲

میں میرا ساتھ دے نبی کا یہ فیصلہ یہ عزم مُردوں میں بھی زندگی کی لہر دوڑا دینے کا اثر رکھتا ہے جن روحوں کے اندر کچھ صلاحیت ہوتی ہے وہ نہ صرف یہ کہ بیدار ہو جاتی ہیں بلکہ تڑپ اٹھتی ہیں اور جب تڑپ اٹھتی ہیں تو برسوں کی منزلیں لمحوں میں طے کر لیتی ہیں سیدنا مسیح کے الفاظ اس مسافت کو واضح کر رہے ہیں جو راہ اور منزل کے درمیان واقع ہے اور ایک داعی کی حیثیت سے ان کے شایان شان ہی تھا کہ اس راہ کی مشکلات اور درمیان کی مسافت سے آگاہ کریں لیکن حوارین نے اپنے حواری جوش فدیت کی ایک ہی جست میں گویا ساری مسافت طے کرلی ہے اور دعوت حق کے اس نازک مرحلے میں ان کے جزبہ ایمان اسلام کے شایان شان بات یہی تھی۔ (۱)

حضور نبی کریم ﷺ بھی طائف کی طرف مددگار طلب کرنے کے لیے گئے تاکہ رب کی رسالت کو پہنچائیں اور آپ حج کے اجتماع میں قبائل کی جستجو کرتے ہوئے جایا کرتے تھے تاکہ آپ تبلیغ رسالت الٰہیہ کے لیے ان نے نصرت طلب کریں۔

(۱) تدبر قرآن: ۲/ ۱۰۰-۱۰۱

فصل چہارم

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اسالیب دعوت تفہیم القرآن کی روشنی میں

حضرت عیسی علیہ السلام کے اسالیب دعوت تفہیم القرآن کی روشنی میں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کتاب وحکمت کا اسلوب:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اسالیب دعوت میں کتاب وحکمت:

﴿ وَيُعَلِّمُهُ ٱلْكِتَٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ وَٱلتَّوْرَىٰةَ وَٱلْإِنجِيلَ ۝ وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ﴾ (۱)

ترجمہ: اور اللہ اسے کتاب وحکمت کی تعلیم دے گا تورات وانجیل کا علم سکھائے گا اور بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول مقرر کرے گا۔

سید مودودی فرماتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انجیل عطا کی گئی تاکہ وہ بنی اسرائیل کو کتاب و حکمت کی روشنی میں دعوت و تبلیغ دیں چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہیں جو معجزات دکھاتا ہوں تو وہ اس امر کا اطمینان دلانے کے لیے کافی ہیں کہ میں جس خدا کا بھیجا ہوا ہوں وہی کائنات کا خالق اور ذی اقتدار ہے بشرطیکہ تم حق کو جاننے کے لیے تیار ہو اور ہٹ دھرمی نہ دکھاؤ۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک یہودی عالم نے حضرت مسیح علیہ السلام سے پوچھا کہ احکام دین میں اولین حکم کونسا ہے جواب میں آپ نے فرمایا" خداوند یعنی اپنے خدا سے اپنے سارے دل و جان اور عقل سے محبت رکھنا۔ (۲)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اسلوب "انذار"

﴿ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ ٱلتَّوْرَىٰةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ ٱلَّذِى حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ۚ وَجِئْتُكُم بِـَٔايَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ إِنَّ ٱللَّهَ رَبِّى وَرَبُّكُمْ فَٱعْبُدُوهُ ۗ هَٰذَا صِرَٰطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴾ (۳)

ترجمہ: اور میں اس تعلیم وہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو تورات میں سے اس وقت میرے زمانے میں موجود ہے اور اس لیے آیا ہوں تمہارے لیے بعض چیزوں کو حلال کردوں جو حرام کردی گئی تھیں۔ دیکھو میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر ایا ہوں۔ لہذا اللہ

(۱) سورۃ آل عمران:۳/۴۸

(۲) تفہیم القرآن،۱/۲۰۲

(۳) سورۃ آل عمران:۳/۵۰

سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا رب بھی۔ لہٰذا تم اس کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ یہ میرے فرستادہ خدا ہونے کا ایک اور ثبوت ہے اگر میں اس کی طرف سے بھیجا ہونہ ہوتا بلکہ جھوٹا مدعی ہوتا تو خود ایک مستقل مذہب کی بنا ڈالتا اور اپنے ان کمالات کے زور پر تمہیں سابق دین سے ہٹا کر اپنے ایجاد کردہ دین کی طرف لانے کی کوشش کرتا لیکن میں تو اسی اصل دین کو مانتا ہوں اور اسی تعلیم کو صحیح قرار دے رہا ہوں جو خدا کی طرف سے اس کے پیغمبر مجھ سے پہلے لائے تھے۔ یہ بات کہ مسیح علیہ السلام وہی دین لے کر آئے تھے جو موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا تھا اور تمہارے جہلا کے توجیہات کا تمہارے فقہیوں کی قانونی موشگافیوں، تمہارے رہبانیت پسند اور غیر مسلموں قوموں کے غلبہ و تسلط کی بدولت تمہارے ہاں اصل شریعت الٰہیٰ پر جن حدود و قیود کا اضافہ ہو گیا ہے میں ان کو منسوخ کروں گا اور تمہارے لیے وہی چیزیں حلال اور وہی حرام کروں گا جنھیں اللہ نے حلال یا حرام کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی بنیادی نکات یہی تین تھے۔

۱۔ ایک یہ کہ اقتدار اعلیٰ جس کے مقابلے میں بندگی کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور جس کی اطاعت پر اخلاق و تمدن کا پورا نظام قائم ہوا ہے صرف اللہ کے لیے مختص تسلیم کیا جائے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ اس مقتدر اعلیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے۔ (۱)

۳۔ تیسرے یہ کہ انسانی زندگی کو حلت و حرمت کو جواز و عدم جواز کی پابندیوں سے کھڑنے والا قانون و ضابطہ صرف اللہ کا ہو، دوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کر دیئے جائیں۔

سید مودودی آیت مبارکہ کی تفسیر میں بجا طور پر فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن میں یک سر مو فرق نہیں ہے تمام انبیاء کا مشن ایک ہی رہا ہے کہ انسانوں کی غلامی سے نجات دلائی جائے اور اصل مالک کی بندگی پرستاری اور وفاداری کی طرف دعوت دے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اسلوب دعوت:

"بندگی رب" کی طرف متوجہ کرنا:

بندگی رب دعوت کا اصل الاصول ہے، نوح علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے بھی نبی آئے سب کا پہلا مشن دعوت توحید یعنی بندگی رب کی طرف متوجہ کرنا تھا انسانوں کی انفرادی گمراہی اور اجتماعی بے راہ روی و فساد کا پہلا سبب ہی بندگی

---

(۱) تفہیم القرآن، ۱/۲۵۴

رب سے نحراف اور دوسروں کی بندگی اختیار کرنا ہے چنانچہ ہر نبی نے اپنی دعوت کا آغاز ہی بندگی رب سے کیا۔ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿وَإِنَّ ٱللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَٱعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَٰطٌ مُّسْتَقِيمٌ﴾ (۱)

ترجمہ: (اور عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ) "اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، پس تم اس کی بندگی کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔

مولانا مودودی آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہاں عیسائیوں کو بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام کی دعوت بھی وہی تھی جو دوسرے تمام انبیاعلیہ السلام کی تھی یعنی توحید انہوں نے اس کے سوا کچھ نہیں سکھایا تھا کہ صرف خدائے واحد کی بندگی کی جائے ان یہ جو تم نے ان کو بندے کی بجائے خدا بنالیا ہے اور انھیں عبادت میں اللہ کے ساتھ شریک کر رہے ہو یہ تمہاری اپنی ایجاد ہے تمہارے پیشوا کی یہ تعلیم ہر گز نہ تھی۔ (۲)

سید مودودی مزید فرماتے ہیں کہ عیسا ئی اس صراط مستقیم سے ہٹ گئے تھے جس کی طرف ابتدا میں ان کی رہنمائی کی گئی تھی۔ مسیح جے ابتدائی پیروکار جو عقائد رکھتے تھے وہ بڑی حد تک اس حقیقت کے مطابق تھے جس کا مشاہدہ انہوں نے خود کیا اور جس کی تعلیم و دعوت ان کے ہادی ورہنما نے ان کو دی تھی۔ بعد کے عیسائیوں نے ایک طرف مسیح کی عقیدت اور تعظیم میں غلو کر کے اور دوسرے طرف ادہام اور فلسفوں سے متاثر ہو کر اپنے عقائد کی مبالغہ ااور ہر فلسفیانہ تعبیریں شروع کیں اور ایک نیا مذہب اختیار کر لیا۔ (۳)

سید مودودی صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں بڑا خوبصورت انداز سے یہ واضح کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو بندگی رب کی ہی سب سے پہلے دعوت دی تاہم یہ انسانی ذہن کی صلاحیت پر پری کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ عیسائی خود اپنی مذہبی کتابوں میں سمیح کی زندگی کو صریحاً ایک انسانی زندگی پاتے ہیں پھر بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدائی سے منصف قرار دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک خیالی مسیح اپنے ذہن میں تصنیف کر کے اسے خدا بنالیا تھا اور یہی سے گمراہی کی راہ جنم لیتی ہیں کہ انسان توحید سے دور ہو جاتا ہے تو تمام برائیوں جنم لیتی ہیں۔

---

(۱) سورۃ مریم:۱۹/۳۶

(۲) تفہیم القرآن، ۲۸/۳

(۳) تفہیم القرآن، ۴۹۹/۴

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت میں معجزات کا اسلوب:

دعوت و تبلیغ کے اس مشن عظیم میں اللہ تعالیٰ نے جب اپنے انبیا کو دنیا میں بھیجا تو انہیں مختلف معجزات سے بھی نوازا جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ید بیضا، نقص ثمرات اور اس طرح کے دیگر معجزات سے نوازا گیا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی معجزات سے نوازا گیا۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

﴿وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ أَنِّي قَدۡ جِئۡتُكُم بِـَٔايَةٖ مِّن رَّبِّكُمۡ أَنِّيٓ أَخۡلُقُ لَكُم مِّنَ ٱلطِّينِ كَهَيۡـَٔةِ ٱلطَّيۡرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيۡرَۢا بِإِذۡنِ ٱللَّهِۖ وَأُبۡرِئُ ٱلۡأَكۡمَهَ وَٱلۡأَبۡرَصَ وَأُحۡيِ ٱلۡمَوۡتَىٰ بِإِذۡنِ ٱللَّهِۖ وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأۡكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمۡۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَأٓيَةٗ لَّكُمۡ إِن كُنتُم مُّؤۡمِنِينَ ۝٤٩﴾ (۱)

ترجمہ: اور جب وہ بحیثیت رسول بنی اسرائیل کے پاس آیا تو اس نے کہا میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسمہ بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور مردے کو زندہ کرتا ہوں میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو اس میں تمہارے لیے کافی نشانیاں ہیں اگر تم ایمان لانے والے ہو۔

سید مودودی ان آیٓ مبارکہ کی تفسیر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے معجزات کو بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب مٹی سے پرندہ بنا کر اس میں پھونک مارتے تو وہ اللہ کے حکم سے اڑنے لگتا۔ اسی طرح اللہ کے حکم سے آپ مادر زاد اندھی اور کوڑھی کو اچھا کر دیتے اور مردوں کو زندہ کر دیتے آپ علیہ السلام انھیں یہ بھی بتا دیتے تھے کہ تم کیا کھا کر آئے ہو اور کیا گھروں میں زخیرہ کرے ہو اور یہ سب اللہ تعالیٰ کی نشانیاں تھیں جو آپ کو عطا کی تھیں تا کہ آپ کی قوم آپ پر ایمان لے آئے لیکن اس کے باوجود آپ کی قوم ہٹ دھرم اور سر کشی میں اپنی مثال آپ تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ یہ علامات تم کو اس امر کا اطمینان دلانے کے لیے کافی ہیں کہ میں اس خدا کا بھیجا ہوا ہوں جو کائنات کا خالق اور حاکم ذی اقتدار ہے بشر طیکہ تم حق کو ماننے کے لیے تیار ہو ہٹ دھرم نہ ہو۔ (۲)

---

(۱) سورۃ آل عمران: ۳/ ۴۹

(۲) تفہیم القرآن: ۱/ ۲۵۳

سید مودودی آیت مبارکہ کی تفسیر میں بڑے احسن انداز میں فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا! کیا تمہارے اطمینان دلانے کے لیے یہ تمام نشانیاں کافی نہیں ہیں ہر نبی اپنی قوم کی ہدایت کے لیے گہرا درد رکھتا ہے اور خیر خواہی چاہتے ہوئے مختلف نشانیاں بھی دکھاتا ہے لیکن قوم پھر بھی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آتی لہذا داعیان کرام کو بھی انبیاء کے اسالیب کو مد نظر رکھتے ہوئے لوگوں کی ہٹ دھرمی سے حوصلہ شکن نہیں ہونا چاہیئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دعوت و تبلیغ میں افرادی قوت طلب کرنے کا اسلوب:

دعوت و تبلیغ کے کام میں اکیلا نبی کچھ نہیں کر سکتا ہر نبی کو دعوت میں ایسے افراد کی ضرورت رہی ہے جو اس مشن عظیم میں اس کا ساتھ دے سکیں یہی وجہ سے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اس دعوت کے منصب پر سرفراز کیا گیا تو انہوں نے بھی اللہ سے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو مددگار کے طور پر مانگا چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کفر وانکار پر آمادہ ہیں تو انہوں نے اپنی قوم سے یوں سوال کیا۔

﴿ قَالَ مَنْ أَنصَارِيٓ إِلَى ٱللَّهِۖ قَالَ ٱلۡحَوَارِيُّونَ نَحۡنُ أَنصَارُ ٱللَّهِ ءَامَنَّا بِٱللَّهِ وَٱشۡهَدۡ بِأَنَّا مُسۡلِمُونَ ﴾(۱)

عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے تو جواب دیا "ہم اللہ کے مددگار ہیں" ہم اللہ پر ایمان لائے گواہ رہنا ہم مسلم (اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دینے والے) ہیں۔

سید مودودی آی مبارکہ کی تفسیر میں رماتے ہیں کہ حواری کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو ہمارے ہاں انصار کا مفہوم ہے بائبل میں بالعموم حؤاریوں کی بجائے "شاگردوں" کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بعض مقامات پر انھیں رسول بھی کہا گیا ہے مگر رسول اس معنی میں کہ مسیح علیہ السلام ان کو تبلیغ و دعوت کے لیے بھیجا کرتے تھے نہ کہ اس معنی میں کہ خدا نے اس کو رسول مقرر کیا تھا۔

دین اسلام کی اقامت میں حصہ لینے کو قرآن مجید میں اکثر مقامات پر "اللہ کی مدد کرنے" سے تعبیر کیا گیا ہے یہ ایک تشریح طلب مضمون ہے زندگی کے جس دائرے میں اللہ نے انسان کو ارادے اور اختیار کی آزادی عطا کی ہے اس میں وہ انسان کو کفر یا ایمان، بغاوت یا اطاعت میں سے کسی ایک کو وہ دلیل و نصیحت سے انسان کو اس بات کا قائل کرنا چاہتا ہے کہ انکار و نافرمانی اور بغاوت کی آزادی رکھنے کے باوجود اس کے لیے حق یہی ہے کہ اس کی فلاح و نجات کا راستہ بھی یہی ہے کہ اپنے خالق کی بندگی و اطاعت اختیار کریں اسی طرح فہمائش اور نصیحت سے بندوں کو راہ راست پر لانے کی تدبیر کرنا، یہ در اصل اللہ کا حکم ہے اور جو بندے اس کام میں اللہ کا ساتھ دیں ان کو اللہ اپنا حامی اور مددگار قرار دیتا ہے اور یہ وہ بلند سے بلند مقام ہے جس پر

---

(۱) سورۃ آل عمران: ۳/ ۵۲

بندے کی پہنچ ہو سکتی ہے۔ نماز، روزہ اور تمام اقسام کی عبادات میں تو انسان محض بندہ و غلام ہوتا ہے مگر تبلیغ دین اور اقامت دین کی جدوجہد میں بندے کو خدا کی رفاقت و مددگاری کا شرف حاصل ہے جو اس دنیا میں روحانی ارتقاء کا سب سے اونچا مقام ہے۔ (۱)

سید مودودی آیت مبارک کی تفسیر میں خوبصورت دلائل سے یہ واضح کرتے ہیں کہ دعوت دین عبودیت کی معراج ہے یعنی عبادات میں تو انسان محض غلام ہی رہتا ہے لیکن اقامت دین جدوجہد کرنے والا تو اللہ کا مددگار بن جاتا ہے مودودی صاحب کے ان الفاظ سے دعوت و تبلیغ کی اہمیت کھل کر واضح ہوتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت میں "تبشیر" کا اسلوب:

مسیح کی دعوت کا اصول جسے قرآن نے نقل کیا ہے وہ حضور ﷺ کی تشریف آوری کی بشارت ہے چنانچہ سورۃ الصف میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول یوں بیان کیا گیا ہے۔

﴿ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ﴾ (۲)

ترجمہ: اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہو گا۔

سید مودودی فرماتے ہیں کہ کہ احمد کے دو معنی ہیں ایک وہ شخص جو اللہ کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا ہو دوسرا وہ شخص جس کی سب سے زیادہ تعریف کی گئی ہو یا جو بندوں میں زیادہ قابل تعریف ہو۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ بھی حضور ﷺ کا ایک نام تھا۔ بنی اسرائیل حضرت مسیح اور حضرت الیاس کے علاوہ ایک اور نبی کے منتظر تھے چنانچہ انجیل میں ہے کہ کہ حضرت عیسیٰ نے کہا تھا کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیجوں گا۔

تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضور کا نام مبارک لے کر آپ ﷺ کے آنے کی بشارت دی تھی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حضرت جعفر طیار نے نجاشی کے دربار میں آپ ﷺ کا ذکر کیا تو نجاشی کو یہ رائے قائم کرنے میں کوئی تعامل نہ ہوا کہ حضور ﷺ ہی وہ نبی ہیں جن کی بشارت انجیل میں موجود ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ میرے بعد جو نبی آئے گا وہ صاف انداز میں تمام احکامات پہنچا دے گا۔ (۳)

---

(۱) تفہیم القرآن، ۲۵۶/۱

(۲) سورۃ الصف: ۶/۶۱

(۳) تفہیم القرآن، ۴۲۱/۵

ہر نبی اپنی قوم کو دعوت و تبلیغ دیتا ہے تو کچھ احکامات فرائض بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کے لیے "انذار و تبشیر" کا اسلوب بھی اختیار کرتا ہے تاکہ لوگ خوش ہو کر دین حق کی راہ پر چل پڑیں لیکن ہدایت وہی پاتے ہیں جن کا سینہ اللہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے آیت مبارکہ کی تفسیر میں مودودی صاحب نے تقابل ادیان کرتے ہوئے عیسائیوں کی اپنی مذہبی کتب سے بھی اشتہاد کیا ہے۔

باب چہارم

اولو العزم انبیاء کے اسالیب دعوت (حصہ سوم)

فصل اول

حضور ﷺ کے اسالیب دعوت تدبر قرآن کی روشنی میں

مبلغ اعظم محمد ﷺ

نسب:

محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوئی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن نزاد بن فہر بن معد بن عدنان

اس کے بعد یہ سلسلہ نسب حضرت اسماعیل بن ابراھیم علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ (۱)

والدہ:

آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب بن مرہ اور والدہ سے یہ سلسلہ کلاب بن مرہ پر جا کر ملتا ہے جو والد کی طرف سے پانچویں اور والدہ کی طرف سے چوتھے جد امجد ہیں۔ (۲)

پیدائش:

ہمارے نبی ﷺ دو شنبہ کے دن نو ربیع الاول عام الفیل بمطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱م بمطابق یکم جیٹھ ۶۲۸ کو مکہ معظمہ میں بعد از صادق و قبل طلوع نہر عالم تاب پیدا ہوئے۔ آپ ﷺ اپنے والدین کے اکلوتے بچے تھے آپ ﷺ کے دادا نے خود بھی یتیمی کا زمانہ دیکھا تھا اپنے چوبیس سال کے پیارے فرزند عبد اللہ کی اس یادگار کے پیدا ہونے کی خبر سنتے ہی گھر میں آئے اور بچے کو خانہ کعبہ میں لے گئے اور دعا مانگ کر واپس لائے ساتویں دن قربانی کی اور تمام قریش کو دعوت دی۔ لوگوں نے پوچھا آپ نے بچے کا نام کیا رکھا ہے؟ تو عبد المطلب نے کہا "محمد "لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ آپ نے اپنے خاندان کے مروجہ ناموں کو چھوڑ کر یہ نام کیوں رکھا؟ فرمایا

"میں چاہتا ہوں کہ میرا یہ بچہ دنیا بھر کی ستائش اور تعریف کا حقدار قرار پائے"۔ (۳)

رضاعت:

قبیلہ بنو ہوازن کی عورت حلیمہ سعدیہ خشک سالی کے دنوں میں کچھ دوسری عورتوں کے ساتھ مکہ آئی تا کہ بچوں کو دودھ پلانے کے لیے لیا جا سکے سب عورتوں کو بچے مل گئے مگر حلیمہ سعدیہ کو کوئی بچہ نہ ملا۔ حضور انور ﷺ کو یتیم بچہ سمجھ کر سب نے چھوڑ دیا کہ معقول معاوضے کی امید نہ تھی۔ حلیمہ سعدیہ نے بھی اس طرف توجہ نہ کی جب کوئی اور بچہ نہ ملا تو اپنے

---

(۱) سیرت سید المرسلین، ڈاکٹر محمد طیب النجار، ترجمہ رخسانہ جبین، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۹۵

(۲) ایضاً

(۳) رحمۃ اللعالمین، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، چوک انارکلی، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۳۱۰

شوہر سے مشورہ کیا انہوں نے کہا مضائقہ نہیں شاید حق تعالی اس بچے کی برکت سے برکت عطا فرمائے۔ چنانچہ حلیمہ سعدیہ حضور ﷺ کو حضرت آمنہ سے لے آئیں۔ آپ ﷺ کی برکت سے حضرت حلیمہ کی صحت اچھی ہو گئی ان کے اپنے بچے کے لیے دودھ کافی نہ تھا مگر جب حضور ﷺ کو لائیں تو ان کا بیان ہے کہ دنیا ہی بدل گئی۔ اتنا دودھ اترا کہ حضور ﷺ نے سیر ہو کر پیا اور ان کے رضاعی بھائی عبد اللہ نے بھی سیر ہو کر پیا۔ سواری کا جانور بھی صحت مند اور تیز ہو گیا جب سے حضور ﷺ اس علاقے میں تشریف لائے حلیمہ سعدیہ کے سارے مویشی چراگاہوں سے خوب سیر ہو کر واپس ہوئے اور دودھ وافر مقدار میں میسر آنے لگا ان برکات کو دیکھ کر سب حیران ہوئے تھے۔[1]

حضرت حلیمہ کے پاس رہنے کی مدت:

کے مطابق آپ ﷺ حلیمہ کے پاس چھ سال تک رہے بعض نے چار سال اور بعض نے پانچ سال لیا ہے۔

والدہ کی وفات:

جب مائی حلیمہ آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی والدہ کے پاس واپس لے آئیں تو انہوں نے ام ایمن کو آپ ﷺ کی ہمہ وقت خبر گیری اور حصانت و نگہداشت کے لیے مقرر کیا آپ ﷺ کی عمر چھ سال تھی تو آپ کی والدہ اپنے خاوند عبد اللہ کی قبر پر گئیں تو واپسی پر راستے میں ابواء کے مقام پر جو جحفہ سے ۲۳ میل دور ہے داعی اجل کو لبیک کہا اس وقت آپ ﷺ کی والدہ کی عمر تیس سال تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ کی پرورش کی ذمہ داری آپ ﷺ کے دادا حضرت عبد المطلب نے نبھائی

اس دوہری یتیمی میں عبد المطلب کی عمر نے بھی وفا نہ کی اور دادا کی وفات کے بعد پرورش کی ذمہ داری آپ ﷺ کے شفیق و مہربان چچا ابو طالب نے اٹھائی۔ ابو طالب یتیم بچے کو سفر و حضر میں ساتھ لے گئے اور آپ ﷺ سے اپنی اولاد سے زیادہ محبت رکھتے۔

گلہ بانی سنت انبیاء:

بکریاں چرانا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا

((ما من نبی الاوقدرعلی الغنم قالواانت یا رسول اللہ قال وانا))

ترجمہ: کوئی ایسا پیغمبر نہیں ہوا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے بھی؟ فرمایا ہاں میں بھی۔[2]

---

(۱) رضاعت سے کفالت تک، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

(۲) طبقات ابن سعد، محمد بن سعد، ترجمہ علامہ عبد اللہ العمادی، ۱/۱۲۵

حبیب خدا کا اخلاق و جوانی:

بالیقین آپ ﷺ کی جوانی اور کیف آور شباب کا زمانہ شرافت و سعادت، پاک بازی وایمانداری، محبت و ملنساری، تدبر و دوراندیشی خدمت ملک قوم کے جواہر تابناک کا خزینہ دار تھا۔ اور آپ ﷺ نے اپنی جوانی میں اعلی کردار اور سیرت کے وہ چمکدار موتی بکھیرے اور سدابہار پھول کھلائے کہ جن کی چمک سے قیامت تک آنے والوں کی آنکھیں منور اور مہک سے دماغ معطر رہیں گے۔ کاش کے آج کا مسلمان اپنے بہترین قائد و بے مثال رہنما کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق سے بہرمند ہو سکیں۔ (۱)

تزویج خدیجہ ۲۷ قبل ہجرت ستمبر ۵۹۵:

حضرت خدیجہ مکہ کی ایک مال دار اور معزز بیوہ خاتون تھیں ان کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں حضور ﷺ کے خاندان سے جا ملتا ہے۔ حضرت خدیجہ نے آپ ﷺ کے حسن معاملہ راست بازی، صدق و دیانت پاکیزہ کی عام شہرت سن لی تھی یہاں تک کہ زبان خلق میں آپ ﷺ کو صادق اور امین کے لقب سے نواز دیا تھا یہ دیکھ کر حضرت خدیجہ نے آپ ﷺ کو اپنا تجارتی سامان دے کر ملک شام روانہ کر دیا اسی تجارتی سفر سے واپسی پر حضرت خدیجہ کے غلام میسرہ نے آپ ﷺ کے فضائل و کمالات اور کرامات و بزرگیاں حضرت خدیجہؓ کے گوش گزار کیے جوں جوں حضرت خدیجہ کو آپ کے فضائل حمیدہ سے آگاہی ہوتی رہی اور دریائے عقیدت میں جوش و تلاطم بڑھتا رہا اور بالآخر اپنی تمام تر سرداریوں اور مرتبوں کو آپ ﷺ کی غلامی کے قدموں پر نچھاور کر کے خود شادی کی درخواست کی آپ ﷺ نے اپنے چچا حضرت ابوطالب کے مشورے سے یہ رشتہ قبول کیا اور آپ ﷺ کا یہ فیصلہ آپ ﷺ کی دانائی و مستقبل بینی اور فراست و حکمت کا آئینہ دار ہے۔ نکاح کے وقت آپ ﷺ پچیس برس کے عفت مآب و صاحب جمال و جلال مرد تھے جبکہ حضرت خدیجہ چالیس برس کی بیوہ تھیں۔ حضرت خدیجہ نے آپ ﷺ کو محبت بھی دی اولاد بھی دی اور آپ ﷺ کو معاشی احتیاجات سے سے مستغنی بھی کر دیا۔ ان سے آپ ﷺ کی چھ اولادیں تھیں۔ قاسم ،زینب، ام کلثوم، رقیہ، فاطمہ، عبداللہ دونوں صاحب زادے صغیر سنی میں انتقال کر گئے۔ (۲)

---

(۱) قصص الانبیاء، خواجہ محمد اسلام، ص ۴۴۴۰

(۲) پیغمبر اعظم و آخر ﷺ، ڈاکٹر نصیر احمد، فیروز سنز لمیٹڈ، راولپنڈی، ۱۹۹۸ء، ص ۲۱۶

وحی کی ابتداء:

داعی اعظم کی زندگی میں انقلاب کے بعد انقلاب آتا رہا۔ پھر ایک رات اچانک رحمت کی برکھا برسنی شروع ہوئی روح الامین جبرئیل علیہ السلام اللہ کا پیغام لے کر غار حرا میں ظاہر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوئے اور عرض کیا "پڑھیے" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سینے سے لگایا تین بار پھر عرض کیا

﴿ اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴾[1]

ترجمہ: "پڑھ اس خداوند کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو خون کے لوتھڑے سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا ہی کریم ہے جس نے تعلیم دی قلم کے واسطے سے اس نے سکھایا انسان کو وہ جو وہ نہیں جانتا تھا۔"

یہ عظیم واقعہ ۱۷ رمضان المبارک ۶ اگست ۶۱۰ء مکہ معظمہ میں غار حرا میں پیش آیا۔ اللہ تعالی کی حکمت بالغہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں کسی سے نہ پڑھیں اور اللہ تعالی خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھائے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں اس سعادت کا اعلان یوں فرمایا:

﴿ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنسَىٰ ﴾[2]

اے محبوب ہم تمہیں قرآن پڑھائیں گے بس تم نہ بھولو گے۔

نزول قرآن کا سلسلہ شروع ہوا اور وہ کچھ پڑھا دیا اور وہ کچھ سکھا دیا جو کسی نے نہ پڑھا اور نہ سیکھا تھا۔ تربیت پانے والے کی عظمت کا اندازا تربیت دینے والے کی عظمت سے ہوتا ہے۔ کیسی شان کا وہ پڑھانے والا کیسی شان کا وہ تربیت پانے والا۔[3]

دعوت و تبلیغ کا آغاز:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے نزول کے بعد اصلاحی کام کے لیے قدم بڑھایا مگر حسن تدبیر اور حکمت عملی سے سب سے پہلے پیغام رحمت ان کو سنایا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و دیانت اور امانت پر انتہائی یقین رکھتے تھے۔ انیس خلوت محرم راز اہلیہ محترمہ سے تبلیغ کا آغاز ہوا اور سب سے پہلے اس مبارک خاتون نے آواز صداقت پر لبیک کہا۔ اپنے پروردہ آغوش دس سالہ نوجوان بھائی حضرت علی سے فرمایا وہ صدق دل سے مسلمان ہوئے۔ اپنے پروردہ غلام منہ بولے بیٹے زید سے کہا انہوں نے سر

---

(۱) سورۃ العلق: ۹۶/ ۱-۵

(۲) سورۃ الاعلی: ۸۷/ ۶

(۳) گوشہ نشینی اور بعثت نبوی، پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ص ۸۷۸

اطاعت خم کیا۔ اپنے محب قدیم یار عزیز ابو بکر بن قحافہ کو دعوت اسلام دی انہوں نے بنا تعامل تعمیل کی اور بہزاد عقیدت وصداقت کا کلمہ شہادت پڑھا۔(۱)

قریبی رشتہ داروں کو دعوت و تبلیغ:

آپ ﷺ کے قریبی رشتہ دار عباس، ابو جہل، ابو لہب اور ابو طالب وغیرہ کو دعوت حق دینے کے لیے اپنے گھر میں دعوت دی کیونکہ آپ ﷺ کا فرض خفیہ تبلیغ اور چند افراد کے ہدایت یافتہ پر ختم نہ ہوتا تھا اس لیے تین سال کے بعد اعلانیہ تبلیغ کے احکام نازل ہوئے۔

﴿فَٱصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ﴾(۲)

یعنی آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اسے کھول کر کہہ دیں۔

﴿وَأَنذِرۡ عَشِيرَتَكَ ٱلۡأَقۡرَبِينَ﴾(۳)

اور اپنے سب سے نزدیک کے اہل خاندان کو آگاہ اور ہوشیار کریں۔

اپنے خاندان والوں کو دعوت واسلام دینے کے لیے انہیں کھانے پر دعوت دی اور کھانا کھلانے کے بعد یہاں بھی لوگوں کو پیغام حق سنایا لیکن حضرت علی کے سوا کسی نے بھی اس پیغام حق کی اہمیت کو نہ سمجھا۔(٤)

اہل مکہ کو تبلیغ:

حضور ﷺ نے اہل خاندان کے بعد اس دعوت کے دائرے کو کچھ اور وسیع کیا۔ اور سارے اہل مکہ اور اطراف کے لوگوں میں پیغام پہنچانا شروع کر دیا۔ حکم ربانی ہوا:

﴿لِّتُنذِرَ أُمَّ ٱلۡقُرَىٰ وَمَنۡ حَوۡلَهَا﴾(٥)

تاکہ آپ مکہ معظمہ اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو ڈرائیں۔

چنانچہ حضور ﷺ کے اعلانیہ دعوت و تبلیغ کا آغاز کوہ صفا سے کیا لیکن آپ ﷺ کی قوم نے آپ ﷺ کی ایک نہ سنی اور الٹا آپ ﷺ کو ایذائیں دینا شروع کر دیں۔ مشرکین مکہ آپ ﷺ کا مذاق اڑاتے آپ ﷺ کو طرح طرح کی ذہنی

---

(۱) قصص الانبیاء، ص۴۶۹

(۲) سورۃ الحجر: ۱۵/ ۹۴

(۳) سورۃ الشعراء: ۲۶/ ۲۱۴

(۴) حضور ﷺ بحیثیت مبلغ وداعی، مسز نصرت ضیاء، علامہ اقبال یونیورسٹی اسلام آباد، ص ۴۷۲ ۴۷۴

(۵) سورۃ الشوریٰ: ۴۲/ ۷

اور جسمانی تکلیفیں دیتے کیونکہ آپ ﷺ کی دعوت مشرکین مکہ کے آبائی رسم وعقائد کے خلاف تھی اور اسی بناپر وہ راہ حق پر گامزن نہ ہوناچاہتے تھے ۔

چنانچہ اسی سلسلے میں مولانا شبلی نعمانی[۱] لکھتے ہیں:

"ناتربیت یافتہ قوموں کا خاصہ ہے کہ کوئی تحریک جوان کے آبائی رسوم وعقائد کے خلاف ہو ان کو سخت برہم کر دیتی ہے۔ ان کے ساتھ ان کی مخالفت محض زبانی نہیں ہوتی بلکہ ان کی تشنگی انتقام کو خون کے سوا کوئی چیز نہیں بجھاسکتی۔[۲]

حضور ﷺ کی مکی حیات مبارکہ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جہاں آپ ﷺ کی انقلابی سرگرمیاں تیز ہوتی گئیں۔ اسی قدر اہل مکہ کی دشمنی بڑھتی گئی مگر داعی حق ایک قدم پیچھے نہ ہٹے اور صبر واستقامت کی وہ اعلی مثال قائم کی کہ تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

پیر محمد کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں کہ اپنے رب کریم کا یہ حکم ملتے ہی رسول اکرم ﷺ نے کمر ہمت باندھ لی، حق کا علم بلند کرنے ظلمت کدہ عالم کو نور توحید سے منور کرنے، باطل کو میدان میں شکست فاش دینے کے لیے یتیم مکہ نے عزم مصمم کر لیا۔ ہادیہ ضلالت میں صدیوں سے بھٹکنے والے قافلہ انسانیت کو منزل مراد تک پہنچانے کے لیے جو قدم اٹھ وہ ہمیشہ آگے ہی بڑھتا گیا۔ مخالفت کا کوئی طوفان اس کی برق رفتاری کو متاثر نہ کر سکا۔ عداوت وحسد کے کتنے ہی آتش کدے بھڑکائے گئے لیکن اس بشیر ونذیر رسول کے مبارک قدموں کی برکت سے وہ گلستانوں میں تبدیل ہوگئے۔ تند وتیز آندھیاں اس کے روشن کیے ہوئے چراغوں کو بجھانہ سکیں اس کے جانثاروں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے لیکن ان کی حوصلہ مندی میں ذرا فرق نمایاں نہ ہوا۔[۳]

اپنی تیرہ سالہ مکی زندگی میں اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کے لیے آپ ﷺ نے انفرادی سطح پر بھی تبلیغ کا طریقہ اپنایا آپ ﷺ خود چل کر گئے اور لوگوں کو اسلام قبول کرنے کے لیے قائل کیا چنانچہ ابتدائی تین برسوں میں چالیس افراد کا اسلام قبول کرنا اس طریقہ تبلیغ کی خصوصی نوعیت پرامن ترغیبی وروحانی طریقہ تبلیغ کی کامیابی کی روشن دلیل ہے۔[٤]

---

(۱) مولانا شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء کو بھارت میں پیدا ہوئے۔ شبلی شاعر بھی ہیں تاہم ان کی شہرت کا دارومدار نثر پر ہے۔ ان کی مشہوری تصانیف الفاروق، سیرۃ النبی ﷺ ہیں۔ پہلے علی گڑھ سے وابستہ رہے پھر ندوۃ العلماء سے منسلک ہوگئے۔ ۱۹۱۳ء میں جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

(۲) سیرۃ النبی ﷺ، مولانا شبلی نعمانی، الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۳۱

(۳) ضیاء النبی ﷺ، پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاالقرآن لاہور، ۲/۲۱۷

(۴) طبقات، ابن سعد، دار الفکر، بیروت، ۱۹۶۰ء، ۱/۱۲۱

طائف میں دعوت و تبلیغ:

اہل مکہ سے مایوس ہو کر آپ ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ طائف تشریف لے جائیں اور وہاں کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں طائف میں بڑے بڑے امراء وروءسا رہتے تھے چنانچہ آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے یہ سفر آپ ﷺ نے دس نبوی میں فرمایا۔ اس سفر میں آپ ﷺ نے طائف میں ایک ہفتہ بسر کیا آپ ﷺ بنو ثقیف کے تینوں سرداروں عبد لیل، مسعود اور حبیب سے ملے مگر انہوں نے قبول اسلام سے انکار کر دیا آپ ﷺ نے انہیں کہا اگرچہ انہوں نے یہاں دعوت قبول نہیں کی تو اپنی رائے کو پوشیدہ رکھیں گے مگر انہوں نے یہ بھی تسلیم نہ کیا اور پھر جب آپ ﷺ نے اہل طائف کو تبلیغ کرنے کے لیے ان کے پاس سے آئے تو انہوں نے شہر کے بے سمجھ لڑکوں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگایا جنہوں نے آپ ﷺ پر سنگ باری کی اور آپ ﷺ کو لہولہان کر دیا جس کے نتیجے میں آپ ﷺ زخمی ہو گئے یہ آپ ﷺ کی تبلیغی و دعوتی زندگی کا سب سے زیادہ بھیانک حادثہ تھا جو ہمیشہ یاد رکھا گیا ہے۔ (۱)

قبائل عرب میں دعوت و تبلیغ:

حضور ﷺ نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ دعوت و تبلیغ کے لیے صرف کر رکھا تھا آپ ﷺ دعوت و تبلیغ کے لیے قبائل کے پاس تشریف لے گئے اور انہیں راہ حق کی طرف بلایا ان قبائل نے بنو عامر بن صعصعہ، بنو محارب بن حفصہ، بنو فزاہ (غطفان)، بنو مرہ بن سلیم، بنو کندہ، بنو کلب، بنو حارث، بنو کعب، بنو عبس، بنو نضر اور بنو غزارہ وغیرہ کے متعدد قبائل عرب شامل ہیں مگر اس وقت ان میں سے کسی کو بھی قبول حق کی توفیق نہیں ملی۔ (۲)

دعوت و تبلیغ شہر مدینہ میں:

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو حکمت و بصیرت کا خزانہ مرحمت کیا تھا آپ ﷺ نے دعوت و تبلیغ میں اسے بھرپور استعمال کیا مکی دور کے آخری دنوں میں مخالفت اپنے عروج پر جا پہنچی تھی جس کی وجہ سے آپ ﷺ انتہائی نامساعد حالات میں مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے وہاں آپ ﷺ نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو از سر نو منظم کیا آپ ﷺ نے اسلام کی تبلیغ کے لیے ایک جماعت قائم کی جس کا نام عام طور سے اصحاب صفہ مشہور ہے اس میں بعض اوقات سو سے زیادہ افراد داخل رہے ہیں۔ صحابہ کرام وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں کے باشندوں، قوموں اور قبیلوں میں اسلام کی دعوت لے کر پہنچے۔ احادیث و سیر کی کتابوں میں ان کے متفرق نام ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے پینتیس صحابہ کرام کے نام جمع کیے ہیں جنہوں نے حضور ﷺ کے حکم سے اس اہم فرض کو انجام دیا ان کے نام یہ ہیں۔ (۳)

---

(۱) السیرۃ النبویہ، ابن شام، مطبوعہ قاہرہ، ۵/ ۶۴، ۶۵

(۲) الوفا باحوال المصطفی، ابن الجوزی، قاہرہ، مصر، ۱/ ۲۱۵، ۲۱۶

(۳) سیرت النبی ﷺ، سید سلیمان ندوی، مطبع اعظم، گڑھ، ص ۱۲۴

اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں اشاعت اسلام اور عالم اسلامی کا رقبہ

نمبر شمار	صدی	مجموعی رقبہ میلوں میں	کیفیت
۱	۱ھ تا ۱۰۰ھ	۴۰لاکھ میل	ترقی
۲	۱۰۰ھ تا ۲۰۰ھ	۵۰لاکھ میل	ترقی
۳	۲۰۰ھ تا ۳۰۰ھ	۵۵لاکھ میل	ترقی
۴	۳۰۰ھ تا ۴۰۰ھ	۸۲لاکھ میل	تنزل
۵	۴۰۰ھ تا ۵۰۰ھ	۷۰لاکھ میل	ترقی
۶	۵۰۰ھ تا ۶۰۰ھ	۷۹لاکھ میل	ترقی
۷	۶۰۰ھ تا ۷۰۰ھ	۷۵لاکھ میل	تنزل
۸	۷۰۰ھ تا ۸۰۰ھ	ایک کروڑ چالیس لاکھ میل	ترقی
۹	۸۰۰ھ تا ۹۰۰ھ	ایک کروڑ پینتیس لاکھ میل	ترقی
۱۰	۹۰۰ھ تا ۱۰۰۰ھ	ایک کروڑ پچاسی لاکھ میل	ترقی
۱۱	۱۰۰۰ھ تا ۱۱۰۰ھ	ایک کروڑ ترپن لاکھ میل	تنزل
۱۲	۱۱۰۰ھ تا ۱۲۰۰ھ	ایک کروڑ پینسٹھ لاکھ میل	ترقی
۱۳	۱۲۰۰ھ تا ۱۳۰۰ھ	پینتالیس لاکھ میل	تنزل
۱۴	۱۳۰۰ھ تا ۱۴۰۰ھ	ایک کروڑ بیس لاکھ میل	ترقی
۱۵	۱۴۰۰ھ تا ۱۴۲۴ھ	دو کروڑ میل	ترقی(۱)

درج بالا گوشوارے سے یہ ظاہر ہوتا ہے جب مسلمانوں نے دعوت و تبلیغ میں زیادہ سرگرمی دکھائی تو اشاعت اسلام میں بھی ترقی ہوئی لیکن جب مسلمانوں نے اس فرض اولین کی ادائیگی میں سستی دکھائی تو اشاعت اسلام میں بھی تنزل واقع ہوا۔

میدان کارزار اور فریضہ تبلیغ:

مدنی دور میں غزوات و سرایا کا سلسلہ شروع ہوا جو کہ دعوت و تبلیغ نبوی ﷺ کا تیسرا مرحلہ ہے جب کبھی بھی اس

(۱)مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے، محمد الیاس ندوی، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۶۷

اہم فرض کو انجام دیا گیا تو مخالفین نے رکاوٹوں کے انبار لگا دیئے چنانچہ دعوت کا راستہ صاف کرنے کے لیے اللہ تعالی نے جہاد اور قتال کی اجازت دی اور یہ مرحلہ سب سے آخر میں آتا ہے اسلام امن اور آتشی کا مذہب ہے۔

امن اسلام کا اصل مطلوب ہے اور جنگ یا تشدد کے ذریعے اس مطلوب کو حاصل نہیں کیا جا سکتا اس کو حاصل کرنے کا صرف ایک ذریعہ ہے وہ ہے "پر امن دعوت و تبلیغ"۔ حضور ﷺ غزوات و سرایا کا مقصد بھی دین حق کی سربلندی تھا۔

اگرچہ مشرکین نے ان غزوات و سرایا کی وجہ سے بے شمار اعتراضات اٹھائے تاہم یہ صرف ان کی اسلامی دشمنی ہے۔

حضور ﷺ نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ جنگ میں کم سے کم نقصان ہو اسی بنا پر آپ ﷺ کے واضح احکام تھے کہ عین لڑائی کی حالت میں بھی مخالفین کو پہلے تبلیغ کی جائے۔

حضور ﷺ کے غزوات اور سرایا کا مقصد بھی صرف دعوت و تبلیغ تھا اشاعت اسلام اور بقائے امن تھا۔

اب نبی کریم ﷺ کے غزوات اور سرایا کی تفصیل دیکھیں۔ حضور ﷺ کے غزوات و سرایہ کی تفصیل ملاحظہ ہو کہ حضور ﷺ کس طرح ابر رحمت بن کر انقلاب سے انسانی تاریخ کا دھارا موڑ دیا۔

حیات مبارکہ میں کل غزوات و سرایا	۸۱
حضور ﷺ کی غزوات میں شرکت	۲۷
عہد نبوی میں مجموعی مسلمان شہدا کی تعداد	۲۵۹
کفار مقتولین کی تعداد	۷۵۹

دیگر سیرت نگاروں کے مطابق حضور ﷺ کے عہد مبارک میں مسلمان شہدا اور کفار و مقتولین کی تعداد دو یا تین ہزار سے زیادہ بالکل نہیں رہتی جو کہ آپ ﷺ کے رحمت للعالمین ہونے کا ثبوت ہے جب کہ اس مقابلے میں پہلی جنگ عظیم میں قریبا ایک کروڑ آدمی مارے گئے اور دو کروڑ زخمی و اپاہج ہو جائے یہ حضور ﷺ کی کاوشیں بطور داعی الی اللہ تھیں کہ اسلام جو پہلے شہر مدینہ کے چند محلوں تک تھا وہ گیارہ ہجری میں دس لاکھ مربع میل تک پھیل چکا ہے۔ (۱)

میثاق مدینہ اور دعوت و تبلیغ:

رسول اللہ ﷺ نے تحریک اسلام کے فروغ کے لیے دعوت و تبلیغی، عسکری و جہادی، آئینی و دستوری، سیاسی و معاہداتی نتائج کو اختیار فرمایا ان تمام تر اقدامات میں آپ ﷺ کی جد و جہد کی غایت جو احقاق حق، ابطال باطل اور غلبہ دین حق سے عبارت ہے موجود رہی۔ (۲)

(۱) نقوش رسول ﷺ، نبی ﷺ بحیثیت و مدبر اور ماہر سیاست دان، مولانا امین احسن اصلاحی ۳/۶۲۶

(۲) جدید دور کے مسائل اور ان کا حل، ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی، سنگ میل پبلیکیشنز، ص ۴۲

میثاق مدینہ میں جہاں ایک طرف آپ ﷺ کی دعوت و تبلیغ کی مساعی کو ایک نئے مرحلے میں داخل کر دیا وہاں ابد الآباد تک عالمی منظر نامے میں بھی اسلام کو ایک نمایاں اور بے مثال مقام دیا۔ میثاق مدینہ کو کائنات انسانی کا سب سے پہلا تحریری دستور ہونے کا مقام حاصل ہے۔ رسول ﷺ کا یہ قدم بھی دعوت و تبلیغ کی اشاعت کے لیے تھا تاکہ اسلام کو پھلنے پھولنے کا پر امن موقع ملے "رسول اللہ ﷺ دعوت حق کے فروغ کے لیے ہر اس قدم کو اختیار فرمایا جس سے آپ ﷺ کی دعوت فروغ پذیر ہو سکتی تھی ہر اس امر کی نفی فرمائی اور اسے مسترد کر دیا جس سے آپ ﷺ کی دعوت حق کے آفاقی اور عالمی تشخص کے متاثر ہونے کا امکان پیدا ہوتا تھا چاہے اس کے لیے آپ ﷺ کو بے شمار مشکلات اور مصائب ہی کیوں نہ برداشت کرنا پڑتے۔ چونکہ میثاق مدینہ کے ساتھ ایک باقاعدہ اسلامی مملکت وجود میں آگئی جو غلبہ دین حق کی خشت اول تھی"۔[۱]

صلح حدیبیہ دعوت و تبلیغ میں اہم سنگ میل:

حضور ﷺ کی دعوت و تبلیغ میں "صلح حدیبیہ" ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۶ھ میں حدیبیہ کے مقام پر قریش اور مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جسے صلح حدیبیہ کا نام دیا گیا ہے۔ صلح حدیبیہ کی شرائط ایسی تھیں کہ صحابہ کرام کی اکثریت اس پر مطمئن نہ تھی لیکن بعد کے حالات وواقعات سے یہ ثابت ہوا کہ صلح حدیبیہ تاریخ اسلام کا وہ سنہری موڑ ہے جس نے اسلام کو چار دانگ عالم میں پھیلا دیا اور ایسا صرف رب اعلی کے حکم سے اور سرور دو عالم ﷺ کے حکیمانہ دعوت و تبلیغ سے ممکن ہوا۔ اس کے بعد یہ صلح فتح مکہ کا دیباچہ ثابت ہوئی اور اسلام مخالفین کے دلوں میں اتر گیا" اس کے بعد مسلمانوں نے سات ہجری میں خیبر اور آٹھ ہجری میں مکہ فتح کر لیا"۔[۲]

مسلمانوں کی یہی وہ عظیم فتح تھی جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا تھا آپ دیکھیں کہ اس معاہدے کے بعد کہ سب لوگ لشکروں کی شکل میں اسلام قبول کریں گے اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے

﴿ إِذَا جَآءَ نَصۡرُ ٱللَّهِ وَٱلۡفَتۡحُ ٥ وَرَأَيۡتَ ٱلنَّاسَ يَدۡخُلُونَ فِي دِينِ ٱللَّهِ أَفۡوَاجٗا ٥ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَٱسۡتَغۡفِرۡهُۚ إِنَّهُۥ كَانَ تَوَّابَۢا ﴾[۳]

---

(۱) میثاق مدینہ کا آئینی تجزیہ، ڈاکٹر طاہر القادری، منہاج القرآن پرنٹرز، لاہور ۲۰۰۱ء، ص ۲۰

(۲) پیارے رسول ﷺ رحمت کی پیاری سیرت، پروفیسر محمد مشتاق، غازی پبلشرز، کراچی، ص ۱۳۹

(۳) سورۃ النصر: ۱۱۰/ ۳-۱

ترجمہ: اور جب اللہ کی مدد آپہنچی اور فتح حاصل ہو گئی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ غول کے غول دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار کے ساتھ تسبیح کرو اور اسی سے معفرت مانگو بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔

صلح حدیبیہ کے بعد مسلمانوں کو نئی قوت نئی ہمت اور نیا عزم ملا اور اسلام کی دعوت و تبلیغ کا ایک نیا دور اور انداز شروع ہوا۔ مسلمان سرگرم ہو گئے اور میدان عمل میں دین متین کی سرفرازی کے لیے آپ ﷺ کی ہدایت ورہنمائی میں بلا چوں وچراں نکلنے لگے۔

اس صلح کے بعد نبی اکرم ﷺ کو یکسو ہو کر اپنی دعوتی سرگرمیوں پر توجہ دینے کا موقع مل گیا یہی وہ زمانہ تھا کہ اصحاب صفہ کی جو جماعت تیار ہو رہی تھی رسول ﷺ نے ان کے وفود بنا کر مختلف قبائل کی طرف بھیجے اس صلح کے نتیجے میں اسلام جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگا، مورخین اور سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ اس صلح سے لے کر فتح مکہ تک اس قدر لوگ اسلام لائے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں لائے تھے۔ (۱)

صلح حدیبیہ کے بعد اب رسول ﷺ کی دعوت و تبلیغی سرگرمیاں دو شاخوں میں بٹ گئیں ایک اندرون ملک اور دوسری بیرون ملک (۲)

"(نبی امی ہادی برحق) رسول اللہ ﷺ نے اسلام کو کل دنیا کا مذہب واحد کہہ کر پیش کیا ہے نبوت کے ابتدائی زمانے میں جب کہ شہر مکہ کے رہنے والے اسلام سے واقف نہ تھے رسول اللہ ﷺ نے دیگر اقوام اور دیگر ادیان کے لوگوں کو بھی دعوت و تبلیغ دینا شروع کر دیا تھا روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت بلالؓ کو سابقہ "الحبشہ" حضرت صہیبؓ کو "سابق الروم" فرمایا اور حضرت سلمان کو جو پہلے ایرانی نو مسلم ہیں اور سن ایک ہجری میں اسلام قبول فرمایا انہیں "سابق الفرس" کا لقب دیا۔ رسول ﷺ نے اس بات کو واضح کر دیا تھا کہ اسلام کو قوم عرب تک محدود رکھنا مقصود نہیں"۔ (۳)

اسلام کا یہ دعوی کہ وہ عالم گیر ہے اور تمام لوگوں اور قوموں پر حاوی ہے اس کی عملی مثال ان مراسلات میں ملتی ہیں جو کہ رسول ﷺ نے اپنے زمانے میں حکمرانوں کو بھیجے تھے۔ چنانچہ سرکار نامدار ﷺ نے مختلف ملکوں کے بادشاہوں اور سرداروں کے پاس تبلیغی خطوط بھیجے جن میں سے کئی خوش نصیب بادشاہوں نے سرور دوعالم کی غلامی قبول فرمائی اور اس طرح مسلمانوں کی قوت وعظمت میں اضافہ ہوا۔ (٤)

---

(۱) منبع انقلاب نبوی ﷺ، ڈاکٹر اسرار احمد، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ص ۲۲۴

(۲) ایضاً، ص ۲۲۷

(۳) دعوت اسلام، پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ، مترجم ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، محکمہ مذہبی امور واوقاف، حکومت پنجاب، ص ۵۴

(۴) ایضاً، ص ۵۲

المختصر حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو جو دعوت و تبلیغ کا فرض سونپا گیا تھا آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اپنی حیات مبارکہ کا ایک سانس مبارک اس لا زوال دین مبین کی اشاعت پر صرف کیا کہیں پہاڑی پر چڑھ کر آل فھر کی آواز لگائی دعوت و تبلیغ کے لیے، کہیں دار ارقم کے اندر خفیہ تبلیغ کی سفر طائف میں نعلین مبارک میں خون جم جاتا ہے مگر زبان مبارک محوِ دعوت الی اللہ ہے۔(۱)

عکاظ کے میلے میں لوگ دنیا کی سرمستیوں میں گم ہیں اور میدانی پورے درد کے ساتھ آواز لگارہا ہے "کے لوگو! کہو اللہ ایک ہے تم فلاح پاؤگے"۔ ابو لہب دیوانہ کہہ رہا ہے مگر میرا ہادی برحق دیوانہ وار اس بگڑی ہوئی عیاشیوں میں مست قوم کو فلاح کی طرف بلارہا ہے۔ عقبہ کی خطرناک گھاٹی میں بھی نور عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم یک و تنہا اس لیے گام فرسا ہیں کہ شاید کسی ایک ہی نفس کے کان میں اپنی دعوت کی آواز پہنچا سکیں۔

راہ ہجرت کا سفر ہے سرور دوعالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اپنی جائے پیدائش کو اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے چھوڑ کر جارہے ہیں ایک طرف مادر وطن سے دوری کا غم ہے تو دوسری طرف کینہ توز دشمنوں کے تعاقب کا دھڑکا اور یہ دور اندیشی شاہ سواروں اور راہروؤں کو تیز گامی سے لے جاتا ہے پر میں ہزار بار اس نبی برحق پر قربان جو دعوت الی اللہ کے فرض کو یہاں بھی نہیں بھولا ام معبد الخزاعیہ، سراقہ بن مالک المدلجی اور بریدہ بن الحصیب اسلمی اور اس کے ستر ساتھی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایسی خشک و بنجر اور بیابان وادی میں اپنے لیے راہ مستقیم پائی۔

آٹھ دن کی مسافت کے بعد اور ایسے سفر کی تھکان کے بعد جو سخت جان جانوروں کو بھی تھکا دیتا ہے مگر رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم عربی خیر امم دعوت الی اللہ کے شوق کی تعمیل میں دوسرے دن بھی مسجد قبا کی بنیاد رکھتے ہیں جہاں سے حیَّ علی الصلاۃ حیَّ علی الفلاح کی بازگشت پہاڑوں کا سینہ چیرنے لگی اور یہی صدا آج بھی صبح و شام غافلوں کو جگاتی، شائقوں کو بلاتی ہے آج تک اس داعی اعظم کی پکار کو تازہ کرتی ہے یہاں تک کہ پیغمبر اعظم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم مدینہ میں پہنچتے ہیں۔ مدینہ میں ایک جہاں ہے جو دیدہِ دل فراش کیے بیٹھا ہے۔ بچیاں ہاتھوں میں دف لیے استقبالیہ نغمے گارہی ہیں مگر رہبر و رہنما اس قدر و منزلت اور عزت کی انتہا کو دیکھتے ہوئے بھی ذرا لحظہ کو اپنے فرض سے غافل نہیں ہوتے اور یہاں بھی صاف زمین پر بیٹھ کر آیاتِ قرآن کی تبلیغ فرما کر دعوت الی اللہ کا اہتمام فرماتے ہیں مدینہ منورہ میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اللہ کے حکم کے مطابق اس کے قوانین کے مطابق زندگی کے معاشرتی و معاشی قوانین بھی نافذ کرتے ہیں اور دعوت و تبلیغ سے عرب و عجم کو فیض یاب کرتے ہیں۔

سسکتی ہوئی جان توڑتی ہوئی نواسی کو گود میں لیتے ہیں تو اس وقت بھی دعوت الی اللہ میں مصروف نظر آتے ہیں اکلوتے بیٹے ابراہیم کی لاش پر بیٹھتے ہیں تو اسوقت بھی حاضرین کو رضائے الہی کے معنی سمجھاتے ہیں۔

آخری دن ہے سفر آخرت میں کچھ گھنٹوں کا وقفہ ہے مسلمان صبح کی نماز کے لیے اکھٹے ہیں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم حجرہ مبارک سے اس منظر کو دیکھتے اور تبسم فرماتے ہیں اور اس بڑے مجمع کے سامنے آخری دفعہ دعوت الی اللہ کی نورانی مثال قائم فرماتے ہیں۔

---

(۱) پیارے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم رحمت کی پیاری سیرت، پروفیسر محمد مشتاق، ص ۱۴۲

آخری گھڑی ہے بیوی، بیٹی اور نواسے اس تنگ حجرہ میں جمع ہیں جس کے اندر دس سے زیادہ اشخاص کے لیے گنجائش نہیں اس وقت بھی آقائے دوعالم فخر مجتبی دعوت الی اللہ اور ترحم بر عباد اللہ کی تعلیم زبان پر ہے۔ جان مبارک جان آفرین کے سپرد کرنے کا وقت ہے ایسے وقت میں بھی ہادی ورسل دعوت و تبلیغ کا فرض ادا کرتے رہتے ہیں اور "**الصلوۃالصلوۃوماملکت ایمانکم**" نماز نماز اور لونڈی غلام کے حقوق کی تلقین کرتے ہیں۔

تاریخ عالم ہمیں ایسا نمونہ دکھانے سے قاصر ہے جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ دعوت الی اللہ ہی میں پورا ہوا اس لیے "﴿ وَدَاعِيًا إِلَى ٱللَّهِ بِإِذْنِهِۦ ﴾ "(۱) کا خطاب نبی کریم ﷺ کی ذات مبارکہ سے خاص معلوم ہوتا ہے اور اس لیے اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ کو اس صفت سے معرف فرمایا۔(۲)

مائیکل ہارٹ انگریز مصنف نے اپنی کتاب "سو عظیم آدمی" میں آپ ﷺ کو خراج تحسین پیش کیا ہے:

"انتہائی متاثر کن شخصیات کی فہرست میں حضرت محمد ﷺ کا شمار سب سے پہلے کرنے پر چند احباب کو حیرت ہو اور کچھ معترض بھی ہوں لیکن یہ واحد تاریخی ہستی ہے جو مذہبی اور دنیاوی دونوں محاذوں پر برابر طور پر کامیاب رہی ہے حضرت محمد ﷺ نے عاجزانہ طور پر اپنی مساعی کا آغاز کیا اور دنیا کے عظیم مذاہب میں سے ایک مذہب کی بنیاد رکھی اور اسے پھیلایا وہ ایک انتہائی موثر سیاسی رہنما بھی ثابت ہوئے آج تیرہ سو برس گزرنے کے باوجود ان کے اثرات انسانوں پر ہنوز مسلم اور گہرے ہیں"۔(۳)

"مزید لکھتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نہ صرف ایک کامیاب دنیادار تھے بلکہ ایک مذہبی رہنما بھی تھے"۔(٤)

حضور ﷺ نے دعوت و تبلیغ کو اس کی معراج تک پہنچایا اور آپ ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد امت محمدیہ ﷺ کا فرض اولین ہے۔

اسلوب حکمتِ تبلیغ تدبر قرآن میں:

رسول پاک ﷺ داعی اعظم کی زبان وحی ترجمان سے اصول دعوت کا طریقہ بھی معلوم ہوا کہ کس طرح آپ ﷺ نے عرب کے جاہل اور وحشی قوم کو حق وصداقت کے قبول کرنے کی دعوت دی۔ آپ ﷺ نے جس حکیمانہ انداز میں دعوت تبلیغ کا فریضہ انجام دیا ہے قرآن پاک میں سورالنحل میں اس اصول کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔

---

(۱) سورۃ احزاب: ۳۳/۴۶

(۲) رحمۃ للعالمین، قاضی سلیمان منصور پوری، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، ۲/ ۲۹۹

(۳) مائیکل ہارٹ ایک امریکی تاریخ دان اور ماہر فلکیات ہیں۔ وہ دنیا بھر میں اپنی کتاب "سو عظیم آدمی" کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی پیدائش ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ تاریخ فلکیات ان کے خاص شعبے ہیں۔(http//ur.wikipedia.org.wiki.)

(۴) سو عظیم آدمی، مائیکل ہارٹ، مترجم محمد عاصم بٹ، تخلیقات، ۳مزنگ روڈ، ۲۰۰۲ء، ص ۲۵

﴿ ٱدۡعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِٱلۡحِكۡمَةِ وَٱلۡمَوۡعِظَةِ ٱلۡحَسَنَةِۖ وَجَٰدِلۡهُم بِٱلَّتِي هِيَ أَحۡسَنُۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعۡلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِۦ وَهُوَ أَعۡلَمُ بِٱلۡمُهۡتَدِينَ ﴾[۱]

ترجمہ: اپنے رب کے راستے کی طرف سے حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور ان کے ساتھ ایسے طریقے سے بحث کرو جو پسندیدہ ہے بے شک تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور ان کو بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت پانے والے ہیں۔

مولانا امین احسن فرماتے ہیں حکمت سے مراد یہاں دلائل و براہین ہیں اور موعظت حسنہ سے مراد مشفقانہ انداز میں تذکیر و تنبیہ ہے دعوت دین میں دو چیزیں اصول کار کی حیثیت رکھتی ہیں آدمی جو بات بھی کہے دلیل و برہان کی روشنی میں کہے اور انداز دھونس جمانے کا نہ ہو بلکہ اس کے سچے جذبہ خیر خواہی و ہمدردی کا غماز ہو تا کہ مخاطب بدکنے کی بجائے اس کی باتوں کے سننے اور ان پر غور کرنے کی طرف مائل ہو اگرچہ ہٹ دھرم لوگ اس سے بھی نہیں بچتے لیکن خیر و برکت کا طریقہ یہی ہے۔

یہ پیغمبر ﷺ اور آپ ﷺ کے واسطے آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ تعالی عنہ کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم اللہ کے راستے کی طرف دعوت حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ دو اس ہدایت کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اس دور میں مخالفین کے رویے میں بڑی گرما گرمی پیدا ہو گی تھی پھر اب حضور ﷺ بھی تنہا نہیں تھے۔

بلکہ آپ ﷺ کے ساتھ مومنین کی ایک جماعت میدان عمل میں آگئی تھی ایسی حالت میں یہ بات بعید از امکان نہ تھی کہ مبادا مخالفین کے رویے سے تنگ آکر مسلمان بھی کوئی سخت رویہ اختیار کر لیں اور اس کا اثر دعوت کے مزاج پر پڑے اس سے دعوت کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ ہدایت فرمائی گئی کہ دعوت دین کے معاملے میں قدم حکمت اور موعظت سے منحرف نہ ہونے چاہئیں۔

﴿ وَجَٰدِلۡهُم بِٱلَّتِي هِيَ أَحۡسَنُۚ ﴾[۲]

دعوت کے کام میں بحث و گفتگو منع نہیں لیکن اس میں بھی یہ قید لگا دی گئی ہے کہ اس کے لئے بہتر طریقہ استعمال کیا جائے اگر حریف اشتعال انگیز رویہ اختیار کر لے تو اس کے رویے سے متاثر ہو کر آدمی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش نہ کرے بلکہ ہر حال میں اپنی شائستگی برقرار رکھے۔[۳]

---

(۱) سورہ النحل: ۱۶/ ۱۲۵

(۲) ایضا: ۱۶/ ۱۲۵

(۳) تدبر قرآن: ۴/ ۴۶۴

﴿ وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنزَغُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا ﴾[1]

ترجمہ: اور میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہ وہی بات کہیں جو بہتر ہے بے شک شیطان ان کے درمیان وسوسہ اندازی کرتا ہے بے شک وہ انسان کا کھلا دشمن ہے۔

مسلمانوں کو ہدایت کی جارہی ہے کہ کفار کے رویے سے متاثر ہو کر کوئی ایسا قدم نہ اُٹھا بیٹھیں جو دعوت کے مزاج کے منافی ہو۔ فرمایا کہ میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہو یعنی مخالفین کی بے ہودہ باتوں کا جواب نہ دیں صرف صحیح اور سچی بات پہنچا دینے کی کوشش کریں۔ یاد رکھیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے ہر وقت اس کوشش میں ہے کہ کب موقع ہاتھ آئے اور وہ وسوسہ اندازی کرے۔[2]

بقول علامہ سلیمان ندوی کے تبلیغ و دعوت کے یہ تین اصول اللہ تعالیٰ نے آیت مبارکہ میں مسلمانوں کو سکھائے ہیں اول علم و حکمت موعظت حسنہ اور مناظرہ بطریق احسن تبلیغ و دعوت کے یہ تین اصول بنیادی ہیں جو منطقی استدلال میں عموماً کام میں لائے جاتے ہیں یعنی ایک تو برہانیات جس میں یقینی مقدمات کے ذریعے سے دعویٰ کے ثبوت پر دلیلیں لائی جاتی ہیں دوسرے خطابیات جن میں موثر اور دل پر ہر اقوال سے مقصود ثابت کیا جاتا ہے اور تیسرے کو جدال سے تعبیر کیا اور استدلال کے یہی تین طریقے ہیں جن سے ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے مدعا کو ثابت کرتا ہے اور دعوت و تبلیغ کے یہی تین طریقے ہیں۔[3]

اقلیم دل کو فتح کرنے کا موثر اسلوب نبوی ﷺ:

انسان کی فطرت کو خود اس کے فاطر سے بہترین کون جان سکتا ہے اس نے اپنے حکیمانہ کلام میں جگہ جگہ اس مضمون کو نہایت بلیغ انداز سے سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اپنے رسول ﷺ کو بتایا کہ اقلیم دل کو فتح کرنیکا صحیح اور موثر طریقہ کون سا ہے۔

﴿ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴾[4]

---

(۱) سورۃ بنی اسرائیل ۱۷/ ۵۳

(۲) تدبر قرآن، ۴/ ۵۱۱

(۳) سیرت النبی ﷺ، سید سلیمان ندوی، ۴/ ۲۵۳

(۴) سورۃ الصافات: ۴۱/ ۳۴

ترجمہ: تم برائی کو اس چیز سے دور کرو جو زیادہ بہتر ہے تو تم دیکھو گے کہ وہی جس کے اور تمہارے درمیان عداوت ہے گویا وہ ایک سرگرم دوست بن گیا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں کہ یہ نبی ﷺ کو اس رویے کی تعلیم دی گئی ہے کہ جو مخالفین کی بد تمیزیوں کے مقابل آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے صحابہ کو اختیار کرنا تھا فرمایا کہ اچھا اور برا رویہ یکساں نہیں ہوتا آخرت کے انجام اور مقصد دعوت کے اعتبار سے دونوں کے اثرات و نتائج میں آسمان اور زمین کا فرق ہے اس وجہ سے لوگوں کی بد تمیزیوں کے جواب میں وہ رویہ اختیار کرو جو زیادہ بہتر ہے اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ تمہارے دشمنوں میں سے جن کے اندر کچھ صلاحیت ہے وہ تمہاری دعوت کی معقولیت اور تمہارے شریفانہ رویے سے متاثر ہو کر تمہارے سرگرم حامی بن جائیں گے۔

ٱدْفَعْ بِٱلَّتِي هِيَ أَحْسَنُ: لوگوں کی بد تمیزیوں کے جواب میں احسن طریقہ اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ کسی برائی کے جواب میں برابر کا طرز عمل اختیار کرنا آدمی کے لئے جائز ہے لیکن صبر اور عفو و درگزر کا رویہ زیادہ بہتر ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے کہ اس کے صالح بندے وہی رویہ اختیار کریں یہ ہدایت اسی سیاق و سباق میں متعدد جگہ قرآن میں دی گئی ہے۔

اگرچہ مخالفین کی بد تمیزیوں کا جواب دینے کا حق ہر ایک شخص کو حاصل ہے لیکن دعوت و اصلاح کے نقطہ نظر سے صبر اور عفو و درگزر کا طریقہ زیادہ بہتر ہے۔

یہ بات انسان کی فطرت کے پیش نظر ارشاد کی گئی ہے کہ جن کی فطرت مسخ نہیں ہو چکی ہوتی وہ جب دیکھتے ہیں کہ ایک شخص لوگوں کی خیر خواہی اور ہمدردی میں اتنا بے چین ہے کہ ان کی تمام گستاخیوں اور بد تمیزیوں کے باوجود اپنے کریمانہ رویے میں کوئی فرق نہیں آنے دیتا تو ان کے دلوں میں اگر اس کے خلاف کسی غلط فہمی کے باعث عداوت بھی ہو تو اس کے طرز عمل سے متاثر ہو کر ان کی یہ عداوت محبت سے بدل جاتی ہے اور وہ اسکے جان نثار ساتھیوں میں سے بن جاتے ہیں چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ نبی ﷺ کی دعوت میں سب سے زیادہ موثر عامل کی حیثیت آپ ﷺ کے اسی کردار کو حاصل ہے آپ ﷺ کے دشمنوں میں سے جن کے اندر شرافت کا جوہر موجود تھا وہ سب آپ ﷺ کے اسی کردار سے متاثر ہو کر آپ ﷺ کے وفادار اور اسلام کے جاں نثار بنے۔(۱)

---

(۱) تدبر قرآن، ۷/ ۱۸۳

تیسیر القرآن کے مفسر اس نقطہ نگاہ کو یوں بیان کرتے ہیں:

بدی کا جواب بدی سے دینے سے دعوت کو نقصان پہنچتا ہے اور بھلائی سے دینے سے دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں اس آیت میں دعوت الیٰ اللہ کا زریں اصول بیان کیا گیا ہے پہلے تو یہ بتایا گیا ہے کہ نیکی اور بدی کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے اوراس لئے بتایا گیا ہے کہ کفار مکہ دعوت اسلام کو کچلنے کے لئے بدترین ہتھکنڈوں پر اتر آئے تھے مسلمانوں کو یہ سمجھایا جارہا ہے کہ بدی کا انجام کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔

بدی بالآخر بدی کرنے والے کا ہی بٹھہ بٹھا دیتی ہے لہٰذا داعی الیٰ اللہ کو کبھی بدی کا جواب بدی سے نہیں دینا چاہیے بلکہ اسے برداشت کرنا چاہیے اور اس سے اگلا قدم یہ کہ اس کی بدی کا جواب بھلائی سے دیا جائے اس طرح دشمن خود شرمندہ ہو گا اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ میں نے کیا سلوک کیا تھا اور فریق مخالف کا میرے حق میں سلوک کیا ہے؟ وہ آپ ﷺ کے خلوص اور خیر خواہی راست بازی کا معتقد ہو جائے گا جبکہ آپ ﷺ کی مخالفت چھوڑ کر آپ ﷺ کے ساتھ آملے گا اور آپ ﷺ کا جگری دوست بن جائے گا اور دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ آپ ﷺ کی دعوت الیٰ اللہ کی منزل کھوٹی نہیں ہو گی بلکہ اس میں مزید پیش رفت ہو جائے گی اور اگر آپ ﷺ برائی کا جواب برائی سے دیں گے تو پھر ادھر سے مزید برائی اٹھے گی اس طرح ایک تو مخالفت پہلے سے بھی بڑھ جائے گی دوسرا تمہارا مقصد اصل فوت ہو جائے گا اور دعوت الیٰ اللہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔(۱)

استہزا کرنے والوں سے اعراض برتنا:

قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿ وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ وَإِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَى مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴾(۲)

ترجمہ: اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیات میں مین میکھ نکالتے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہو جاؤ یہاں تک کہ وہ کسی بات میں مصروف ہو جائیں اور اگر شیطان تمہیں بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ان ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو جو اللہ سے ڈرتے ہیں ان پر لوگوں کے حساب کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

الایۃ خوض کے معنی کسی چیز میں گھس جانے کے ہیں خاض السماء وہ پانی میں گھس گیا اسی سے خوض فی الحدیث کا محاورہ نکلا ہے جس کے معنی میں بات سے بات نکالنا، بال کی کھال اتارنا، کسی بات پر اعتراض کرنا، نکتہ چینی اور کٹ حجتی کے نت نئے

---

(۱) تیسیر القرآن، مولانا عبد الرحمن کیلانی، ۴/ ۱۱۵

(۲) سورۃ الانعام: ۶/ ۶۸

پہلو پیدا کرنے کی کوشش کرنا قرآن میں یہ لفظ بہت سے جگہوں پر استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اسی طرح کی سخن کے لئے استعمال ہوا ہے جس کا مقصد کسی بات کو سہنا دل لگی اور مذاق میں اڑا دینا ہو۔[1]

چنانچہ سورہ نساء میں فرمایا:

﴿ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ إِنَّكُمْ إِذًا مِّثْلُهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِينَ وَالْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا ﴾[2]

ترجمہ: اور وہ قرآن میں تمہیں ہدایت دے چکا ہے کہ جب تم سنو اللہ کی آیات کا کفر کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو تم ان کے پاس نہ بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں لگ جائیں (یہاں اس خوض کی وضاحت اللہ کی آیات کے کفر اور ان کا مذاق اڑانے سے کی گئی ہے۔

یہاں خطاب اگرچہ واحد کے صیغہ سے ہے جس کا غالب قرینہ ہی ہے کہ یہ خطاب حضور ﷺ سے ہے لیکن یہ خطاب حضور ﷺ کے واسطے سے تمام مسلمانوں سے ہے چنانچہ اشارتاً آگے والی آیت میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ (خدا سے ڈرنے والوں پر ان کافروں کی کفر و ایمان کی کوئی ذمہ داری نہیں) جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ خطاب بحیثیت مجموعی تمام مسلمانوں سے ہے مولانا امین احسن صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس میں ہدایت کے دو پہلو ہیں اور دونوں نہایت اہم ہیں ایک تو یہ کہ یہ رویہ اس حکمت دعوت کے خلاف ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تبلیغ کے لئے پسند فرمائی ہے جس وقت کسی گروہ پر کسی چیز کی مخالفت اس کی تضحیک اور اس کی تردید کا بخار ہو اور بخار کی شدت سے مریض کی کیفیت ہذیانی ہو رہی ہو عین اسی حالت میں اسکے سامنے اس چیز کو پیش کرنا گویا اس کے بخار اور ہذیان میں ہی اضافہ کرنا چاہتا ہو تو وہ آزاد ہے جو چاہے کرے لیکن کوئی مہربان طبیب جو مریض کی صحت کا خواہ ہے وہ کبھی ایسی غلطی نہیں کرے گا اسی رعایت احوال کے پیش نظر یہاں مسلمانوں کو ہدایت ہوتی ہے کہ جب تم دیکھو کہ یہ اسلام کے مخالفین قرآن کا مذاق اڑانے پر تلے ہوئے ہیں طنز کے ترکش سنبھالے ہوئے ہیں اور مخالفت کے لئے آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں تو اس وقت تم طرہ دے جاؤ اور کسی ایسے وقت کا انتظار کرو جب یہ بحرانی کیفیت ذرا دور ہو جائے تو اس وقت ان کو سکھانے اور سمجھانے کی کوشش کرو۔

دوسرا ہدایت کا پہلو یہ ہے کہ یہ اس غیرت حق کے منافی ہے جو اہل ایمان کے اندر ہوتی ہے یا ہونی چاہیے اگر کوئی شخص یا گروہ اعلانیہ خدا اور رسول ﷺ کے خلاف بکواس کرتا ہے تو اس سے لڑنا بھی داعی کے لئے غلط ہے اور خاموش رہنا بھی

---

(۱) تدبر قرآن، ۳/ ۷۷

(۲) سورہ النساء: ۴/ ۱۴۰

غلط ہے کیونکہ اس سے وہ محبت حق مجروح ہوتی ہے جو علامت ایمان ہے اور جس کا ضعف بالآخیر درجہ بدرجہ آدمی کو اس نفاق میں مبتلا کر دیتا ہے جس میں مبتلا ہو جانے کے بعد اللہ، رسول ﷺ، قرآن اور شریعت کی توہین و تذلیل اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور کانوں سے سنتا ہے لیکن اس کو ایسا سانپ سونگھ جاتا ہے کہ زبان کھولنے کی جرات نہیں کر سکتا۔

شریعت کا مذاق اڑانے والوں کے ساتھ بیٹھنا اور اس پر راضی رہنا نفاق ہے۔

مزید تاکید کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ ٱلشَّيۡطَٰنُ فَلَا تَقۡعُدۡ بَعۡدَ ٱلذِّكۡرَىٰ مَعَ ٱلۡقَوۡمِ ٱلظَّٰلِمِينَ﴾ (۱)

مطلب یہ کہ اگر کبھی شیطان اس بات سے غافل ہی کر دے تو یاد آ جانے کے بعد ایسے ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھو اس تاکید کی ضرورت اس لئے تھی کہ بسا اوقات آدمی کسی مجلس میں جا پہنچتا ہے اور وہاں بات بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ دین و شریعت کے استہزا تک پہنچ جاتی ہے ایسے وقت میں آدمی محسوس تو کرتا ہے کہ اب یہ جگہ بیٹھنے کی نہیں رہی لیکن خیال کرتا ہے کہ بھری مجلس سے اٹھ کر کس طرح چلا جائے یا اگر مناظر قسم کا ہوتا ہے تو یہ خیال کرتا ہے کہ اب میدان چھوڑ کر کس طرح وہاں سے ہٹ جائے حریف کیا کہے گا یہ دونوں ہی خیال آدمی کے لئے فتنہ ہیں اگر مجلس کا پاس و لحاظ مانع ہے تو یہ قلت غیریت کی دلیل ہے آدمی سوچے کہ اگر اس کے منہ پر اس کے ماں باپ کو گالی دی جائے تو کیا وہ اس کو خاموشی سے برداشت کر لے گا تو خدا اور اس کی شریعت کا حق تو ماں باپ بلکہ تمام دنیا جہان سے بڑا ہے اور اگر وہ بحث و مناظرے کے لئے وہاں جما رہے گا تو گویا اس کی نیت احقاق حق اور ابطال باطل ہی کی ہے لیکن جب ان لوگوں کے ذہن خراب ہو چکے ہیں جن کو بات سُنانی ہے اور جن کو بات سنانا مزید اشتعال دلانے کے مترادف ہے تو داعی کا ایسے لوگوں سے لڑنا محض مونچھ کی لڑائی بن کر رہ جائے گا مقصد حق کو اس سے نہ صرف یہ کہ کوئی تقویت نہیں پہنچے گی بلکہ الٹا اس سے شدید قسم کا نقصان ہوگا اس وجہ سے صحیح رویہ ہی ہے کہ داعی شیطان کا چکمہ سمجھے اور ایسی مجلس سے کان جھاڑ کر اٹھ جائے۔ (۲)

داعیان کرام کو چاہیے اگر کبھی شیطان کسی چکر میں ڈال کر ایسی صورت حال سے دوچار کر ہی گے اور ایسے ظالموں سے بھڑا ہی دے تو تمہیں یہی رویہ اختیار کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے اس سے یہ بات آپ ہی آپ نکلی کہ اول تو آدمی برابر چوکنا رہے کہ شیطان اس کو فتنے میں نہ ڈال پائے اور اگر ایسا ہو جائے تو وہاں سے سلام کر کے وہاں سے چل دے اس لئے جو لوگ اللہ کی آیات کا مذاق اڑائیں وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔

---

(۱) سورۃ الانعام: ۶۸/۴

(۲) تدبر قرآن، ۳/۷۶-۷۸

دعوت و تبلیغ میں معاوضہ کا طلبگار نہ ہونا:

داعی اپنے مقدس فرض میں کسی سے مادی معنوی یا روحانی بدلے یا شکریہ کا طلبگار نہیں ہوتا کیونکہ معاوضے کا مطالبہ اخلاص کی پاکیزگی کو ختم کر دیتا ہے اور یوں ہی اخلاص اور سچائی میں گدلا پن پیدا ہوتا ہے بات کی تاثیر کو زنگ لگ جاتا ہے دعوت حق تو مسلمانوں کے خون میں شامل ہے اور جو خون میں شامل ہے اس کا معاوضہ طلب کرنا ہی سراسر جاہلیت ہے۔

قرآن میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

﴿ قُلْ مَا سَأَلْتُكُم مِّنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴾[۱]

ترجمہ: کہو میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو تمہارے لئے ہی مانگا ہے میرا اجر تو بس اللہ پر ہے اور وہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔

مولانا امین احسن فرماتے ہیں یہ مضمون قرآن میں دو اسلوب سے آیا ہے اور دونوں کا مفاد ایک ہی ہے ایک اسلوب تو یہ ہے کہ میں نے اپنی خدمت پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگا ہے اور تم مجھ سے بدک رہے ہو میرا اجر تو بس میرے ہی رب کے ذمہ ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر میں نے تم سے کوئی بات چاہی ہے جس کو تم اجر سمجھتے ہو اور بار محسوس کرتے ہو تو وہ اپنے لئے نہیں بلکہ تمہاری ہی دنیا اور آخرت کے لئے بہبود چاہی ہے۔

پہلے اسلوب کی وضاحت سورہ فرقان میں آیت نمبر ۵۷ میں یوں کی گئی ہے۔

یعنی ان کو صاف صاف سنا دو کہ میں اس دعوت کا کوئی صلہ تو تم سے نہیں مانگ رہا کہ تمہارے ردو قبول کا مجھ پر کوئی اثر پڑے میں نے تمہارے رب کا پیغام تمہیں پہنچا دیا اور مدعا صرف یہ ہے کہ جو اپنے رب کی راہ اختیار کرنا چاہے وہ اس کو اختیار کرے اور اس کو اختیار کرنے میں نفع بھی تمہارا ہے اور نقصان بھی تمہارا ہے اس سے مجھے کوئی نقصان نہیں۔[۲]

اگرچہ اس آیت کی تاویل پہلے اسلوب کے مفہوم میں بھی ہو سکتی ہے اور وہ بھی عربیت کے خلاف نہیں ہو گی لیکن اس کا یہ مطلب بھی بالکل واضح ہے کہ میں نے اپنی اس خدمت پر تم سے اپنے لئے کچھ نہیں چاہا اگر کچھ چاہا ہے تو تمہارے لئے کہ تم میں سے جو خدا کی راہ کا طالب ہے اس کو صراط مستقیم دکھاؤں۔ پر اجر کا مطالبہ نہیں کرتا میرا اجر میرے رب کے ذمہ ہے لیکن اگر تم میرے کسی مطالبے کو اپنے اوپر بار جانو اور اس کو میرا اجر تصور کرتے ہو تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے میں جو تمہیں خدا اور آخرت سے ڈراتا ہوں نیکی کی تلقین کرتا ہوں انفاق فی سبیل اللہ پر ابھارتا ہوں تو ان میں سے کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے

---

(۱) سورۃ سبا: ۳۴/ ۴۷

(۲) تدبر قرآن، ۵/ ۴۷۹

جس میں میرا کوئی ذاتی مفاد ہو بلکہ ان کا فائدہ انفرادی اوراجتماعی دونوں پہلوؤں سے تمہی کو حاصل ہو گا تمہاری دنیااور آخرت سنور جائے گی۔

یہ بات قرآن مجید میں جہاں جہاں فرمائی گئی ہے مخاطبوں کو ملامت اور ان سے اظہار بے نیازی کے سیاق وسباق میں فرمائی گئی ہے مطلب یہ کہ ان ناقدروں سے کہہ دو کہ میں نے اپنی دعوت پر کوئی ٹکٹ یا چندہ تو نہیں لگار کھا ہے کہ وہ تمہارے لئے میرے پاس آنے اور میری بات سننے میں مانع ہو رہا ہے تم ہر وقت میرے پاس آسکتے ہو اور بے جھجھک آسکتے ہو میری مجلس میں کسی پر کوئی قدغن نہیں تمہارے امیر غریب سب کے لئے میرا دروازہ کھلا ہوا اور میرا سینہ کشادہ ہے اور اگر تم نہیں آتے تو تم اپنا ہی کچھ بگاڑو گے میں نے کوئی دکان نہیں کھولی کہ تمہاری بے التفاتی سے میری دکان بیٹھ جائے گی میں نے تو اپنے رب سے مفت پایا اور مفت بانٹ رہا ہوں۔

میرا اجر میرے رب کے ذمہ ہے وہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے مجھے یہ اندیشہ نہیں کہ میری کوئی حقیر سے حقیر خدمت پوشیدہ رہے گی وہ میری سرگرمیاں اور تمہاری ناقدریاں دونوں دیکھ رہا ہے میں بھروسہ رکھتا ہوں کہ وہ مجھے میری خدمات کا بھرپور صلہ دے گا۔(۱)

مولانا امین احسن آیت مبارکہ کی تفسیر میں بہت خوبصورت انداز میں معاوضہ طلبگار نہ ہونے کے اسلوب کو بیان کرتے ہیں کہ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دعوت دینے والا اپنا کوئی ذاتی مفاد رکھتا ہے جس کی وجہ سے انہیں دین کی طرف بلا رہا ہے اس وجہ سے وہ اس سے دور بھاگتے ہیں۔ مولانا صاحب نے یہاں میں نے کوئی اپنی دعوت پر چندہ یا ٹکٹ لگار کھا ہے اور یہ کہ تمہاری بے التفاتی سے میری دکان بیٹھ جائے جیسے عام فہم جملے استعمال کرکے قاری حضرات کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ دعوت دینے والے کا اپنا کوئی مفاد نہیں ہوتا وہ دوسروں کو راہ ہدایت دکھانا چاہتا ہے تاکہ ان کی اصلاح ہو سکے ورنہ یہ نہ تو کوئی دکان داری ہے اور نہ کوئی کاروبار۔

دعوت کا اسلوب انداز و تبشیر:

دعوت و تبلیغ میں انذار کا اسلوب بھی بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ انسانی نفسیات کی یہ خوبی ہے کہ جب تک وہ کسی کام کے انجام بد سے آگاہ نہیں ہوتا اس وقت تک وہ خوف محسوس نہیں کرتا قرآن پاک میں حضور نبی اکرم ﷺ کو نذیر اور بشیر کے القابات سے پکارا گیا ہے۔

---

(۱) تدبر قرآن،۶/ ۳۳۸-۳۳۹

﴿وَمَآ أَرۡسَلۡنَٰكَ إِلَّا كَآفَّةٗ لِّلنَّاسِ بَشِيرٗا وَنَذِيرٗا وَلَٰكِنَّ أَكۡثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَعۡلَمُونَ﴾[1]

ترجمہ: اور ہم نے تو تم کو سب لوگوں کے واسطے بس بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جان رہے ہیں۔

ان آیات مبارکہ میں اظہار افسوس ہے ان لوگوں کی حالت پر جو قرآن کو دعوت توحید اوراسکے انذار وعذاب اور قیامت کی تکذیب کے لئے عذاب کا مطالبہ کرتے تھے تاکہ اس طرح حضور ﷺ کو زچ کر سکیں فرمایا کہ ہم نے تمہیں عذاب لانے والا نہیں بلکہ لوگوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے کہ تم ان لوگوں کو نجات اور رحمت کی بشارت دے دو جو تمہاری دعوت پر ایمان لا کر ایمان و عمل صالح زندگی اختیار کر لیں گے اور ان لوگوں کو خدا کے اس قہر و غضب سے آگاہ کر دو جس سے تمہاری تکذیب کی صورت میں ان لازماً سابقہ پیش آئے گا تمہاری ذمہ داری اس انداز و بشارت کے بعد ختم ہو جاتی ہے عذاب کا معاملہ اللہ سے متعلق ہے۔[2]

سورہ مدثر میں اس کو یوں بیان کیا گیا۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلۡمُدَّثِّرُ ۝ قُمۡ فَأَنذِرۡ﴾[3]

ترجمہ: اے چادر لپیٹے رکھنے والے! اٹھ اور لوگوں کو ڈرا۔ اور اپنے رب کی کبریائی کی منادی کر۔

آیت مبارکہ کی تفسیر میں مولانا امین احسن فرماتے ہیں کہ مدثر اور مزمل ہم معنی الفاظ ہیں مدثر "دثار" سے ہے جو اس چادر کے لئے آتا ہے جو سونے والا اپنے اوپر لیا کرتا ہے چادر لپیٹے رکھنا آدمی کی فکر مندی کی علامت ہے حضور ﷺ کو ابتدائے بعثت میں مشاہدات و تجربات ہوئے اول تو وہ خود ہی بار گراں کرنے والے تھے پھر جب آپ ﷺ ان کا اظہار اپنے خاندان والوں کے سامنے کیا تو انہوں نے ان کا مذاق اڑانا شروع کر دیا ایسی حالت میں آپ ﷺ چادر لپیٹے الگ تھلگ رہتے تھے آپ ﷺ کی اس پریشانی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے نہایت پیار سے آپ ﷺ کو مدثر اور مزمل کے خطاب سے پکارا۔

---

(۱)سورۃ سبا:۳۴/۲۸

(۲)تدبر قرآن،۶/۳۲۲

(۳)سورۃ مدثر: ۷۴/۲،۱

"﴿ قُمْ فَأَنذِرْ ﴾" یہ اس مہم کا بیان ہے کہ تم پر آگے ایک بھاری ذمہ داری ڈالی جارہی ہے یعنی کمر بستہ ہو کر اٹھو اور پورے عزم و حوصلے سے اپنی قوم کو آگاہ کرو نامساعد حالات اور اجنبیت کی پرواہ نہ کرو جب تم ہمت کر کے کھڑے ہو جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری راہ آسان کر دے گا اور غیب سے تمہاری تائید کے اسباب فراہم کریں گے۔(۱)

سورہ بقرہ میں انذار کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَأَنذَرۡتَهُمۡ أَمۡ لَمۡ تُنذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُونَ ﴾(۲)

ترجمہ: جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لئے یکساں ہے ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب فرماتے ہیں:

ءَأَنذَرۡتَهُمۡ: انذار کے معنی ڈرانے ہوشیار کرنے اور خبر دار کرانے کے ہیں انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ ایک طرف تو نہایت ٹھوس دلائل پر مبنی ہے دوسری طرف اس میں انذاز و تبشیر کا پہلو بھی ہوتا ہے تبشیر کا مفہوم اس فوز و فلاح کی کامیابی کی بشارت دینا ہے جو نبی کی دعوت کو قبول کر لینے اور اس کی بتائی ہوئی صراط مستقیم اختیار کر لینے سے دنیا و آخرت دونوں میں حاصل ہوتی ہے انذار کا مفہوم ان خطرات سے آگاہ ہے جن سے نبی کی تکذیب کرنے والوں کو دنیا اور آخرت میں لازماً دوچار ہونا پڑتا ہے انبیاء علیہم السلام عام حالات میں یہ دونوں فرض انجام دیتے ہیں جہاں ضدی اور ہٹ دھرم لوگ مقابل میں آ کھڑے ہوتے ہیں جن کی مخالفت کسی غلط فہمی کی بناء پر نہیں حسد و عناد کی بنا پر ہوتی ہے وہاں قدرتی طور پر نبی ﷺ کی دعوت میں انذاز کا پہلو غالب ہو جاتا ہے۔

انذار ہو یا تبشیر کی حقیقت ان قدرتی نتائج سے آگاہ کرنا ہے جو ایمان یا کفر کے اندر مضمر ہیں جس طرح ایک طبیب اپنے زیر علاج مریض کو دوا اور پرہیز کے فوائد اور بدپرہیزی اور مرض سے غفلت کے نتائج سے آگاہ کرتا ہے اسی طرح پیغمبر بھی اپنی قوم کو اپنی دعوت کے ماننے اور نہ ماننے کے فوائد اور نتائج سے آگاہ کرتا ہے۔

بعض لوگ انذار کی اس حقیقت سے بے خبر ہونے کے سبب سے مذہب کے خلاف یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ یہ خطرات کے ڈراوے سنا سنا کر لوگوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے انسان کی عقل سے اپیل نہیں کرتا یہ معترض عموماً دو باتوں سے بے خبر ہیں ایک تو یہ اس بات سے بے خبر ہیں قرآن کی دعوت صرف انذاز و تبشیر پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اندر مضبوط عقلی دلائل بھی رکھتی ہے انذار و تبشیر اس کی دعوت کا صرف ایک پہلو ہے دوسری چیز جس سے یہ بے خبر ہیں وہ ایمانی و اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت ہے یہ لوگ اس بات سے تو واقف ہیں کہ سنکھیا کھا لینے سے آدمی مر جاتا ہے لیکن یہ حقیقت اس کی

(۱) تدبر قرآن، ۹/۴۳

(۲) سورۃ البقرہ: ۲/۶

سمجھ سے بالاتر ہے کہ کفر نفاق اور جھوٹ سے بھی انسان ہلاک ہو جاتا ہے پیغمبر کو چونکہ اخلاقی اقدار کے ثمرات و نتائج کا اچھی طرح علم ہوتا ہے اس وجہ سے وہ لوگوں کو ان سے آگاہ کرتا ہے اور اسی انداز بیاں میں آگاہ کرتا ہے جو انداز بیاں اس کے علم و یقین کے شایان شان ہوتا ہے اسی چیز کو قرآن مجید انذار کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔(۱)

موثر ابلاغ کا اسلوب :

نبی کریم ﷺ اللہ کا آخری پیغام دینے دنیا میں آئے تو آپ ﷺ کو یہ حکم ملا کہ آپ ﷺ کا کام صرف پہنچا دینا ہے تبلیغ پیغام حق کو دوسروں تک پہنچانا ہے ہر نبی کے فرائض میں پہلا فرض ہی فریضہ تبلیغ کو لوگوں تک پہنچانا تھا تاکہ قیامت کے دن کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ مجھ تک حق پہنچانے والا کوئی نہیں آیا۔

آپ ﷺ نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ وہ فریضہ تبلیغ ادا کریں حضور ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا لہٰذا اب یہ فرض اولین امت محمدیہ ﷺ کا ہے۔

قرآن پاک اس

﴿مَّا عَلَى ٱلرَّسُولِ إِلَّا ٱلْبَلَٰغُ ۗ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ﴾(۲)

ترجمہ: رسول پر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔

شیخ امین احسن صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ رسول پر ذمہ داری صرف واضح طور پر ہماری ہدایات کو پہنچا دینے کی ہے یہ فرض رسول نے ادا کر دیا اب آگے تمہاری ذمہ داری ہے مانو یا نہ مانو۔ مانو گے تو تمہاری ہی بھلائی ہے نہ مانو گے تو اس کا انجام دیکھو گے کیوں کہ جو تم ظاہر کرتے ہو خدا اس کو بھی جانتا ہے اور جو تم چھپاتے ہو اس سے بھی باخبر ہے۔(۳)

سورہ مائدہ میں آگے چل کر مومنین سے خطاب میں بھی اس اسلوب کو یوں واضح کیا گیا۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا ٱهْتَدَيْتُمْ ۚ إِلَى ٱللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾(۴)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اپنی فکر رکھو اگر تم ہدایت پر ہو تو جو گمراہ ہیں وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑے گا اللہ ہی کی طرف سب کو پلٹنا ہے وہ تمہیں بتائے گا جو تم کرتے رہے ہو۔

---

(۱) تدبر قرآن، ۱/ ۱۰۹

(۲) سورۃ المائدہ: ۵/ ۹۹

(۳) تدبر قرآن، ۲/ ۵۹۹

(۴) سورۃ المائدہ: ۵/ ۱۰۵

اس آیت مبارکہ میں مومنین کو تسلی دی گئی ہے کہ جو لوگ اپنی عقل بیچ کر باپ دادا کی اندھی تقلید پر اڑ گئے ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو تم نے کلمہ حق پہنچا دیا اگر وہ نہیں مانتے تو اپنا بگاڑیں گے تمہارا کچھ نہیں بگاڑیں گے جو گمراہی کی راہ اختیار کرتا ہے وہ اپنی ہر زہ گری کا انجام دیکھتا ہے اس سے صحیح راہ بتانے والے کو کوئی نقصان نہیں ہوتا تم ان کو سنبھالنے کی کوشش کر دی اگر وہ نہیں سنبھلتے تو تم اپنی فکر کرو ان کے غم میں پریشان نہ ہو۔(۱)

ان آیات مبارکہ کے ترجمے و تفسیر سے یہ بات روز وروشن کی طرح عیاں ہے کہ داعیان کرام کا کام اللہ کے پیغام کو پھیلانا اور پہنچانا ہے ان کا کام نہ تو کسی کو زبردستی طاقت کے بل پر مسلمان بنانا ہے اور نہ ہی یہ کہ وہ یہ سوچ کر بیٹھ جائیں کہ میری دعوت و تبلیغ کسی پر کیا اثر کرے گی اور اس سے کوئی ہدایت پائے گا بھی یا نہیں مسلمان کا کام صرف صحیح راہ دکھانا اور حق پہنچانا ہے آگے خالق وجہاں کی مرضی وہ جسے چاہے سنوار دے جسے چاہے گمراہ کر دے۔

دعوت و تبلیغ میں جبر و کراہ کی ممانعت:

اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے سکون کا پیغام ہے دنیا کا ہر مذہب یہ چاہتا ہے کہ دوسرے مذاہب ختم ہو جائیں اوران سب کی جگہ ان کا مذہب لے لے اور ہر مذہب میں جبر و زبردستی داخل کرنا جائز ہے لیکن اسلام اور داعی اعظم حضور ﷺ کا دامن ان دونوں چیزوں سے پاک ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿لَآ إِكۡرَاهَ فِي ٱلدِّينِۖ قَد تَّبَيَّنَ ٱلرُّشۡدُ مِنَ ٱلۡغَيِّۚ﴾(۲)

ترجمہ: دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہدایت گمراہی سے بلکل الگ ہو چکی ہے۔

مولانا امین احسن صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ہدایت اور ضلالت کے معاملے میں اللہ کے رسول کی ذمہ داری صرف حق کو پہنچانا ہے اور جب یہ کام ہو چکا تو رسول ﷺ کی ذمہ داری پوری ہو چکی اب ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جن پر حجت تمام ہو چکی وہ چاہیں تو ایمان لائیں اور چاہیں تو کفر کی روش پر اڑے رہے اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں جبر فطری کی راہ اختیار نہیں فرمائی بلکہ لوگوں کو اختیار و انتخاب کی آزادی بخشی ہے اگر وہ چاہتا تو ساری دنیا کو نیکی ہی کی ڈگر پر ہانک دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہدایت اور ضلالت کے معاملے میں اس نے لوگوں کو آزادی دی ہے جو ایمان لائیں گے وہ صلہ پائیں گے جو کفر کی راہ اختیار کریں گے وہ اس کی سزا بھگتیں گے اس آیت کا مقصد جبر فطری کی نفی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ہدایت و ضلالت کے معاملے میں یہ طریقہ اختیار نہیں فرمایا کہ وہ اپنی حیثیت قدرت کے زور سے لوگوں کو ہدایت پر چلا دے یا گمراہی کی طرف ہانک دے اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو کوئی اس کے ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا لیکن یہ بات اس کی حکمت اور اس کے عدل کے خلاف

---

(۱) تدبر قرآن ۲/ ۲۰۲-۲۰۳

(۲) سورۃ البقرہ: ۲/ ۲۵۶

ہوتی اس نے اس کے برعکس یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے لوگوں کے سامنے حق اور باطل دونوں کو اچھی طرح واضح کر دیتا ہے پھر جو حق راہ اختیار کرنا چاہتا ہے ان کو راہ حق اختیار کرنے کی توفیق عطا کرتا ہے اور جو لوگ باطل کی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں ان کو اس کے لئے ڈھیل دے دیتا ہے۔

آگے چل کر مولانا امین احسن صاحب مزید فرماتے ہیں کہ آیت مبارکہ جبر فطری کی نفی کرتی ہے اس سے بعض لوگ یہ دلیل لیتے ہیں کہ چونکہ اسلام میں کراہ نہیں اس وجہ سے جو مختلف سزائیں ہیں وہ مولویوں کی من گھڑت ہیں یہ بات صریحاً غلط ہے اسلام جبر قانونی کی نفی نہیں کرتا اور نہ اسلام کی شریعت حدود و تعزیرات سے خالی شریعت ہے اسلام میں حدود و تعزیرات کا پورا نظام ہے جس کا نفاذ واجبات دین میں سے ہے اگر کوئی مسلمان اسلام کے خلاف روش اختیار کرے تو اسکے لئے اسلامی قانون میں سزا ہے اور یہ چیز **لا اکراہ فی الدین** کے منافی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے لیکن ساتھ ہی وہ اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ ایک شخص اسلام کے دائرے میں داخل ہو جانے کے بعد بھی جو اسکے جی میں آئے کرتا پھرے اور پھر اس پر گرفت بھی نہ ہو بلکہ وہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ اسلام کی حدود و قیود کی پابندی کا خیال رکھیں۔[۱]

آج جو دہشت گردی اور تشدد اہل اسلام سے منسوب کیا جارہا ہے اگرچہ اس کی اصلیت کچھ بھی نہیں تاہم داعی اور مبلغ کا کام صرف دعوت و تبلیغ ہے کسی کو بالجبر و اکراہ اپنا ہم خیال بنانا نہیں ممکن ہے کچھ کم علم لوگ دینی جوش میں حد سے بڑھ جاتے ہیں لہٰذا اس سے احتراز از بس لازم ہے۔ چنانچہ یہ غلط ہے کہ اسلام محض تلوار و جبر سے پھیلا ہے یہ امر واقعہ ہے کہ اشاعت اسلام کیلئے کبھی تلوار نہیں اٹھائی گئی اگر کوئی مذہب تلوار یا جبر سے پھیل سکتا تو آج ہی کسی مذہب کو کوئی پھیلا کر دکھلا دے۔[۲]

دعوت و تبلیغ میں تیسیر کا اسلوب:

ہر چیز کے آسان اور مشکل دو پہلو ہوا کرتے ہیں بہتر تفہیم کا اصول یہ ہے کہ مبتدی کے سامنے وہ پہلو پیش کئے جائیں جس میں آسانی اور سہولت ہو تاکہ وہ اس سے مانوس ہو کر آسان سمجھ کر اس کے قریب آجائے حضور ﷺ اپنی دعوت میں آسانی کو ملحوظ رکھتے تھے سختی و درشتی کے قریب نہ جاتے کہ احکام و مسائل میں تنگی پیدا نہ ہونے پائے۔

قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے۔

---

(۱) تدبر قرآن ۱/ ۵۹۴

(۲) محمد ﷺ کے غیر مسلم مداح اور ثناخواں، عنصر صابری، دارالتذکیر لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۴۴

﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَٱلْأَغْلَٰلَ ٱلَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾[1]

ترجمہ: اور ان پر سے وہ بوجھ اور پابندیاں اتارتا ہے جو ان پر اب تک رہی ہیں۔

آیت مبارکہ کی تفسیر میں مولانا احسن فرماتے ہیں کہ یہود نے اپنے اوپر بہت سی بے ساختہ پابندیاں بھی لاد رکھی تھیں اور بعض پابندیاں ان کی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر عائد کر رکھی تھیں ان ساری چیزوں کے دور ہونے کا انحصار آخری رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی بعثت پر تھا چنانچہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی بعثت نے ان کی یہ ساری زنجیریں کاٹ دی لیکن انہوں نے اپنی شامت اعمال کے سبب اس نعمت کی قدر نہ کی۔

داعی کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ مشکل نہیں بلکہ آسانی پیدا کرے لوگوں کے لئے دین کو اپنانا اور اس پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ سورہ البقرہ میں فرماتے ہیں:

﴿يُرِيدُ ٱللَّهُ بِكُمُ ٱلْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ ٱلْعُسْرَ﴾[2]

ترجمہ: اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا۔

ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات ایسے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی پیدا کرنا چاہتا ہے وہ تمہیں کسی تنگی میں نہیں ڈالنا چاہتا۔

﴿وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرَىٰ ٥ فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ ٱلذِّكْرَىٰ﴾[3]

ترجمہ: اور ہم تمہیں لے چلیں گے آسان راہ پس تم یاد دہانی کرواد اگر یاد دہانی کچھ نفع دے۔

ان آیات میں حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو بشارت دی گئی ہے کہ یہ دن ہمیشہ نہیں رہیں گے بلکہ ہم ان مشکلات سے نکال کر جلد تمہیں آسان راہ پر لے چلیں گے۔ لفظ یسرٰی صفت ہے اس آیت سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اس وقت تم جن مشکلات میں ہو یہ تمہاری تربیت کے لئے ہیں تاکہ اللہ تمہیں اپنے ان افضال وعنایات کا اہل اور حق دار بنائے جس سے تمہیں مستقبل میں وہ بہرہ مند فرمانے والا ہے اس راہ میں جو عقبات حائل ہیں وہ سنت الٰہی کے تحت بغرض امتحان و تربیت ہیں آگے راہ صاف ہے اپنے رب پر بھروسہ رکھ لوگوں کی مخالفتوں اور ناقدروں سے بد دل اور مایوس نہ ہو لوگوں کے دلوں میں اترنے کی ذمہ داری تمہاری نہیں تمہارا فرض صرف تذکیر ہے جو سننے کی طرف مائل ہے اسے سناؤ ورنہ ان کو تقدیر کے حوالے کر دو۔[4]

---

(۱) سورۃ الاعراف: ۷/ ۱۵۷

(۲) سورۃ البقرہ: ۲/ ۱۸۵

(۳) سورۃ اعلیٰ: ۸۷/ ۹

(۴) تدبر قرآن، ۹/ ۳۱۸

تفہیم القرآن میں آیت مبارکہ کی تفسیر:

عام طور پر مفسرین نے ان دو فقروں کو الگ الگ سمجھا ہے پہلے فقرے کا مطلب انہوں نے یہ لیا ہے کہ ہم تمہیں ایک آسان شریعت دے رہے ہیں جس پر عمل کرنا سہل ہے اور دوسرے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ نصیحت کرو اگر وہ نافع ہو لیکن مودودی صاحب کے نزدیک تذکیر کا لفظ دونوں فقروں کو باہم مربوط کرتا ہے چنانچہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اے نبی ﷺ ہم تبلیغ دین کے معاملے میں تم کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتے کہ تم بہروں کو سناؤ اور اندھوں کو راہ دکھاؤ بلکہ ایک آسان طریقہ تمہارے لئے میسر ہے کہ نصیحت کرو جہاں تمہیں محسوس ہو کہ کوئی اس کا فائدہ اٹھانے کے لئے تیار ہے اور اس کا پتا صرف تبلیغ عام ہی سے ہو سکتا ہے اس لئے عام تبلیغ جاری رکھنی چاہیے۔[1]

سورہ الحج میں ہے:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾[2]

ترجمہ: دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔

اس دین میں تمہارے اوپر اس طرح کی قیدیں اور پابندیاں نہیں ہیں جیسی کہ یہود کے دین میں تھیں اللہ نے اپنے فضل سے اس دین فطرت کو اس قسم کی پابندیوں سے محفوظ رکھا ہے مطلب یہ کہ ہر چند یہ بارِ عظیم ہے لیکن ایسا نہیں کہ تم اس کو اٹھا نہ سکو۔[3]

آج ہمارا دور کسی بھی دوسرے دور سے زیادہ اس بات کا محتاج ہے کہ اس میں لوگوں کے لئے آسانیاں پیدا کی جائیں بجائے اس کے کہ ان پر سختی کی جائے ان کو امید دلائی جائے نہ کہ انہیں متنفر کیا جائے خاص طور پر ان لوگوں کے بارے میں جو نئے نئے مسلمان ہوئے ہوں یا انہوں نے ابھی توبہ کی ہو یہ سب کچھ حضور ﷺ کی سنت سے پوری طرح واضح ہے آپ ﷺ جب کسی نو مسلم کو اسلامی تعلیمات سکھاتے تو آپ ﷺ اس پر بیک وقت ساری چیزیں لازم نہیں کرتے تھے نہ انہیں حد سے زیادہ اوامر سے بار گراں کرتے تھے آپ ﷺ سے جب کوئی نو مسلم پوچھتا کہ اسلام کے اس سے کیا مطالبات ہیں آپ ﷺ اسی پر اکتفا کرتے تھے کہ اسے بنیادی فرائض کا حکم دیا جائے آپ ﷺ اس کو نفل کے سمندر میں نہیں ڈبوتے تھے۔[4]

دین حق آسانیوں کا دین ہے یہ اپنے داعی حضرات سے بھی یہی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کریں۔

---

(۱) تفہیم القرآن، ۶/ ۳۱۴

(۲) سورۃ الحج: ۲۲/ ۷۸

(۳) تدبر قرآن، ۵/ ۶۸۸

(۴) دین میں ترجیہات، علامہ یوسف قرضادی، منشورات، لاہور ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۳-۲۴

حق نصیحت آخری دم تک:

امت محمدیہ ﷺ کا فرض اولین دعوت و تبلیغ ہے حضور ﷺ رحمۃ المسلمین نہیں بلکہ رحمۃ اللعالمین ہیں آپ ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد اب یہ فرض امت محمدیہ ﷺ کا ہے کہ وہ دعوت و تبلیغ کا کام آخری سانس تک جاری رکھے حضرت انبیاء کرام نے آخری دم تک اس کار عظیم کو جاری رکھا حضرت نوحؑ نے موت کی مصیبت کے باوجود بیٹے کو کلمہ "لاالہ الا اللہ" اور "سبحان اللہ وبحمدہ" کا حکم دیا حضور ﷺ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ نے بھی بستر مرگ پر بھی دعوت و تبلیغ سے صرف نظر نہیں کیا۔

حق نصیحت آخری دم تک کو قرآن یوں بیان کرتا ہے:

﴿ وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ٱللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ قَالُوا۟ مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴾[۱]

ترجمہ: اور یاد کرو کہ جب ان سے ایک گروہ نے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کیے جارہے ہو جنہیں یا تو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا اُنہیں ایک سخت عذاب دینے والا ہے۔ وہ بولے یہ اس لیے کہ رب کے سامنے ہماری طرف سے عذر بن سکے تاکہ یہ خدا کے عذاب سے بچیں۔

مولانا امین احسن فرماتے ہیں کہ " وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ " سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس بستی کے لوگوں نے شقاوت کی یہ راہ سمجھانے بجھانے والوں کے بھی علی الرغم اختیار کی یہ نہیں تھا کہ ان کو آگاہ کرنے والا نہیں آیا تھا اللہ کے ایسے بندے وہاں تھے جنہوں نے ان کو نہ صرف اس جرم سے روکنے کی کوشش کی بلکہ اس حد تک کوشش کی کہ ان کے اپنے ساتھیوں میں سے ایک جماعت نے اب مزید سمجھانے کو بلکل غیر مفید سمجھا اور کہا کہ ایسے لوگوں کو سمجھانے سے کیا حاصل جو اب تو ہلاک ہونے والے ہیں یا کم از کم شدید عذاب کی پکڑ میں آنے والے ہیں لیکن اللہ کے ان بندوں نے اس نقطہ نظر کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ان کو یہ جواب دیا کہ ہمارا سمجھانے کا کام جاری رہے گا اگر یہ لوگ نہ مانے تو ہم اللہ کے ہاں فرض سے سبکدوش ٹھہریں گے اور کیا عجب کہ یہ مان جائیں سو اگر یہ مان گئے تو یہی مطلوب ہے۔

اگرچہ ایک شخص بھی نصیحت کی قدر کرے والا نصیحت ماننے والا نہ نکلے عند اللہ ایسے ہی لوگ اپنے فرض سے سبکدوش قرار پائیں گے وہ لوگ اللہ کے ہاں بری نہیں ہونگے جو خود اگرچہ برائی میں مبتلا نہ ہوں لیکن دوسروں کے خیر و شر سے بلکل بے تعلق ہو کر زندگی گزاریں۔[۲]

---

(۱) سورۃ الاعراف:۷/۱۶۴

(۲) تدبر قرآن، ۱/۳۸۰

مولانا امین احسن صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں انتہائی سادہ مگر جامع انداز اختیار کیا ہے اور داعیان کرام کو بتایا ہے کہ داعی اور ناصح پر دعوت دینے کا فرض آخری سانس تک لازم ہے

اس اقتباس میں مولانا نے لفظ کی لغوی تحقیق کر کے اس پر دلائل سے نتیجہ اخذ کیا ہے اور یہ ہر مفسر کا کام نہیں آیات مبارکہ کی تفسیر میں جو داعیانہ انداز بیان ملتا ہے اس کے لئے عقلی استدلال سے مثالوں سے بات کو واضح کیا گیا ہے صرف آیات نقل کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ افلا یتدبرون کے مصداق غور و فکر کی دعوت دے کر دین کی طرف راغب کرتے ہیں اور یہ بھی اس تفسیر کی نمایاں خصوصیت ہے اور انبیاء کے اسالیب دعوت کی بہترین ترجمانی بھی ہے۔

فصل دوم

حضور ﷺ کے اسالیب دعوت تفہیم القرآن کی روشنی میں

حضور ﷺ کے اسالیب دعوت تفہیم القرآن کی روشنی میں

تبلیغ دین انفرادی طور پر اپنے گھر سے شروع کریں:

حضور ﷺ نے دعوت دین کا کام اپنے گھر سے شروع کیا آپ ﷺ نے ہمیشہ دعوت دین کا آغاز اپنے گھر سے کیا یہی انبیاء کی سنت بھی ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو دعوت دین دی۔

قرآن پاک میں حضور ﷺ کے قریبی رشتہ داروں کو دعوت الی اللہ کا حکم اس طرح ہوا:

﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ ٱلْأَقْرَبِينَ﴾ (۱)

ترجمہ: اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔

مودودی صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خدا کے اس دین میں جس طرح نبی ﷺ کی ذات کے لئے کوئی رعائیت نہیں اسی طرح نبی ﷺ کے خاندان اور اس کے قریب ترین عزیزوں کے لئے بھی کسی رعائیت کی گنجائش نہیں ہے یہاں جس کے ساتھ بھی کوئی معاملہ ہے اس کے اوصاف کے لحاظ سے کسی کا نسب اور کسی کے ساتھ آدمی کا تعلق کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا گمراہی وبد عملی پر خدا کے عذاب کا خوف سب پر یکساں ہے ایسا نہیں ہے کہ اور سب تو ان چیزوں پر پکڑے جائیں مگر نبی کے رشتہ دار بچے رہ جائیں اس لئے حکم ہوا کہ اپنے قریبی ترین رشتہ داروں کو بھی صاف صاف متنبہ کر دو اگر وہ اپنا عقیدہ اور عمل درست نہ رکھیں تو یہ بات ان کے کسی کام نہ آئے گی کہ وہ نبی کے رشتہ دار ہیں۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی متفقہ روایت ہے:

((يَا عَبَّاسُ بْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ لَا أُغْنِي عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَيَا صَفِيَّةُ عَمَّةَ رَسُولِ اللَّهِ لَا أُغْنِي عَنْكِ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَيَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَلِينِي مَا شِئْتِ مِنْ مَالِي لَا أُغْنِي عَنْكِ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا))

ترجمہ: اے عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ میں اللہ تعالی کے مقابلے میں آپ کے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔ اے صفیہ رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی! میں اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں آپ کے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔ اے فاطمہ بنت محمد ﷺ میرے مال میں جو چاہے مجھ سے مانگ لو لیکن اللہ کے مقابلے میں تمہارے کسی کام نہ آسکوں گا۔ (۲)

---

(۱) سورہ الشعراء: ۲۶/ ۲۱۴

(۲) صحیح بخاری، کتاب التفسیر، حدیث نمبر ۵۰۱۲

حضور ﷺ نے صبح سویرے صفا کے سب سے اونچے مقام پر کھڑے ہو کر پکارا (یا صباماہ) اے صبح کا خطرہ اے قریش کے لوگو! اے بنی کعب بن لوئ! اے بنی مرہ! اے آل قصی! اے عبد مناف! اے بنی عبد الشمس! اے بنی ہاشم! اے آل عبد المطلب! اس طرح قریش کے ایک ایک قبیلے کے ایک ایک خاندان کا نام لے کر آپ ﷺ نے آواز دی۔

عرب میں قاعدہ تھا جب صبح تڑکے اچانک کسی حملے کا خطرہ ہوتا تو پہلے جس شخص کو بھی پتا چل جاتا وہ اسی طرح پکارنا شروع کر دیتا اور لوگ اس کی آواز سنتے ہی ہر طرف سے دوڑ پڑے چنانچہ حضور ﷺ کی اس آواز پر سب لوگ گھروں سے نکل آئے اور جو خود نہ آسکے اس نے اپنی طرف سے کسی کو خبر لانے کے لئے بھیج دیا جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا اے لوگو! اگر میں تمہیں بتاؤں کہ اس پہاڑ کے دوسری طرف ایک بھاری لشکر ہے جو تم پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے تو کیا تم میری بات کو سچ مانو گے سب نے کہا: ہاں ہمارے تجربے میں تم کبھی جھوٹ لولنے والے نہیں رہے ہو آپ ﷺ نے فرمایا اچھا تو میں خدا کا سخت عذاب آنے سے پہلے تم کو خبردار کرتا ہوں اپنی جانوں کو اس کی پکڑ سے بچانے کی فکر کرو میں خدا کے مقابلے میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا قیامت میں میرے رشتہ دار صرف متقی ہونگے ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ نیک اعمال لے آئیں اور تم لوگ دنیا کا وبال سر پر اٹھائے ہوئے آؤ اس وقت تم پکاروگے یا محمد ﷺ! مگر میں مجبور ہوں گا کہ تمہاری طرف سے منہ پھیر لوں البتہ دنیا میں میرا اور تمہارا خون کا رشتہ ہے اور یہاں میں تمہارے ساتھ ہر طرح کی صلہ رحمی کروں گا۔ [1]

یہ معاملہ صرف اس حد تک نہ تھا کہ قرآن میں "﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ ٱلْأَقْرَبِينَ﴾" کا حکم آیا اور حضور ﷺ نے اپنے رشتہ داروں کو جمع کر کے بس اس کی تعمیل کر دی دراصل اس میں جو اصول واضح رکھے گئے وہ یہ تھے کہ نبی اور اس کے خاندان کے لئے کوئی امتیازی مراعات نہیں ہیں جن سے دوسرے محروم ہوں جو چیز زہر قاتل ہے وہ سب کے لئے ہی قاتل ہے۔

آیت مبارکہ میں دیکھیے کہ حضور ﷺ نے قریش کی مختلف شاخوں کو دعوت دی اور خصوصی طور پر اپنے چچا عباس پھوپھی حضرت صفیہ اور صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کو دعوت دی۔

نبی کا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے اس سے خود بچے اور اپنے قریبی لوگوں کو اس سے ڈرائے پھر ہر خاص و عام کو متنبہ کرے کہ جو بھی کرے گا ہلاک ہو جائے گا۔

نبی کا منصب یہ ہے کہ سب سے پہلے خود اچھائی کو اختیار کرے اور اپنے عزیزوں کو اس کی تلقین کریں تاکہ ہر شخص جان لے کہ یہ وعظ و نصیحت دوسروں ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ نبی اپنی دعوت میں مخلص ہے اسی طریقے پر نبی ﷺ زندگی

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۳۵۱

بھر رہے سود کی حرمت کا حکم آیا تو پہلے اپنے چچا عباس کا سود ساقط کیا ایک موقع پر فرمایا اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اسکے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا۔[۱]

داعیان کرام کو دعوت و تبلیغ میں پہلا قدم ہمیشہ اپنے گھر سے اٹھانا چاہیے کیونکہ گھر خاندان معاشرے کی آکائی ہے گھر اور خاندان کی اصلاح ہو جائے تو معاشرہ خود بخود اصلاح کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے داعی کو خود با عمل ہونا چاہیے اور پھر اپنے گھر والوں کی اصلاح کرنی چاہیے۔ مفسر قرآن نے احادیث کے حوالے سے بہت عمدہ انداز میں اس اسلوب کو بیان کیا ہے۔

دعوت و تبلیغ میں اپنے عمل کو بطور نمونہ پیش کرنا:

داعیان کرام کو دعوت و تبلیغ دینے کے لئے اپنی ذات کو بطور نمونہ پیش کرنا ہوتا ہے تاکہ لوگ اس کی طرف قائل ہو سکیں اور اس کی بات کا اثر قبول کر سکیں حضور ﷺ نے دعوت و تبلیغ کے کام کا آغاز جب کیا تو اس وقت آپ ﷺ کی چالیس سال بے داغ زندگی لوگوں کے سامنے تھی جس کا مشرکین نے بھی اعتراف کیا۔

قرآن پاک میں حکم ربانی ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ﴾[۲]

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم کیوں وہ بات کہتے جو کرتے نہیں۔

علامہ مودودی فرماتے ہیں کہ اس ارشاد کا ایک تو عام مفہوم ہے جو اس کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے اور ایک مدعا خاص ہے پہلا مدعا یہ ہے کہ ایک سچے مسلمان کے قول و عمل میں مطابقت ہونی چاہیے جو کچھ کہے اسے کر کے دکھائے اور کرنے کی ہمت نہ ہو تو زبان سے بھی نہ نکالے کہنا کچھ کرنا کچھ یہ انسان کی ان بدترین صفات میں سے ہے جو اللہ کی نگاہ میں نہایت مبغوض ہیں کہ ایک ایسا شخص اس اخلاقی عیب میں مبتلا ہو جو اللہ پر ایمان رکھنے کا دعوی کرتا ہو نبی ﷺ نے تصریح فرمائی ہے کہ جو شخص اس اخلاقی عیب میں مبتلا ہو جو اللہ پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتا ہو یہ علامت ظاہر کرتی ہے کہ وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہے۔ منافق کی تین نشانیاں ہیں اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور مسلمان ہونے کا دعوی کرتا ہو کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور جب امانت اس کے سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے فقہائے اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ سے کوئی عہد کرے تو اسے وفا کرنا لازم ہے-الا یہ کام خود گناہ ہو جس کا اس نے عہد کیا ہو[۳]

---

(۱) تفہیم القرآن، ۳/ ۵۴۲،۵۴۳

(۲) سورۃ الصف:۶۱/ ۲

(۳) تفہیم القرآن،۵/ ۴۵۴

داعیان کرام کے قول و عمل میں مطابقت ہونی چاہیے قول و عمل میں تضاد رکھنے والے انسان کی بات کو لوگ قبول نہیں کرتے چاہے وہ بات کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو نیکی کی طرف بلانے والوں کو پہلے خود نیکی کی راہ پر چل کر دکھانا چاہیے تاکہ لوگ اسے بطور نمونہ سامنے رکھیں جو شخص خدا کے احکامات کو مخلوق کو پہنچانے کا فرض اپنے ذمہ لے اسے سنت کی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔

جس کسی کے دل میں خوش قسمتی سے یہ شوق پیدا ہو جائے کہ خدا تعالیٰ کی مخلوق کو اس کے دین سے متعارف کراؤں اسے یاد رکھنا چاہیے کہ جن لوگوں کے آگے وہ خدا کے دین کو پیش کرے گا وہ پہلے خود اس کے اعمال و افعال کو دیکھے گے کہ جس نظام زندگی کو یہ ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے اس نے خود اس کی زندگی پر کیا اثر ڈالا ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے کا واقعہ ہے جو ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ لاہور میں بیشتر ہندو آباد تھے ایک مخلوط محلے میں صبح صبح ایک ہندو عورت اپنے دیر تک سوئے رہنے والے بیٹے پر ناراض ہو رہی تھی اور پکار کر کہہ رہی تھی اے موہن لال تیرا ستیاناس! تو بھی مسلمانوں کی طرح دن کے دس بجے تک سو رہا ہے اب اگر اس عورت کو بتایا جاتا کہ مسلمان پر تو صبح کی نماز فرض ہے جس کا وقت طلوع آفتاب کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے تو اس نے کہاں یقین کرنا تھا کیونکہ اس نے اپنے ارد گرد جو کچھ دیکھا تھا وہ تو یہی تھا کہ مسلمان دن چڑھے سوئے رہتے ہیں۔ اس لئے داعیان کرام کو چاہیے کہ ان کے قول و عمل میں تضاد نہ ہو دوسروں کو دعوت دینے سے پہلے اس عمل کو اپنی ذات کا حصہ بنائے۔(۱)

نرم بات سے دعوت حق کی ہدایت:

دعوت دین نرمی کے ساتھ دعوت و تبلیغ کا زریں اصول ہے نرم زبان سے دل تسخیر ہوتے ہیں داعی اعظم نبی ﷺ ہمیشہ دعوت و تبلیغ میں نرم زبان کا استعمال کرتے مسلمان تو مسلمان مشرکین کے ساتھ بھی آپ ﷺ کا یہی طرز عمل تھا دوسری خوبیوں کی طرح رسول اکرم ﷺ کے اخلاق کریمہ میں نرمی اور شفقت بدرجہ کمال موجود تھی بلکہ آپ ﷺ کی عظیم الشان دعوت کی بنیاد ہی نرمی اور شفقت جیسے عظیم اصول پر تھی۔

حکم ربانی ہے:

﴿خُذِ ٱلۡعَفۡوَ وَأۡمُرۡ بِٱلۡعُرۡفِ وَأَعۡرِضۡ عَنِ ٱلۡجَٰهِلِينَ﴾(۲)

ترجمہ: اے نبی ﷺ! نرمی اور درگزر کا طریقہ اختیار کرو معروف کی تلقین کئے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو۔

---

(۱) داعی کے اوصاف، بنت اسلام، ادارہ بتول، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۲۱

(۲) سورہ لاعراف: ۷/ ۱۹۹

مودودی صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ان آیات میں حضور نبی اکرم ﷺ کو دعوت و تبلیغ اور ہدایت و اصلاح کی حکمت کے چند اہم نکات بتائے گئے ہیں اور مقصد صرف حضور ﷺ کو تعلیم دینا نہیں ہے بلکہ حضور ﷺ کے ذریعے سے ان سب لوگوں کو یہی حکمت سکھانا ہے جو حضور ﷺ کے قائم مقام داعی بن کر دنیا کو سیدھی راہ دکھانے کے لئے مامور ہیں داعی حق کے لئے جو صفات سب سے زیادہ ضروری ہیں ان میں ایک نرم خو متحمل اور عالی ظرف ہونا چاہیے اس کو اپنے ساتھیوں کے لئے شفیق رحیم اور اپنے مخالفوں کے لئے حلیم ہونا چاہیے اس کو اپنے رفقاء کی کمزوریوں کو بھی برداشت کرنا چاہیے اور اپنے مخالفین کی سختیوں کو بھی۔ اسے شدید سے شدید اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے نہایت ناگوار باتوں کو بھی عالی ظرفی کے ساتھ ٹال دینا چاہیے مخالفوں کی طرف سے کسی بھی سخت کلامی بہتان تراشی ایذا رسائی اور اور مزاحمت کا اظہار ہو اس کو درگزر سے ہی کام لینا چاہیے سخت گیری، تلخ گفتاری اور اشتعال طبع اس کام کے لئے زہر کا حکم رکھتا ہے اور اس سے کام بگڑتا ہے بنتا نہیں ہے اسی چیز کو حضورؐ نے یوں بیان فرمایا کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ غضب اور رضا دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کہوں جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں جو مجھے میرے حق سے محروم کرے میں اسے اس کا حق دوں جو میرے ساتھ ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں اور اسی چیز کی ہدایت آپ ﷺ ان لوگوں کو کرتے تھے جنہیں آپ ﷺ دین کے کام کے لیے اپنی طرف سے بھیجتے تھے۔

((بَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا وَيَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُو))[1]

ترجمہ: یعنی تم جہاں جاؤ وہاں تمہاری آمد لوگوں کے لئے مشردہ جاں فزا ہو نہ کہ باعث نفرت۔ اور لوگوں کے لئے تم سہولت کے موجب بنو نا کہ تنگی اور سختی کے اور اس چیز کی تعریف اللہ نے ان کے حق میں فرمائی۔

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ ٱللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ ٱلْقَلْبِ لَٱنفَضُّوا۟ مِنْ حَوْلِكَ ۖ ﴾[2]

یہ اللہ کی رحمت ہے کہ آپ ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم درشت خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب لوگ تمہاری گردوپیش سے چھٹ جاتے۔

دعوت حق کی کامیابی کا گر یہ ہے کہ آدمی فلسفہ طرازی کے بجائے معروف طریقے سے سیدھی اور صاف بھلائیوں کی تلقین کرے جنہیں سارے انسان ہی بھلا جانتے ہیں داعی حق کا اپیل عام و خاص سب کو متاثر کرتا ہے اور ہر سامع کے کان سے دل تک پہنچنے کی راہ نکال لیتا ہے ایسی معروف دعوت کے خلاف جو لوگ شورش کرتے ہیں وہ خود اپنی ناکامی اور دعوت کی کامیابی

---

(۱) البخاری، کتاب الادب، باب قول النبی ﷺ، رقم الحدیث ۳۱۲۱

(۲) سورۃ آل عمران ۳/:۱۵۹

کا سامان فراہم کرتے ہیں عام انسان خواہ وہ کتنے ہی تعصبات میں مبتلا ہوں جو سیدھی سیدھی بھلائیوں کی دعوت دے رہا ہے دوسری طرف اس کی مخالفت میں لوگ انسانیت سے گری ہوئی تدابیر کرتے ہیں تو رفتہ رفتہ ان کے دل خود بخود مخالفین حق سے پھرتے اور داعی حق کی طرف متوجہ ہوتے چلے جاتے ہیں یہی وہ حکمت تھی جس کی بدولت حضور ﷺ کو عرب میں کامیابی حاصل ہوئی اور پھر آپ کے بعد تھوڑی ہی مدت میں اسلام کا سیلاب قریب کے ملکوں میں اس طرح پھیلا کہ کہیں ۱۰۰ فیصد اور کہیں ۸۰ فیصد اور کہیں ۹۰ فیصد باشندے مسلمان ہو گئے۔ (۱)

تمام اولوالعزم انبیا نے نرمی کے اسلوب کو دعوت میں استعمال کیا یہ وہی نرمی کا اسلوب ہے جس کو حکم حضرت موسیٰؑ کو ہوا تھا کہ فرعون جیسے جابر اور سرکش کو بھی درشت زبان میں نہیں بلکہ نرمی سے دعوت حق دیجیے اور اس اسلوب کی پیروی کا حکم حضور ﷺ کو عرب کے جاہل ترین قوم کے لئے ہوا مفسر قرآن نے اس اسلوب کی بھرپور نمائندگی کی ہے نرم خو، متحمل اور عالی ظرف جیسے عمدہ الفاظ استعمال کئے ہیں جس سے مفسر کی ادب میں بھی مہارت تامہ ظاہر ہوتی ہے

تبلیغ دین میں حکمت کا اسلوب:

قرآن پاک دعوت و تبلیغ منصب انبیاء ہے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو دعوت دین میں حکمت اور عمدہ نصیحت کے استعمال کی ہدایت کی ہے:

﴿ ٱدۡعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِٱلۡحِكۡمَةِ وَٱلۡمَوۡعِظَةِ ٱلۡحَسَنَةِۖ وَجَٰدِلۡهُم بِٱلَّتِي هِيَ أَحۡسَنُۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعۡلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِۦ وَهُوَ أَعۡلَمُ بِٱلۡمُهۡتَدِينَ ﴾ (۲)

ترجمہ: اے نبی اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کیساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہ راست پر۔

مولانا مودودی آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ دعوت میں دو چیزیں ملحوظ رہنی چاہیے ایک حکمت اور دوسری عمدہ نصیحت حکمت کا مطلب یہ ہے کہ بے وقوفوں کی طرح اندھا دھند تبلیغ نہ کی جائے بلکہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنی استعداد اور حالات کو سمجھ کر نیز موقع و محل کو دیکھ کر بات کی جائے ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی جائے پھر ایسے دلائل سے اس کا علاج کیا جائے جو اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہوں۔

---

(۱) تفہیم القرآن، ۲/ ۱۱۲

(۲) سورۃ النحل:۱۶/ ۱۲۵

عمدہ نصیحت : کے دو مطلب ہے ایک یہ کہ مخاطب کو صرف دلائل سے مطمئن کرنے پر اکتفانہ کرے بلکہ اسکے جذبات کو بھی اپیل کیا جائے برائیوں اور گمرائیوں کا محض عقلی حیثیت سے ہی ابطال نہ کیا جائے بلکہ انسان کی فطرت میں جو ان کے لئے پیدائشی نفرت پائی جاتی ہے اس بھی ابھارا جائے اور ان کے برے نتائج کا خوف دلایا جائے ہدایت اور عمل صالح کی محض صحت

اور خوبی ہی عقلاً ثابت نہ کی جائے بلکہ ان کی طرف رغبت اور شوق بھی پیدا کیا جائے دوسرا مطلب یہ ہے کہ نصیحت ایسے طریقے سے کی جائے جس سے دلسوزی اور خیر خواہی ٹپکتی ہو مخاطب یہ نہ سمجھے کہ ناصح اسے حقیر سمجھ رہا ہے اور اپنی بلندی کے احساس سے لذت لے رہا ہے بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ ناصح کے دل میں اس کی اصلاح کے لئے ایک تڑپ موجود ہے اور وہ حقیقت میں اس کی بھلائی چاہتا ہے۔ اور اس حکمت اور نصیحت کی نوعیت محض مناظرہ بازی اور عقلی کشتی اور ذہنی نگل کی نہ ہو اس کا مقصد حریف مقابل کو چپ کروا دینا نہ ہو بلکہ اس میں شریں کلامی ہو اعلی درجے کا شریفانہ اخلاق ہو معقول اور دل لگتے دلائل ہوں مخاطب کے اندر اور بات کی ہٹ دھرمی نہ پیدا ہونے دی جائے۔[۱]

سورہ بنی اسرائیل میں حکم خداوندی ہے:

﴿وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾[۲]

ترجمہ : اے محمد! میرے بندوں سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہترین ہو۔

یعنی کفار اور مشرکین سے اور اپنے دین کے مخالفین سے گفتگو اور مباحثے میں تیز کلامی مبالغے سے کام نہ لیں مخالفین خواہ کیسی ہی ناگوار باتیں کریں مسلمانوں کو بہر حال نہ تو کوئی بات خلاف حق زبان سے نکالنی چاہیے اور نہ غصے میں آپے سے باہر ہو کر بیہودگی کا جواب بیہودگی سے دینا چاہیے انہیں ٹھنڈے دل سے وہی بات کہنی چاہیے جو جچتی لگتی ہو بر حق ہو اور ان کی دعوت کے وقار کے مطابق ہو۔مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ جب کبھی تمہیں مخالفین کی بات کا جواب دیتے وقت غصے کی آگ اپنے اندر بھڑکتی محسوس ہو اور طبیعت بے اختیار جوش میں آتی نظر آئے تو فوراً سمجھ لو کہ یہ شیطان جو تمہیں اکسا رہا ہے تاکہ دعوت دین کا کام خراب ہو اس کی کوشش یہ ہے کہ تم بھی اپنے مخالفین کی طرف اصلاح کا کام چھوڑ کر اسی جھگڑے اور فساد میں لگ جاؤ جس میں وہ بنی نوح انسان کو مشغول رکھنا چاہتا ہے۔[۳]

---

(۱) تفہیم القرآن، ۲/ ۵۸۲

(۲) سورۃ بنی اسرائیل: ۱۷/ ۵۳

(۳) تفہیم القرآن، ۲/ ۶۲۳

دعوت میں حکمت کا اسلوب اختیار کرنے سے داعیان کرام کو مخاطب تک اپنی بات پہنچانے میں آسانی رہتی ہے کیونکہ بات کو دلائل کے ساتھ اور پر سکون لہجہ میں کرنے سے دعوتی عمل زیادہ پر اثر ہوتا ہے نیز مخاطب کے اندر داعیان کرام کے لئے محبت واحترام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور اس کا نفس آمادہ اصلاح ہوتا ہے ورنہ شیطان اس کے اندر دشمنی اور عناد پیدا کر دیتا ہے۔

تبلیغ دین میں تشدد اور زیادتی کی گنجائش نہیں:

دین میں جبر نہیں کسی کو زبردستی مسلمان بننے پر آمادہ نہیں کیا جاسکتا دعوت الی اللہ کسی مسلمان کی زندگی کا بنیادی مقصد ہے قرآن پاک اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے:

﴿وَلَوْ شَآءَ ٱللَّهُ مَآ أَشْرَكُوا۟ ۗ وَمَا جَعَلْنَٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ وَمَآ أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ﴾ (۱)

ترجمہ: اور ان مشرکین کے پیچھے نہ پڑو اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ خود ایسا بندوبست کر سکتا تھا کہ یہ لوگ شرک نہ کرتے تم کو ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا اور نہ ہی تم ان پر حوالہ دار ہو۔

مودودی صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہاں صاف بتا دیا گیا ہے کہ تمہیں مبلغ اور داعی بنا کر بھیجا گیا ہے کوتوال نہیں بنایا گیا تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس روشنی کو پیش کرو اور اظہار حق کا حق ادا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھار کھو اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے تم کو نہ اس کام پر معمور کیا گیا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہو اور نہ تمہاری ذمہ داری و جواب دہی میں یہ بات شامل ہے کہ تمہارے حلقہ نبوت میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہ جائے یہ بات نبی ﷺ کے لئے کہی گئی ہے لہذا اس فکر میں اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو کہ اندھوں کو کس طرح بینا بنایا جائے اور جو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھنا چاہتے انہیں کیسے دکھایا جائے اگر فی الواقع حکمت الٰہی کا تقاضا ہی ہوتا کہ دنیا میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہنے دیا جائے تو اللہ کو یہ کام تم سے لینے کی کیا ضرورت تھی کیا اس کا ایک یہی اشارہ تمام انسانوں کو حق پرست نہیں بنا سکتا تھا مگر وہاں تو یہ مقصد سرے سے ہے ہی نہیں مقصد یہ ہے کہ انسان کے لئے حق اور باطل کے انتخاب کے لئے آزادی باقی رہے اور پھر حق کی روشنی اس کے سامنے پیش کر کے اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ دونوں چیزوں میں سے کس کا انتخاب کرتا ہے بس تمہارے لئے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ جو روشنی تمہیں دکھائی گئی ہے اسکے اجالے میں سیدھی راہ پر خود چلتے رہو اور دوسروں کو اس کی دعوت دیتے رہو جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں انہیں سینے سے لگاؤ اور ان کا ساتھ نہ چھوڑو خواہ وہ

---

(۱) سورۃ الانعام: ۶/ ۱۰۷

دنیا کی نگاہ میں کیسے ہی حقیر ہوں جو اسے قبول نہ کریں ان کے پیچھے نہ پڑو جس انجام بد کی طرف وہ خود جانا چاہتے ہیں اس کی طرف جانے کے لئے انہیں چھوڑ دو۔[1]

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ نصیحت نبی ﷺ کے وسیلے سے داعی حضرات کو کی گئی ہے۔ اپنی تبلیغ کے جوش میں وہ بھی اتنے بے قابو نہ ہو جائیں کہ مناظرے اور بحث و تکرار سے معاملہ بڑھتے بڑھتے غیر مسلموں کے عقائد پر سخت حملے کرنے اور ان کے پیشواؤں اور معبودوں کو گالیاں دینے تک پہنچ جائے کیونکہ یہ چیزیں ان کو حق کے قریب لانے کے بجائے اور زیادہ دور پھینک دیں گی۔

دعوت تبلیغ میں نصیحت کا اسلوب :

دعوت و تبلیغ میں صرف دلائل ہی سے مدعوین کو قائل نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے جذبات کو بھی اپیل کیا جاتا ہے تاکہ نیک کام کی طرف شوق پیدا ہو مطلب یہ کہ نصیحت ایسے طریقے سے کی جائے جس سے دلسوزی اور خیر خواہی ٹپکتی ہو اور مخاطب نہ سمجھے کہ ناصح اسے حقیر سمجھ رہا ہے بلکہ اسے محسوس ہو کہ ناصح کے دل میں اس کی اصلاح کی تڑپ موجود ہے۔

قرآن اس اسلوب کو یوں بیان کرتا ہے۔

﴿فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ فَمَآ أَنتَ بِمَلُومٖ ٥ وَذَكِّرۡ فَإِنَّ ٱلذِّكۡرَىٰ تَنفَعُ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ ﴾[2]

ترجمہ: پس اے نبی ﷺ ! ان سے رخ پھیر لو تم پر کچھ ملامت نہیں البتہ نصیحت کرتے رہو کیونکہ نصیحت ایمان والوں کے نافع ہے۔

مودودی صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ آیت مبارکہ میں دین کی تبلیغ کا ایک قائدہ بیان فرمایا گیا ہے جس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ایک داعی حق جب کسی شخص کے سامنے معقول دلائل کے ساتھ اپنی دعوت صاف صاف پیش کرے اور اس کے شبہات و اعتراضات اور دلائل کا جواب بھی دے دے تو حق واضح کرنے کا جو فرض اس کے ذمے تھا اس سے وہ سبکدوش ہو جاتا ہے اس کے بعد بھی اگر وہ شخص اپنے عقیدے پر جما رہے تو اس کی کوئی ذمہ داری داعی حق پر عائد نہیں ہوتی اب کچھ ضروری نہیں کہ وہ اسی شخص کے پیچھے پڑا رہے اسی سے بحث میں اپنی عمر کھپائے چلا جائے اور اس کا کام بس یہ نہ رہ جائے کہ اس آدمی کو کسی نہ کسی طرح اپنا ہم خیال بنانا ہے داعی اپنا فرض ادا کر چکا وہ نہیں مانتا تو نہ مانے کیونکہ اب گمراہی کا وہ شخص خود ذمہ دار ہے۔

---

(۱) تفہیم القران، ۱/ ۵۸۶

(۲) الذریات: ۵۱/ ۵۴، ۵۵

حضور ﷺ کو مخاطب کر کے یہ قائدہ اس لئے بیان نہیں کیا گیا ہے کہ معاذ اللہ آپ ﷺ اپنی تبلیغ میں بے جا طریقے سے لوگوں کے پیچھے پڑ جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو اس سے روکنا چاہتا تھا دراصل اس کے بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک داعی حق جب کچھ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ معقول طریقے سے سمجھانے کا حق ادا کر چکا ہوتا ہے تو ان کے اندر ضد اور جھگڑالوپن کے آثار دیکھ کر ان سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے تو وہ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اس پر الزام رکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ واہ صاحب آپ اچھے دعوت حق کے علم بردار ہیں ہم آپ سے بات سمجھنے کے لئے بحث کرنا چاہتے ہیں اور آپ ہماری طرف التفات نہیں کرتے حالانکہ ان کا مقصد بات کو سمجھنا نہیں بلکہ داعی کو الجھانا اور محض اس کی تضیع اوقات کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلام پاک میں بالالفاظ صریح یہ فرمایا کہ "ایسے لوگوں کی طرف التفات نہ کرو ان سے بے التفاتی کرنے پے تمہیں کوئی ملامت نہیں کی جا سکتی" اس کے بعد کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کو یہ الزام نہیں دے سکتا تھا کہ جو کتاب آپ ﷺ لے کر آئے ہیں اس کی رو سے تو آپ ہم کو اپنا دین سمجھانے پر مامور ہیں پھر آپ ﷺ ہماری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے۔

دعوت و تبلیغ کا دوسرا اہم قائدہ سید مودودی نے فرمایا کہ اس آیت میں تبلیغ کا دوسرا قاعدہ بیان کیا گیا ہے دعوت حق کا اصل مقصد ان سعید روحوں تک ایمان کی نصیحت پہنچانا ہے جو اس نعمت کی قدر شناس ہوں اور اسے خود حاصل کرنا چاہیں مگر داعی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انسانی معاشرے کے لئے ہزاروں لاکھوں افراد میں وہ سعید روحیں کہاں ہیں اس لئے اس کا کام یہ ہے کہ اپنی دعوت عام کا سلسلہ برابر جاری رکھے تاکہ جہاں جہاں بھی ایمان قبول کرنے والے موجود ہوں وہاں اس کی آواز پہنچ جائے یہی لوگ اس کی اصل دولت ہیں انہی کی تلاش اس کا اصل کام ہے اور انہیں کو سمیٹ سمیٹ کر خدا کے راستے پر لا کھڑا کرنا اس کے پیش نظر ہونا چاہیے اولاد آدمؑ کا جو حصول عنصر اس کو ملے اس کی طرف اس وقت تک داعی کو توجہ کرنی چاہیے جب تک اسے تجربے سے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ جنس کاسد ہے اس کے کساد و فساد کا تجربہ ہو جانے کے بعد اسے پھر اپنا قیمتی وقت اس جنس کے لوگوں پر ضائع نہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ اس کی تذکیر سے نفع اٹھانے والے لوگ نہیں اور ان پر قوت صرف کرنے سے نقصان ان لوگوں کا ہوتا ہے جو اس سے نفع اٹھانے والے ہیں۔(۱)

تیسیر القرآن کے مصنف دعوتی نقطہ نگاہ کی یوں حمایت کرتے ہیں۔

پیغمبر یا داعی حق کے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اللہ کا پیغام مسلسل پہنچاتے رہیں خواہ ان کے سامنے مخالف یا ناقدر شناس ہی بیٹھے ہوں اس لئے یہ انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ انسانی معاشرے کے لاکھوں کروڑوں افراد میں وہ سعید روحیں کہاں ہیں جو اس دعوت کو ماننے والے کے لئے تیار بیٹھی ہیں وہ فقط دعوت کے پہنچنے کا انتظار کر رہی ہیں یہ لوگ اس کی اصل دولت اور

(۱) تفہیم القرآن، ۵/۱۵۴، ۱۵۵

سرمایہ ہیں انہی کی تلاش اس کا اصل کام ہے ایسے ہی لوگ اس کا دست راست بننے اور ان کے ساتھ مصائب جھیلنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔[1]

معارف القرآن کے مفسر آیت مبارکہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ:

آیت مبارکہ کی تفسیر میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب یوں فرماتے ہیں حضور ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ مشرکین کے طغیان کی پرواہ نہ کریں آپ ﷺ ان کی طرف التفات نہ کیجیے یعنی ان کی تکذیب کی پرواہ اور غم نہ کیجیے کیونکہ آپ ﷺ پر کسی طرح کا الزام نہیں۔ اور اطمینان کے ساتھ اپنے منصبی کام میں لگے رہیں فقط سمجھاتے رہیں کیونکہ سمجھانا انجام نہیں اتمام حجت ہے اور جن کی قسمت میں ایمان ہے ان ایمان لانے والوں کو بھی اور جو پہلے مومن ہیں ان کو بھی نفع دے گا بہر حال تذکیر میں عام فوائد سب کے اعتبار سے ہیں آپ ﷺ اس کو کئے جائیں اور کسی کے ایمان نہ لانے کا غم نہ کیجیے۔[2]

آیت مبارکہ کی تفسیر مولانا عبد الرحمن کیلانی صاحب اور مولانا مفتی شفیع صاحب نے بھی کی ہے تاہم آیت مبارکہ کی تفسیر میں سید مودودی صاحب نے دعوتی نقطہ نگاہ کو کھل کر بیان کیا ہے۔

دعوت و تبلیغ میں صبر کا اسلوب:

دعوت و تبلیغ میں صبر کا اہم اسلوب ہے کیونکہ دعوت دین کی راہ میں جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ مالی بھی ہوتی ہیں جسمانی اور قولی بھی دین کی دعوت دینے والوں میں جب تک صبر و استقامت نہ ہو گا وہ اس محاذ پر فتح حاصل نہیں کر سکتے حضور ﷺ کی زندگی صبر کا اعلیٰ نمونہ ہے اور قرآن پاک نے اس اسلوب کو جابجا بیان کیا ہے۔

﴿أُوْلَٰٓئِكَ يُجۡزَوۡنَ ٱلۡغُرۡفَةَ بِمَا صَبَرُواْ وَيُلَقَّوۡنَ فِيهَا تَحِيَّةٗ وَسَلَٰمًا﴾[3]

ترجمہ: یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے صبر کا پھل منزل بلند کی شکل میں پائیں گے۔

علامہ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ صبر کا لفظ یہاں وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہوا ہے دشمنان حق کے مظالم کو مردانگی کے ساتھ برداشت کرنا دین حق کو قائم اور سربلند کرنے کی جدوجہد میں ہر قسم کے مصائب اور تکلیفوں کو سہ جانا ہر خوف اور لالچ کے مقابلے میں راہ راست پر ثابت قدم رہنا شیطان کی تمام ترغیبات اور نفس کی ساری خواہشات کے بجائے فرض کو بجالانا حرام سے پرہیز کرنا اور حدود اللہ پر قائم رہنا گناہ کی ساری لذتوں کو ٹھکرا دینا اور نیکی راستی کے ہر نقصان اور اس کی بدولت حاصل

(۱) تیسیر القرآن، عبد الرحمن کیلانی، ۴/ ۳۰۳

(۲) معارف القرآن، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، ادارہ المعارف، کراچی، ۱۹۹۳ء، ۸/ ۱۷۰، ۱۷۱

(۳) سورۃ الفرقان: ۲۵/ ۷۵

ہونے والی ہر محرومی کو انگیز کر جانا غرض اس ایک لفظ کے اندر دین اور دینی رویے اور دینی اخلاق، سب کو بیان کر دیا گیا ہے۔[1]

سید صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ کے یہی بندے راہ حق میں پوری استقامت دکھانے والے ہیں اور حق کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھتے ہیں داعیان حق کی کوششیں اس وقت کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتیں جب تک وہ صبر کے اسلوب کا دامن نہ پکڑیں خود مودودی صاحب نے اپنی دعوتی زندگی میں اس اسلوب کی بھرپور نمائندگی کی یہاں تک کہ جب آپ کو حکومت وقت نے پھانسی کی سزا سنادی تو بھی آپ نے صبر کا دامن تھامے رکھا اور حکومتِ وقت سے معافی نہ مانگی۔

اہل کتاب سے مجادلہ بطریق احسن:

دعوت و تبلیغ صرف مسلمانوں اور اہل ایمان تک مخصوص نہیں مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ اللہ کا پیغام ساری دنیا میں پھیلا دیں قرآن پاک میں اہل کتاب کو دعوت دینے کے اسلوب کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

﴿ ۞ وَلَا تُجَٰدِلُوٓاْ أَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ إِلَّا بِٱلَّتِي هِيَ أَحۡسَنُ إِلَّا ٱلَّذِينَ ظَلَمُواْ مِنۡهُمۡۖ وَقُولُوٓاْ ءَامَنَّا بِٱلَّذِيٓ أُنزِلَ إِلَيۡنَا وَأُنزِلَ إِلَيۡكُمۡ وَإِلَٰهُنَا وَإِلَٰهُكُمۡ وَٰحِدٞ وَنَحۡنُ لَهُۥ مُسۡلِمُونَ ﴾[2]

ترجمہ: اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں اور ان سے کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے ہم اس کے مسلم (فرماں بردار) ہیں۔

ان آیات مبارکہ میں نبی ﷺ کو اہل کتاب کو دعوت دینے کے اسالیب بتائے جارہے ہیں واضح رہے کہ آگے چل کر اسی سورہ میں ہجرت کی تلقین کی جارہی ہے اس وقت حبش ہی ایسا ملک تھا جہاں مسلمان ہجرت کر کے جاسکتے تھے اور حبش پر اس زمانے میں عیسائیوں کا غلبہ تھا اس لئے ان آیات میں مسلمانانِ کرام کو ہدایت کی جارہی ہے کہ اہل کتاب سے جب سابقہ پیش آئے تو داعیانِ دین سے دین کے معاملے میں ان سے بحث و کلام کا کیا انداز اختیار کریں۔

سید مودودی فرماتے ہیں کہ اہل کتاب سے مباحثہ معقول دلائل کے ساتھ مہذب شائستہ زبان میں اور افہام و تفہیم کی سپرٹ میں ہونا چاہیے تاکہ جس شخص سے بحث کی جارہی ہے اس کے خیالات کی اصلاح ہو سکے مبلغ کو فکر اس بات کی ہونی

---

(۱) تفہیم القرآن، ۳/۱۷۴

(۲) سورۃ العنکبوت: ۲۹/ ۴۶

چاہیے کہ وہ مخاطب کے دل کا دروازہ کھول کر حق بات اس میں اتار دے اور اسے راہ راست پر لائے اسکو ایک پہلوان کی طرح نہیں لڑنا چاہیے جس کا مقصد اپنے مدمقابل کو نیچا دیکھانا ہوتا ہے کیونکہ ان کو ایک حکیم کی طرح چارہ گری کرنی چاہیے جو مریض کا علاج کرتے وقت یہ بات ملحوظ رکھتا ہے کہ اس کی اپنی کسی غلطی سے مریض کا مرض اور زیادہ نہ بڑھ جائے اور اس امر کی پوری کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم تکلیف کے ساتھ مریض شفایاب ہو جائے یہ ہدایت اس مقام پر تو موقع کی مناسبت سے اہل کتاب کے ساتھ مباحثہ کرنے کے معاملے میں دی گئی ہے مگر یہ اہل کتاب کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ تبلیغ دین کے باب میں ایک اہم ہدایت ہے آیت مبارکہ میں آگے چل کر کہا گیا ہے کہ جو لوگ ظلم کا رویہ اختیار کریں ان کے ساتھ ان کے ظلم کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف رویہ اختیار کیا جا سکتا ہے مطلب یہ کہ ہر وقت ہر حال میں اور ہر طرح کے لوگوں کے مقابلے میں نرم و شیریں ہی نہ بنے رہنا چاہیے کہ دنیا داعی حق کی شرافت کو کمزوری اور مسکنت سمجھ بیٹھے اسلام اپنے پیروؤں کو شائستگی شرافت اور معقولیت تو ضرور سکھاتا ہے مگر عاجزی اور مسکینی اس طرح نہیں سکھاتا کہ وہ ہر ظالم کے لئے نرم چارہ بن کر رہیں۔
ان آیات مبارکہ کے تیسرے حصے میں اللہ تعالیٰ نے خود اس عمدہ طریق بحث کی طرف رہنمائی فرمائی ہے جسے تبلیغ حق کی خدمت انجام دینے والوں کو اختیار کرنا چاہیے اس میں یہ سکھایا گیا ہے کہ جس شخص سے تمہیں بحث کرنی ہو اسکی گمراہی کو بحث کا نقطہ آغاز نہ بناؤ بلکہ اس بات سے شروع کرو کہ حق و صداقت کے وہ کون سے اجزاء ہیں جو تمہارے اور اسکے درمیان مشترک ہیں یعنی دعوت دینے کے طریقے میں آغاز کلام نقطہ اختلاف سے نہیں بلکہ نقطہ اتفاق سے ہونا چاہیے پھر انہی متفقہ علیہ امور سے استدلال کر کے مخاطب کو یہ سمجھانے کی کوشش کر کرنی چاہیے کہ جن امور میں تمہارے اور اس کے درمیان اختلاف ہے ان میں تمہارا مسلک متفقہ علیہ بنیادوں سے مطابقت رکھتا ہے اور اس کا مسلک ان سے متضاد ہے۔

اس ضمن میں یہ بات یاد رہے کہ اہل کتاب مشرکین عرب کی طرح وحی و رسالت اور توحید کے منکر نہ تھے بلکہ مسلمانوں کی طرح ان سب حقیقتوں کو مانتے تھے ان بنیادی امور میں اتفاق کے بعد اگر کوئی بڑی چیز بنیاد اختلاف ہو سکتی تھی تو وہ یہ کہ مسلمان ان کے ہاں آتی ہوئی آسمانی کتابوں کو نہ مانتے اور اپنے ہاں آئی ہوئی کتاب پر ایمان لانے کی دعوت دیتے اور اس کے نہ ماننے پر انہیں کافر قرار دیتے یہ جھگڑے کی بڑی مضبوط وجہ ہوتی لیکن مسلمانوں کا موقف اس سے مختلف تھا وہ ان تمام ان کتابوں کو برحق تسلیم کرتے تھے جو اہل کتاب کے پاس موجود تھیں اور پھر اس وحی پر ایمان لاتے تھے جو محمد ﷺ پر نازل ہوتی تھی اس کے بعد یہ بتانا اہل کتاب کا کام تھا کہ معقول وجہ سے وہ خدا ہی کی نازل کردہ ایک کتاب کو مانتے ہیں اور دوسری کتابوں کا انکار کرتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں مسلمانوں کو تلقین فرمائی ہے کہ اہل کتاب سے جب سابقہ پیش آئے تو سب سے پہلے مثبت طور پر اپنا موقف ان کے سامنے پیش کرو ان سے کہو کہ جس خدا کو تم مانتے ہو اسی کو ہم بھی مانتے ہیں اور اس کے

فرمانبردار ہیں اس کی طرف سے جو احکام اور ہدایات اور تعلیمات بھی آئی ہیں ان سب کے آگے ہمارا سر تسلیم خم ہے خواہ تمہارے ہاں آئی ہوں یا ہمارے ہاں؟[1]

داعی حضرات اہل کتاب سے مجادلہ احسن کریں تاکہ دعوت و تبلیغ کو ان کے دلوں کی گہرائیوں میں اتارا جاسکے اور حق بات کو سمجھنے اور قبول کرنے پر آمادہ کیا جاسکے۔ سید صاحب آیت مبارکہ کی تفسیر میں مجادلہ بلا احسن کے اسلوب کو نہایت جامع انداز میں بیان کرتے ہیں اور دلائل سے اس اسلوب کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان کی تفسیر کی بڑی خوبی داعیانہ انداز تفسیر ہے اور مودودی صاحب نے مجادلہ بلا احسن کے اسلوب کا حق ادا کر دیا ہے جو داعیان دین کے لئے مشعل راہ ہے۔

سادہ لوح مسلمانوں کی تعلیم پر توجہ خاص:

اسلام کی دعوت در حقیقت اللہ کا پیغام ہے اور اللہ کی نظر میں چاہے کوئی امیر ہو یا غریب کمزور ہو یا طاقتور سب برابر ہیں اللہ کے ہاں برتری کا معیار تقویٰ ہے ایک داعی کا کام اللہ کے پیغام کو پہنچا دینا اور پھیلانا ہے یہ سوچے بنا کہ کون عمل کرے گا اور کون نہیں ایک داعی جب دعوت کا آغاز کرنے لگتا ہے تو فطری طور پر اس کا رجحان اس طرف ہوتا ہے کہ قوم کے بااثر لوگ اس کی دعوت قبول کر لیں تاکہ کام آسان ہو جائے ورنہ عام بے اثر معذور یا کمزور لوگوں میں دعوت پھیل بھی جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا قریب قریب یہی طرز عمل ابتداء میں رسول ﷺ نے بھی اختیار فرمایا تھا جس کا محرک سراسر اخلاص اور دعوت حق کو فروغ دینے کا جذبہ تھا نہ کہ بڑے لوگوں کی تعظیم اور چھوٹے لوگوں کی تحقیر کا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سمجھایا کہ اسلامی دعوت کا یہ صحیح طریقہ نہیں ہے بلکہ اس دعوت کے نقطہ نظر سے ہر وہ انسان اہمیت رکھتا ہے جو طالب حق ہو چاہے وہ کیسا ہی کمزور بے اثر یا معذور ہو اور ہر شخص غیر اہم ہے جو حق سے بے نیازی برتتے خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی بڑا مقام رکھتا ہو اس لئے آپ ﷺ اسلام کی تعلیمات پکارے سب کو سنائیں مگر آپ ﷺ کی دعوت کے اصل مستحق وہ لوگ ہیں جن میں قبول حق کی آمادگی پیدا ہو جائے نہ کہ آپ اسے ان مغرور لوگوں کے آگے پیش کریں جو اپنی بڑوتی کے گھمنڈ میں یہ سمجھتے ہوں کہ ان کو آپ ﷺ کی نہیں بلکہ آپ ﷺ کو ان کی ضرورت ہے۔

قرآن پاک میں اس صورت حال کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

﴿ عَبَسَ وَتَوَلَّىٰٓ ۝ أَن جَآءَهُ ٱلْأَعْمَىٰ ۝ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُۥ يَزَّكَّىٰٓ ۝ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ ٱلذِّكْرَىٰٓ ۝ أَمَّا مَنِ ٱسْتَغْنَىٰ ۝ فَأَنتَ لَهُۥ تَصَدَّىٰ ۝ وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ ۝ وَأَمَّا مَن جَآءَكَ يَسْعَىٰ ۝ وَهُوَ يَخْشَىٰ ۝ فَأَنتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ ﴾[2]

---

(۱) تفہیم القرآن، ۳/ ۷۰۸،۷۰۷

(۲) سورہ عبس: ۸۰/ ۱-۱۰

ترجمہ: ترش رو ہوا اور بے رخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا تمہیں کیا خبر شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لئے نافع ہو جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور دوڑ رہا ہوتا ہے اس سے تم بے رخی برتتے ہو ہرگز نہیں یہ تو ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔

سید مودودی فرماتے ہیں کہ یہاں فقرے کا انداز بیان عجیب لطف اپنے اندر رکھتا ہے اگرچہ بعد کے مکتوم میں براہ راست رسول ﷺ کو کہا گیا ہے کہ ترش روئی اور بے رخی دعوت و تبلیغ میں نہ برتی جائے یہ واقعہ مشہور صحابی ابن ام کلثوم کا ہے حافظ ابن حجر [(۱)] نے الاصابہ میں بیان کیا ہے کہ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پھوپھی زاد بھائی تھے ان کی ماں اُم کلثوم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا کے والد خویلد آپس میں بہن بھائی تھے حضور ﷺ کے ساتھ ان کا یہ رشتہ معلوم ہو جانے کے بعد اس شبے کی گنجائش نہیں رہتی کہ حضور ﷺ نے انہیں ان کو غریب یا کم حیثیت سمجھ کر ان سے بے رخی برتی اور بڑے آدمیوں کی طرف توجہ فرمائی یہ حضور ﷺ کے برادر نسبی تھے خاندانی آدمی تھے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی بے اعتنائی کے سبب کی حقیقت خود بیان فرمادی یعنی حضور ﷺ کا خیال یہ تھا کہ میں اس وقت جن لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں ان میں سے کوئی ایک ہدایت پالے تو اسلام کی تقویت کا بڑا ذریعہ بن سکتا ہے۔

جس قدر ان سرداروں میں کوئی مسلمان ہو کر مفید ہو سکتا ہے اس لئے ان کو اس موقع پر گفتگو میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے یہ جو کچھ سمجھنا یا معلوم کرنا چاہتے ہیں اسے بعد میں کسی وقت بھی دریافت کر سکتے ہیں یہی ہے وہ اصل نکتہ جسے رسول اللہ ﷺ نے تبلیغ دین کے معاملے میں اس موقع پر نظر انداز کر دیا تھا اور اسی کو سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے ابن ام کلثوم کا واقعہ بیان ہوا پھر آپ ﷺ کو بتایا کہ داعی حق کی نگاہ میں حقیقی اہمیت کسی چیز کی ہونی چاہیے اور کس کی نہیں ایک وہ شخص ہے جس کی حالت ظاہری صاف بتا رہی ہے کہ وہ طالب حق ہے اس بات سے ڈر رہا ہے کہ کہیں باطل کی پیروی کر کے خدا کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائے اس لئے وہ براہ راست کا علم حاصل کرنے کی خاطر خود چل کر آتا ہے دوسرا وہ شخص ہے جس کا رویہ صریحاً یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس میں حق کی کوئی طلب نہیں پائی جاتی بلکہ وہ اپنے آپ کو اس سے بے نیاز جانتا ہے کہ اسے راہ راست بتائی جائے ان دونوں قسم کے آدمیوں کے درمیان دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ کون ایمان لے آئے تو دین کے لئے بہت مفید ہو سکتا ہے اور کسی کا ایمان لانا دین کے فروغ میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کون ہدایت کو قبول کر

---

(۱) حافظ ابن حجر: آپ کا نام احمد، لقب شہاب الدین، عرف ابن حجر ہے۔ ۲۳ شعبان ۷۷۳ھ کو مصر میں پیدا ہوئے۔ فن حدیث مہارت حاصل کی۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ۱۵۰ سے زیادہ ہے۔ مشہور تصانیف میں شرح بخاری، شرح نخبۃ الفکر، کتاب بلوغ المرام مشہور ہیں۔ آپ نے ۲۸ ذی الحج ۸۵۲ھ کو مصر میں وفات پائی۔ (اسلامی انسائیکلوپیڈیا، سید قاسم محمود، ٹیکشن پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص۷۷۲

کے سدھرنے کے لئے تیار ہے اور کون اس متاع گراں کا سرے سے قدر دان ہی نہیں پہلی قسم کا آدمی خواہ وہ اندھا ہو، لنگڑا ہو ،لولا ہو، فقیر ہو بظاہر دین کے فروغ کے لئے کوئی بڑی خدمت انجام دینے کے قابل نظر نہ آتا ہو بہر حال داعی حق کے لئے وہ قیمتی آدمی ہے اس کی طرف اسے توجہ کرنی چاہیے کیونکہ اس دعوت کا اصل مقصد بندگان خدا کی اصلاح ہے اور اس شخص کا حال یہ بتارہا ہے کہ اسے نصیحت کی جائے گی تو وہ اصلاح کرلے گا رہا دوسری قسم کا آدمی تو خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی با اثر ہو اس کے پیچھے پڑنے کی داعی حق کو کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی روش علانیہ یہ بتارہی ہے کہ وہ سُدھرنا نہیں چاہتا اس لئے اس کی اصلاح کی کوشش میں وقت صرف کرنا وقت کا ضیاع ہے اگر وہ نہ سدھرنا چاہے تو نہ سُدھرے نقصان اس کا اپنا ہی ہوگا داعی حق کی کوئی ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوتی۔

یعنی ایسا ہر گز نہ کرو خدا کو بھولے ہوئے اور اپنی دنیاوی وجاہت پر پھولے ہوئے لوگوں کو بے جا اہمیت نہ دو نہ اسلام کی تعلیم ایسی چیز ہے کہ جو اس سے منہ موڑلے اس کے سامنے اسے بالحاح پیش کیا جائے۔

اور نہ تمہاری یہ شان ہے کہ ان مغرور لوگوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے ایسے انداز سے کوشش کرو کہ جس سے یہ اس غلط فہمی میں پڑجائیں کہ تمہاری کوئی غرض ان سے اٹکی ہوئی ہے یہ مان لیں گے تو تمہاری دعوت فروغ پاسکے گی ورنہ ناکام ہو جائے گی حق ان سے اتنا ہی بے نیاز ہے جتنے حق سے یہ بے نیاز ہیں۔(۱)

تفسیر ابن کثیر:

بہت سے مفسرین سے مروی ہے کہ حضور ﷺ ایک مرتبہ قریش کے سرداروں کو اسلام کو تعلیم سمجھارہے تھے اور مشغولیت کے باعث ان کی طرف متوجہ تھے اور دل میں خیال تھا کہ کیا عجب خدا تعالیٰ انہیں اسلام نصیب کر دے ناگہاں حضرت عبد اللہ ابن کلثوم آئے پرانے مسلمان تھے عموماً حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دین کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور مسائل دریافت کرتے آج بھی حسب عادت آتے ہی سوالات شروع کئے اور آگے بڑھ کر حضور ﷺ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا آپ ﷺ چونکہ اس وقت ایک اہم امر دینی مشغول تھے اس لئے توجہ نہ فرمائی اور پیشانی مبارک پر بل پڑگئے اور گراں گزرا اس پر یہ آیات نازل ہوئی کہ آپ ﷺ کی شان اور اعلیٰ اخلاق کے لائق یہ بات نہ تھی کہ اس نابینا سے جو ہمارے خوف سے ڈرتا بھاگتا آپ ﷺ کی خدمت میں علم دین کے لئے آئے آپ ﷺ اس سے منہ پھیر لیں اور ان کی طرف متوجہ رہیں جو سرکش ہیں اور مغرور متکبر ہیں بہت ممکن ہے کہ یہی پاک ہو جائے اور خدا کی باتیں سن کر برائیوں سے بچ جائے۔ مرد عورت چھوٹے بڑے سب برابر ہیں آپ ﷺ سب کو یکساں نصیحت کیا کریں ہدایت خدا کے ہاتھ میں ہے وہ اگر کسی کو راہ راست سے دور رکھے تو اس کی حکمت ہی جانتی ہے جسے اپنی راہ پر لگالے اسے بھی وہ وہی خوب جانتا ہے حضرت ابن ام کلثوم کے

---

(۱) تفہیم القرآن،٦/ ٢٥٤،٢٥٥

آنے کے وقت حضور ﷺ کا مخاطب ابی بن خلف تھا اس واقعے کے بعد حضور ﷺ ابن ابی مکتوم کی بڑی آؤ بھگت کیا کرتے تھے۔ (۱)

سید مودودی نے اس اسلوب کی بہت پر اثر تفسیر کی ہے کہ کسی آدمی کی دنیاوی حالت چاہے کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو اگر وہ دین کے معاملے میں دلچسپی دیکھاتا ہے تو وہ قابل احترام ہے۔

مناظروں سے اجتناب:

داعی کو دعوت و تبلیغ کے کام میں مناظرانہ انداز کلام سے ہمیشہ بچتے رہنا چاہیے یہاں تک کہ اگر مخاطب کے متعلق اندازہ ہو جائے کہ وہ مناظرے پر اتر آیا ہے تو داعی حق کو کنارہ کشی اختیار کرنی چاہیے۔ کیونکہ مناظرہ بازی سے کسی کو قائل نہیں کیا جاسکتا قرآن پاک میں اس صورت حال کو یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿ وَإِذَا رَأَيْتَ ٱلَّذِينَ يَخُوضُونَ فِيٓ ءَايَٰتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُواْ فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِۦۚ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ ٱلشَّيْطَٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ ٱلذِّكْرَىٰ مَعَ ٱلْقَوْمِ ٱلظَّٰلِمِينَ ٥ وَمَا عَلَى ٱلَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَلَٰكِن ذِكْرَىٰ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴾ (۲)

ترجمہ: اور اے محمد ﷺ جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں لگ جائیں اور اگر شیطان کبھی تمہیں بھلاوے میں ڈال دے تو جس وقت تمہیں اس غلطی کا احساس ہو جائے اس کے بعد ایسے ظالم لوگوں کے پاس نہ بیٹھو ان کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمہ داری پرہیز گار لوگوں پر نہیں ہے البتہ نصیحت کرنا ان کا فرض ہے شاید کہ وہ غلطی سے بچ جائیں۔

آیت مبارکہ سے پہلی والی آیت میں بتایا گیا ہے کہ محمد ﷺ کی قوم اللہ کی آیات کا انکار کرتی تھی اور عذاب کا مطالبہ کرتی تھیں آپ ﷺ ان سے کہہ دیں کہ میرا کام صرف حق و باطل کی تمیز کر کے تمہارے سامنے پیش کرنا ہے اب اگر تم نہیں مانتے تو جس برے انجام سے میں تمہیں ڈراتا ہوں وہ اپنے وقت پر خود تمہارے سامنے آجائے گا۔

سورہ انعام کی آیات مبارکہ میں حضور ﷺ سے کہا گیا ہے کہ نقطہ چینیاں کرنے والوں کے پاس سے ہٹ جایا کریں اور اگر کسی وقت ہماری یہ ہدایات تمہیں یاد نہ رہے اور تم بھولے سے ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھے رہ جاؤ (تو وہاں سے اٹھ جاؤ) مطلب یہ کہ جو لوگ خدا کی نافرمانی سے خود بچ کر کے کام کرتے ہیں ان پر نافرمانوں کے کسی عمل کی ذمہ داری نہیں پھر وہ

(۱) تفسیر ابن کثیر، نور محمد کارخانہ، تجارت کتب، کراچی ۵/ ۱۵

(۲) سورۃ الانعام: ٦/ ٦٨، ٦٩

کیوں خواہ مخواہ اس بات کو اپنے اوپر فرض کر لیں کہ ان نافرمانوں سے بحث و مناظرہ کر کے ضرور انہیں قائل کر کے چھوڑیں گے اور ان کے ہر لغو اور اعتراض کا جواب ضرور دیں گے اگر وہ نہ مانتے ہو تو کسی نہ کسی طرح منوا کر ہی دم لیں گے ان کا فرض یہ ہے کہ جن کو گمراہی میں بھٹکتے دیکھ رہے ہیں انہیں نصیحت کریں اور حق بات ان کے سامنے پیش کر دیں پھر اگر وہ نہ مانیں اور جھگڑے اور بحث و مباحثہ اور مناظروں پر اتر آئیں تو اہل حق کا یہ کام نہیں کہ ان کے ساتھ دماغی کشتیاں لڑنے میں اپنا قیمتی وقت اور قوتیں ضائع کرتے پھریں ضلالت پسند لوگوں کی بجائے انہیں اپنا وقت اور اپنی قوتوں کو ان لوگوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و تلقین پر صرف کرنا چاہیے جو خود طالب حق ہو۔(۱)

دعوت و تبلیغ میں صبر اور نماز کے اسلوب سے مدد چاہنا:

﴿ فَٱصۡبِرۡ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ قَبۡلَ طُلُوعِ ٱلشَّمۡسِ وَقَبۡلَ ٱلۡغُرُوبِ ٥ وَمِنَ ٱلَّيۡلِ فَسَبِّحۡهُ وَأَدۡبَٰرَ ٱلسُّجُودِ ﴾(۲)

ترجمہ: پس تم صبر کرو اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے اور رات کے وقت پھر اس کی تسبیح کرو اور سجدہ ریزیوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی۔

سید صاحب فرماتے ہیں کہ کائنات کے چھ دن میں بن جانے والی بات سن کر کفار آپ ﷺ کا مذاق اڑاتے، آپ ﷺ کو حکم ہوا کہ صبر کریں ٹھنڈے اور دل سے ان کی ہر بے ہودہ بات کو سنو اور جس حقیقت کے بیان کرنے پر تم مامور کئے گئے ہو اسے بیان کرتے جاؤ یہ ہے وہ ذریعہ جس سے آدمی کو یہ طاقت حاصل ہوتی ہے کہ دعوت حق کی راہ میں اسے خواہ کیسے ہی دل شکن اور روح فرسا حالات سے سابقہ پیش آئے اور اس کی کوششوں کا خواہ کوئی عشر بھی حاصل ہوتا نظر نہ آئے پھر بھی وہ پورے عزم کے ساتھ کلمہ حق بلند کرنے اور دنیا کو خیر کی طرف بلانے کی سعی جاری رکھیں رب کی حمد اور اس کی تسبیح سے مراد یہاں نماز ہے اور جس مقام پر بھی قرآن میں حمد و تسبیح کو خاص اوقات کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے۔ وہاں سے مراد نماز ہی ہے۔(۳)

﴿فَٱصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ﴾(۴)

ترجمہ: لہٰذا تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو۔

---

(۱) تفہیم القرآن، ۱/ ۵۵۱

(۲) سورۃ ق: ۵۰/ ۳۹، ۴۰

(۳) تفہیم القرآن: ۵/ ۱۲۵

(۴) سورۃ الدھر: ۷۶/ ۲۴

یعنی تمہارے رب نے جس کار عظیم پر تمہیں مامور کیا ہے اس کی سختیوں اور مشکلات پر صبر کرو جو کچھ بھی تم پر گزر جائے اسے پامردی کے ساتھ برداشت کرتے چلے جاؤ اور پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دو۔

﴿وَٱذۡكُرِ ٱسۡمَ رَبِّكَ بُكۡرَةً وَأَصِيلًا ۝ وَمِنَ ٱلَّيۡلِ فَٱسۡجُدۡ لَهُۥ وَسَبِّحۡهُ لَيۡلًا طَوِيلًا﴾ (۱)

ترجمہ: اوران میں سے کسی بد عمل یا منکر حق کی بات نہ مانو۔ اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کرو رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو۔

یعنی ان میں سے کسی سے دب کر دین حق کی تبلیغ سے باز نہ آؤ اور کسی بد عمل کی خاطر دین کی اخلاقی تعلیمات میں یا کسی منکر حق کی خاطر دین کے عقائد میں ذرہ برابر بھی ترمیم و تغیر کرنے کے لئے تیار نہ ہو جو کچھ حرام و ناجائز ہے اسے برملا حرام و ناجائز کہو خواہ کوئی بد کار کتنا ہی زور لگائے کہ تم اس کی مذمت میں ذرا سی نرمی ہی برت لو اور جو عقائد باطل ہیں انہیں کھلم کھلا باطل اور جو حق ہیں انہیں اعلانیہ حق کہہ دو چاہے کفار تمہارا منہ بند کرنے یا اس معاملے میں کچھ نرمی اختیار کر لینے کے لیے تم پر کتنا دباؤ ڈالیں۔

قرآن کا قاعدہ ہے کہ جہاں بھی کفار کے مقابلے میں صبر و ثبات کی تلقین کی گئی ہے وہاں اس کے بعد اللہ کے ذکر اور نماز کا حکم دیا گیا ہے جس سے خود بخود یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دین حق کی راہ میں دشمنانِ حق کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے جس طاقت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس چیز سے حاصل ہوتی ہے صبح و شام اللہ کا ذکر کرنے سے مراد ہمیشہ اللہ کو یاد کرنا بھی ہے مگر جب اللہ کی یاد کا حکم اوقات کے تعین کے ساتھ ہو تو اس سے مراد نماز ہے۔ (۲)

داعی حضرات کو دعوت و تبلیغ کے دوران جب بھی کوئی مشکل پیش آئے یا کٹھن حالات سے واسطہ پڑے تو انہیں فوراً نماز اور صبر کا اسلوب اختیار کرنا چاہیے کیونکہ نماز ہی کامیابی کی ضمانت اور اللہ کے تقرب کا ذریعہ ہے اور جب نماز اور صبر کے ساتھ اللہ سے مدد مانگی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ داعی حضرات کے لئے دعوت کے کام کو آسان کر دیتا ہے اور مخاطبوں کے سینے کھول دیتا ہے کہ وہ قبول حق کے لئے تیار ہو جاتے ہیں تمام اولوالعزم انبیا نے اسی اسلوب کو اختیار کیا اور دور حاضر میں بھی یہی اسلوب کامیابی کی ضمانت ہیں۔

---

(۱) سورۃ الدھر: ۷۶/ ۲۶،۲۵

(۲) تفہیم القران، ۶/ ۲۰۲

باب پنجم

داعیانِ کرام کے اوصاف و ذمہ داریاں

فصل اول — داعیانِ کرام کے اوصاف

فصل دوم — داعیانِ کرام کی ذمہ داریاں

فصل سوم — عصرِ حاضر میں داعیانِ کرام کو درپیش مسائل اوران کا حل

فصل اول

داعیان کرام کے اوصاف

داعی کے اوصاف:

قرآن مجید اور احادیث مبارکہ سے داعی کی چند ایسی صفات سامنے آتی ہیں کہ اگر داعی ان کو اپنے اندر پیدا کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کے کام میں زیادہ برکت رکھ دیتے ہیں۔

دل میں محبت الٰہی پیدا کرنا:

بندے کا اپنے رب سے تعلق قائم رکھنا اور عشق الٰہی میں ڈوبے رہنا ایمان کی علامت اور اس کا ثمر ہے چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا:

﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُۥٓ﴾[1]

جو اللہ کے محبوب ہوں اور اللہ ان کا محبوب ہو گا۔

حب الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ امور محبوب ہوں جو حق جل جلالہ کو محبوب اور پسندیدہ ہیں اور اسی حب الٰہی کی بناء پر مومن اللہ کے نبی ﷺ سے محبت کرتا ہے۔

اللہ کی محبت دراصل شدت ایمان ہے جب اللہ کی محبت ہو گی تو اس محبت کے ساتھ جو داعی بات کرے گا وہ دوسرے کے دل پر اثر کرے گی

داعی جب اللہ کی محبت دل میں رکھ کر دعوت الی اللہ کا فریضہ سرانجام دے گا تو لوگ خود بخود اس کی طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ اللہ کی محبت سے داعی کے الفاظ میں جو تاثیر اور درد پیدا ہوتا ہے وہ گمراہ سے گمراہ لوگوں کو بھی جھنجوڑ کے رکھ دیتا ہے داعی حضرات جب تک حب الٰہی سے سرفراز نہ ہونگے وہ نہ تو لوگوں کو اپنی طرف راغب کر سکے گے اور ان کی بات میں کوئی اثر نہ ہو گا۔ جو اللہ سے محبت رکھتا ہے وہ اللہ کی نافرمانی سے دور رہتا ہے اور یہ ہی مخلص داعی کی پہچان ہے۔

بقول شاعر:

تعصی اللہ وانتتظھرحبه وھذالعمری فی الفعل البدیع لوکان حبک صادقا لاتعته ان المحب لمن یحب مطیع[2]

ترجمہ: تو اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے اور اس کی نافرمانی کرتا ہے اگر تو اپنے دعویٰ میں سچا ہوتا تو نافرمانی بھی نہ کرتا اس لئے کہ عاشق ہمیشہ معشوق کا تابع ہوتا ہے۔

---

(۱) سورۃ المائدۃ:۵/ ۵۴

(۲) فضائل تبلیغ، مولانا زکریا کاندھلوی، مکتبہ البشریٰ، چوہدری محمد علی، کراچی، ۱۹۸۲، ص ۳۶

اطاعت رسول ﷺ:

حضور ﷺ سے محبت دین حق کی شرط اول ہے مولانا مودودی کے نزدیک آپ ﷺ کی خصوصیات میں تکمیل دین ختم نبوت اور عالمگیریت یا دعوت عام شامل ہے۔[1]

حضور ﷺ کی محبت بھی ایمان کا تقاضا ہے قرآن مجید نے اسی محبت کا ذکر یوں کیا:

﴿ٱلنَّبِيُّ أَوۡلَىٰ بِٱلۡمُؤۡمِنِينَ مِنۡ أَنفُسِهِمۡۖ﴾[2]

ترجمہ: حضور ﷺ مومنوں کے لئے ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔

سورہ آل عمران میں ہے:

﴿قُلۡ إِن كُنتُمۡ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِي يُحۡبِبۡكُمُ ٱللَّهُ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوبَكُمۡۚ وَٱللَّهُ غَفُورٞ رَّحِيمٞ﴾[3]

ترجمہ: کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

ان لوگوں میں حضور ﷺ نے تیس سال کی مختصر مدت میں حیرت انگیز انقلاب برپا کیا اس برق رفتاری اور اسکے لمحہ گیر اثرات نے ایک عالم کو انگشت بدانداں کر دیا جو آپ ﷺ کے سخت مخالف تھے یہ آپ ﷺ کے حکیمانہ دعوت و تبلیغ کا اثر تھا کہ وہ لوگ جو ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے ایک دوسرے کو مار کر کھوپڑیوں میں شراب پیتے تھے وہ آپس میں یوں بھائی بھائی بن گئے کہ ایک دوسرے کی عزت و ناموس کی خاطر جان لڑانے اور اپنا مال بے دریغ لٹانے پر تیار ہوئے چونکہ داعی حضرت کا کام بھی نبی ﷺ کی اس سنت کو برقرار رکھنا ہے اور امت محمدیہ ﷺ کے اس فرض اولین کو ادا کرنا ہے۔

حضور ﷺ کی محبت ایک داعی کے دل میں ہو تا کہ وہ پوری محبت و خلوص کے ساتھ اس کارِ دعوت کو انجام دے سکے حضور ﷺ کی دنیا میں آمد کا مقصد ہی دعوت و تبلیغ تھا۔

i- To Liberate Man to Unite Man

II- To Educate Man and To Humanize Man

Iii- To Free from Social Discrimination

---

(۱) انسان کامل، ڈاکٹر خالد علوی، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۲۸۵

(۲) سورۃ احزاب: ۶/۳۳

(۳) آل عمران: ۳۱/۳

داعیان کرام کے لئے اسکار دعوت میں آپ ﷺ کا اسوہ قابل تقلید ہے۔ [۱]

اخلاص ودل سوزی:

خلوص دل سوزی اور خیر خواہی داعی کے وہ اوصاف یا اس کے ہتھیار ہیں جو مخاطب کے دل و ذہن میں اسے بلند مرتبہ عطا کرتے اور اس کی بات سننے پر آمادہ کرتے ہیں داعی حضرات فساد و بگاڑ کی اصلاح کا جو انداز اختیار کرتے ہیں اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ ان میں نفرت اور انتقام کی جگہ ایک معالج کی ہمدردی اور خیر خواہی واضح ہے وہ مخالفتوں کے طوفان میں گھبرانے اور چڑنے کے بجائے دعائیں دیتے ہیں [۲]

قرآن مجید نے انبیاء کے بارے میں یہ جملہ اکثر بیان کیا ہے۔

﴿إِنۡ أَجۡرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴾ [۳]

غزوہ احد میں حضور ﷺ کو لہولہان کیا جاتا ہے اور آپ ﷺ شدید ترین اذیت کے لمحات میں یوں دعا کرتے ہیں۔

((اللهم اغفر لقومی فانهم لايعلمون)) [۴]

اے میرے اللہ! میری قوم کو بخش دے یہ مجھے نہیں جانتے

تمام انبیاء کرام کے دعوتی عمل میں یہ پہلو نمایاں دکھائی دیتا ہے ان کے استدلال میں ان کی جذباتی و فطری اپیل میں اور عبرت آموز واقعات کے بیان میں ہر جگہ ایک ہی جذبہ ایک ہی روح اور ایک ہی خواہش نظر آتی ہے کہ مخاطب کس طرح انکی آواز سن لے اور اس کی صداقت کو مان لے۔ سب سے پہلی چیز اخلاص ہے اسکو ٹٹولتے رہنا چاہیے اور اخلاص ایسی چیز ہے کہ کسی بھی وقت میں جاکر اس سے مطمئن نہ ہونا بلکہ موت تک اس کی فکر کرتے رہنا ابن ابی ملیکہ ایک تابعی ہیں جو فرماتے ہیں کہ میں ۳۰ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ملا ہوں وہ سب کے سب اپنے اوپر نفاق سے ڈرتے تھے۔ [۵]

اخلاص کے ساتھ اگر دعوت کے کام میں لگے رہے تو ہمارے اس دعوت کے کام سے ایمانیات میں پختگی آئے گی عبادات میں جان پڑے گی معاملات درست ہونگے معاشرت صحیح اور پاکیزہ بنے گی اخلاق بلند ہونگے ہمارے معاملات ایسے ہوں گے کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ یہ تبلیغ والے ہیں یہ دعوت والے ہیں غرض یہ کہ اخلاص داعی کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ جس سے وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کرتا ہے۔

---

(۱) رسول اکرم ﷺ کا منہاج دعوت، ڈاکٹر خالد علوی، ص ۳۷

(۲) ایضاً

(۳) سورۃ الشعراء: ۲۶/ ۱۴۵

(۴) صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب غزوہ احد، رقم الحدیث: ۳۱۳۶

(۵) دعوت و تبلیغ کی محنت، ڈاکٹر محمد ظفر اقبال، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ص ۸۴

خوئے دل نوازی:

کوئی کارواں سے ٹوٹا، تو کوئی بدگماں حرم سے
کہ میر کارواں میں نہیں ہے خوئے دلنوازی (۱)
(اقبال)

سلف وصالحین یک اقوال واعمال سے اس خوئے دلنوازی کی تشریح کے سلسلے میں بہت کچھ مواد ملتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ راہ حق کی طرف دعوت دینے والے کا مزاج واخلاق ایسا ہونا چاہیے کہ وہ اپنی نرم مزاجی وخوش خلقی تہذیب وشائستگی حلم وعفو شفقت ومہربانی محبت اور ہمدردی سے دوسروں کے دلوں کو جیت سکے حق کی طرف بلانے والوں کے لئے ضروری ہے کہ ان کی زبان شریں نرم اور گفتگو شفیقانہ ہو۔ (۲)

ثابت نے حضرت انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ

((أَنَّ أَعْرَابِيًّا بَالَ فِي الْمَسْجِدِ فَقَامُوا إِلَيْهِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُزْرِمُوهُ ثُمَّ دَعَا بِدَلْوٍ مِنْ مَاءٍ فَصُبَّ عَلَيْهِ)) (۳)

ترجمہ: ایک اعرابی نے مسجد میں پیشاب کر دیا تو لوگ اسے مارنے کے لئے اٹھے چنانچہ رسول ﷺ نے فرمایا اس کے پیشاب کو نہ روکو پھر آپ ﷺ نے ایک ڈول پانی منگوایا اور اس پیشاب کے اوپر بہا دیا گیا۔

اخلاق انسانی رویوں میں سے اہم ترین ہیں دنیا کے سارے الہامی مذاہب کی بنیاد اخلاق پر ہے حضرت موسی علیہ السلام کے صحیفے میں سب سے زیادہ اہمیت احکام عشرہ کی ہے جو اخلاقی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔

دراصل لوگ داعی کی دعوت سے پہلے اس کے الفاظ کو دیکھتے ہیں اس کے لہجے کے اتار چڑھاو پر غور کرتے ہیں جب سختی سے بات کی جائے تو بات کیسی بھی سچی ہو لیکن سننے والے پر اسکا الٹا اثر پڑتا ہے اور لوگ دین اسلام سے متنفر ہونے لگتے ہیں کفار نے حضور ﷺ پر سختیوں اور مصیبتوں کے پہاڑ توڑ ڈالے آپ ﷺ کو ہر طرح سے ستایا گیا لیکن کبھی کوئی سخت بات آپ ﷺ کی زبان مبارک تک نہ آسکی۔ قرآن پاک میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے۔

﴿وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ﴾ (۴)

---

(۱) بال جبرائیل، علامہ اقبال، ص ۲۷۲

(۲) داعی کے اوصاف، بنت اسلام، ادارہ بتول، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۶۳

(۳) صحیح بخاری شریف، حدیث نمبر: ۶۰۲۵

(۴) سورۃ آل عمران: ۳/۱۵۹

ترجمہ: جو کہیں تم تند خو اور سخت قلب ہوتے تو سب کے سب تمہارے پاس سے بھاگ جاتے ۔

یہ حضور ﷺ کی نرم مزاجی اور ان کا اخلاق تھا جس نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں انقلاب برپا کر دیا اور وحشی عربوں کو ایک متمدن و مہذب قوم بنا دیا۔

داعی حق کو چاہیے کہ وہ مخاطب کی ترش روئی اور بدسلوکی کا جواب بھی شیریں کلامی سے دیں کیونکہ ایک داعی کے لئے دلوں کے اندر راہ پانے کا بھی یہی ایک طریقہ ہے۔

داعی حق کو چاہیے کہ وہ اپنے کلام کو ہر اس چیز سے پاک رکھے جو مخاطب کے اندر ضد اور مخالفت کا جذبہ پیدا کرے کیونکہ یہ چیز ان کے مقصد کے برخلاف ہے مثلاً مخاطب سے گفتگو کے وقت نہ تو اپنی برتری کا اظہار کریں نہ اس کی غلط زندگی پر باانداز استخفاف تنقید کریں گے بلکہ جو کچھ کہیں گے نرمی اور ہمدردی کے ساتھ کہیں گے۔

مزج کی نرمی اور شفقت آمیزی اگرچہ بظاہر ایک صفت ہے لیکن یہ اتنی زبردست صفت ہے کہ اس کے لازمی نتیجے کے طور پر دوسری بہت سی صفات بھی پیدا ہو جاتی ہیں مزاج کی سختی اور تشدد بظاہر ایک خرابی ہے لیکن اتنی بڑی خرابی ہے یہ بڑی بڑی نیکیوں کے اثرات کو زائل کر دیتی ہے اس کی وجہ سے دوستی قرابت اور اپنائیت کا دروازہ بند ہو جاتا ہے دنیا کے دوسرے کام تو ممکن ہیں کہ تشدد جذباتیت اور بے جا سختی کے ساتھ ہو جاتے ہیں لیکن دین کی اشاعت اور دعوت کا کام تشدد اور سختی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ (۱)

اس لئے داعیان کرام کو چاہیے اپنے اندر نرمی کی صفت پیدا کریں کیونکہ اسی صفت کے ذریعہ سرکش ذہنوں کو دعوت حق کی طرف موڑا جا سکتا ہے اگر نرمی کی صفت داعیان کرام اپنے اندر پیدا نہ کریں تو وہ یقین رکھیں کہ سخت بیانی کا تازیانہ لوگوں کو دین سے برگشتہ کر دے گا اور تشدد کی راہ پر گامزن کر دے گا۔

داعیان کرام کو چاہیے کہ وہ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد ﷺ کے اسالیب دعوت کو مد نظر رکھیں کہ کس طرح انہوں نے دشمنوں کی مخالفت کے باوجود سختی سے گریز کیا اور نرم زبان میں دعوت کا حق ادا کر دیا دور حاضر میں علمائے کرام اپنے مسالک کو صحیح ثابت کرنے کے لئے دوسروں پر کفر کے فتوے لگاتے ہیں اور دوسرے کی تحقیر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ دعوت دین کی خدمت کا کام سر انجام دے رہیں ہیں لہذا ان حضرات کو انبیاء کے طرز دعوت سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے تاکہ لوگوں میں دین اسلام کو جاننے اور اس پر عمل کرنے کا شوق اور جذبہ پیدا ہو۔

دعوت و تبلیغ کے اس کام میں داعی حضرات کو اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کے اسالیب دعوت کو مد نظر رکھنا چاہیے کہ کیسے انہوں نے ہر طرح کی مصیبتیں برداشت کیں لیکن پھر بھی کوئی سخت الفاظ زبان پر نہ لائے۔

---

(۱) داعی اور دعوت کا کام، محمد موسی بھٹو، سندھ نیشنل اکیڈمی، حیدر آباد ۱۹۹۱ء، ص ۶۹

صفت صدق وسچائی:

قرآن کریم کی متعدد آیات میں سچ بولنے کے فضائل بیان کئے گئے ہیں اور اس کی تاکید کی گئی ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے۔

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَكُونُواْ مَعَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴾[1]

ترجمہ: اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

وثوق واعتماد اور حقیقت کو تسلیم کرانے میں سچائی بہت اہم ہے صدق داعی کی ایسی صفت ہے کہ اس کے ذریعے اپنی دعوت کی حقیقت و صداقت میں اعتماد دلایا جاسکتا ہے۔سچائی وصف ہے جس کے ذریعے داعی مختلف دلوں کو متحد کرلیتا ہے اور اس کی بدولت انسان کا مزاج اس قدر ٹھوس اور مضبوط ہو جاتا ہے کہ وہ سخت ترین حالات کا مقابلہ کرنے میں بھی دشواری محسوس نہیں کرتا۔

صدق کی دو اقسام ہیں (۱) صدق مقال (۲) صدق اعمال

صدق مقال یہ ہے کہ ہر بات حق وثواب کی جائے اور کبھی غلط اور باطل بات زبان پر نہ آئے اور صدق اعمال ہے کہ شریعت کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق اور احکام الٰہی کے موافق زندگی گزارے اور اسوہ رسول کی پوری پوری اتباع کرے۔[2]

حضور ﷺ کی سچائی کی گواہی ان کے بدترین دشمن بھی دیتے تھے حضور ﷺ نے جھوٹ کو منافق کی نشانی قرار دیا۔[3]

((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلٰثٌ اِذَا حَدَثَ كَذِبَ وَ اِذَا وَعَدَ خَلَفَ وَ اِذَا أوتُمِنَ خَانَ))

ترجمہ: (حضور ﷺ نے فرمایا) منافق کی تین نشانیاں ہیں بات کرے تو جھوٹ بولے گا وعدہ کرلے تو خلاف ورزی کرے گا اور امانت اس کے پاس رکھی جائے تو خیانت کرے گا۔

اللہ کی طرف بلانے والوں کی زبان سے اپنے دنیاوی معاملات میں بھی جھوٹ کا نکلنا لوگوں کو دین سے متنفر کردیتا ہے اور یوں ان لوگوں کی دین سے دوری کا گناہ بھی داعی کے سر ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں داعی کے چہرے پر صدق کا نور ہوتا ہے اور اس کے لہجے کی صداقت مخاطب کو متاثر کرتی ہے اور اسے اسی بات کے قبول کرنے پر مجبور کردیتی ہے صدق کی صفت دعوت حق کی طرف بلانے والوں کے لئے ناگزیر ہے کیونکہ ایمان کی اساس ہی صدق ہے۔جھوٹا شخص داعی الی اللہ نہیں ہوسکتا نہ اس کی دعوت میں کوئی تاثیر ہوگی اولوالعزم انبیاء

---

(۱) سورۃ التوبہ: ۹/۱۱۹

(۲) اصول دعوت دین، عبدالکریم زیدان، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ص ۶۹

(۳) صحیح بخاری شریف، حدیث: ۱۱۸۰

نے ساری زندگی سچائی کو ہر قدم پر مقدم رکھا یہاں تک کہ حضور ﷺ کے صادق ہونے کا اعتراف ان کے دشمن بھی کرتے اور یہی وہ آپ ﷺ کی خوبی تھی جس نے لوگوں کے دلوں پر لگے ہوئے کفر وشرک کے زنگ کو دھو دیا۔

صفت صبر واستقامت:

صفت صبر واستقامت مومنین کی سب سے اہم صفت ہے یہی وہ صفت ہے جس سے دعوت و تبلیغ کی کامیابی جڑی ہے یہی اولوالعزم انبیاء کی کامیابی کا اصول ہے۔

سورہ الشوریٰ کی آیت ۴۳ میں ارشاد الٰہی ہے :

﴿وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ ٱلْأُمُورِ﴾(۱)

ترجمہ: البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے تو یہ بڑے اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔

سورہ البقرہ آیت ۱۵۳ میں ارشاد ہوا۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱسْتَعِينُوا۟ بِٱلصَّبْرِ وَٱلصَّلَوٰةِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ﴾(۲)

اے ایمان والو، صبر اور نماز سے مدد لو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

قرآن پاک کی بے شمار آیات میں صبر کا حکم دیا گیا ہے دین حق اپنے داعیوں سے متواتر صبر واستقامت کا طلبگار ہے تبلیغ دین میں نتائج نکلتے نظر آئیں یا نہ آئیں اور فتح ہو یا شکست کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو۔صبر واستقامت کی ضرورت ہر حال میں موجود رہتی ہے۔ شکست کے وقت صبر یہ ہے کہ انسان دل شکستگی سے بچے اور ناامید ہو کر کہیں بے عمل ہی نہ ہو جائے اور فتح کے وقت صبر یہ ہے کہ اپنی کامیابیوں پر پھول کر فخر کا شکار نہ ہو اور عوام میں ہر دلعزیزی اور اقتدار حاصل ہونے کے بعد اپنے مقصد ہی کو نہ بھلا بیٹھے (۳)

دنیا کا کوئی بھی کام صبر واستقامت کے بغیر پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا خصوصاً دین کا کام اس کے بغیر ممکن نہیں ہے اس لئے داعی کو چاہیے کہ اپنی دعوت پر ہونے والے اعتراضات اور دعوت کے دوران پیش مصائب پر صبر کرنے والا ہو صبر کا مطلب یہ ہے کہ دعوت کے کام میں ہمیشگی اختیار کرے اسے منقطع نہ ہونے دے اور نہ ہی اپنے دعوتی مشن سے اکتاہٹ محسوس کرے۔

---

(۱)سورۃ الشوریٰ:۴۲/۴۳

(۲)سورۃ البقرہ:۲/۱۵۳

(۳)داعی کے اوصاف، بنت اسلام، ص۱۲۳

سورہ عصر میں مومنانہ زندگی کی جو چار چیزیں بطور شرط بیان ہوئی ہیں ان کی آخری چیز ہی صبر کی تلقین ہے کہ مومن تبلیغ و اشاعت دین کی راہ میں قدم قدم پر جو مزاحمتیں پیش آئیں گی مومن ہر جگہ صبر سے خدا کی خاطر برداشت کرتا جائے خدا آخرت میں اس "صبر" کو بطور خاص انعام سے نوازے گا (۱)

حضور ﷺ کے اخلاق و اوصاف میں صبر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے آپ ﷺ نے جن حالات میں دعوت کا کام کیا اور اس طرح مشکلات برداشت کیں وہ اپنی مثال آپ ہیں یہ صبر کی صفت تھی کہ آپ ﷺ نے کفار کی دست درازیوں کو براداشت کیا۔(۲)

دعوت و تبلیغ کا کام صبر و تحمل اور مثبت انداز فکر کا متقاضی ہے طائف کا واقعہ عفو و درگزر اور مثبت طرز فکر کا بے مثال نمونہ ہے ایک ایسے موقع پر جب مخالفین نے حضور ﷺ پر ظلم و ستم اور تضحیک و توہین کی انتہا کر دی آپ ﷺ نے پھر بھی کسی کو برا بھلا نہیں کہا اور نہ ہی بد دعا کی اور ایسے مایوس کن حالات میں بھی شمع امید جلائی رکھی کہ آج اگر یہ نہیں تو ان کی آنے والی نسلیں اسلام قبول کریں گی دعوت و تبلیغ کے دوران مخاطب کی اشتعال انگیزیوں پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا بھی ضروری ہے داعی اگر صبر اعراض کا طریقہ اختیار کرے تو تلخیوں کو گھٹائے گا تو وہ اس معتدل فضا کو باقی رکھے گا جس میں دعوتی عمل جاری ہوتا ہے یہ صبر بے حد مشکل کام ہے یہ تمام قربانیوں میں سب سے بڑی قربانی ہے اس صبر پر قائم رہنے کے لئے بہت زیادہ اولو العزمی کی ضرورت ہوتی ہے صرف بلند فطرت لوگ ہی اس صبر پر قائم رہ سکتے ہیں اس صبر کے بغیر دعوت و تبلیغ کا کام نہیں ہو سکتا صبر سب سے بڑا عمل ہے تمام عبادتوں میں سب سے بڑی عبادت ہے۔ (۳)

صبر سیرت مقدسہ کا وہ عظیم الشان پہلو ہے جو تمام داعیان اسلام کے لئے نہایت بلند پایہ نمونہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہر قسم کا ظلم تشدد برداشت کیا جائے حضور ﷺ کا اسوہ داعیان کرام کے لئے ایک عظیم مثال ہے لوگوں کے دعوت قبول نہ کرنے پر صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے لوگوں کے قبول ہدایت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے داعی صفت صبر کے بغیر نامکمل ہے داعی کا صبر دعوت و تبلیغ کی راہ میں کامیابی کی کلید ہے۔

کہ اسلام کا یہ ایک پھل انسانیت کے لئے یہ رہا ہے کہ اس نے لوگوں میں شدید اور مشتعل صبر پیدا کیا اور صبر کی یہ کیفیت ان میں اللہ کی کامل اطاعت سے پیدا ہوئی۔

---

(۱) مطالعہ اسلامی تہذیب، ارشد بھٹی، مصباح الادب چوک، ص ۲۶

(۲) انسان کامل، ڈاکٹر خالد علوی، الفیصل ناشران، لاہور، ص ۶۳۷

(۳) دعوت حق، مولانا وحید الدین خان، دار التذکیر، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۳۱

One of the fruits of Islam has been thief stubborn durable patience which comes of the submission to the absolute will of ALLAH.(1)

داعی دعوت و تبلیغ میں بغیر صفت صبر کے کامیابی حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ جس آدمی کے اندر صبر کی صفت ہو اس کے اندر تمام صفات ہوں گی اور جس آدمی کے اندر صبر کی صفت نہ ہو وہ تمام صفات کمال سے محروم ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے دنیاو آخرت کی تمام کامیابیاں صبر میں رکھ دی ہیں چند آیات کا حوالہ یہ ہے۔

صبر پر جنت	الدھر ۱۲
صبر پر فوز و فلاح	المومنون ۱۱۰
صبر پر غلبہ	الانفال ۶۵
صبر پر امامت	السجدہ ۲۴
صبر پر حفاظت	آل عمرٰن ۱۲۰

عفوودرگزر داعی کا ہتھیار:

عفوودرگزر داعی کا ہتھیار ہے اور یہ وہ ہتھیار ہے جو جسموں کو نہیں دلوں کو مسخر کرتا ہے۔ اور دل مسخر ہو جائیں تو قومیں مسخر ہو جاتی ہیں۔

((وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ "ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ" الصَّبْرُ عِنْدَ الْغَضَبِ وَالْعَفْوُ عِنْدَ الْإِسَاءَةِ فَإِذَا فَعَلُوهُ عَصَمَهُمُ اللَّهُ وَخَضَعَ لَهُمْ عَدُوُّهُمْ "كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ"))(۲)

حضرت عبد اللہ بن عباس ادفع بالتی ھی احسن کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ داعی دعوت کا کام کرنے والے کو صابر اور بردبار ہونا چاہیے لوگ اکثر ضد دلانے والی حرکات پر اتر آئیں تو ایسے موقع پر غصے کا جواب غصے میں نہیں دینا چاہیے غصہ آئے تو تھوک دینا چاہیے اور ایسا کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے گا اور دشمن ان کے سامنے جھک جائے گا وہ گہرا دوست اور پرجوش حامی بن جائے گا۔

عفوودرگزر ایک ایسی خوبی ہے کہ مخالفین کے دلوں کو تبدیل کر کے رکھ دیتی ہے۔ داعی کے حق میں نرم کر دیتی ہے اس کی بات سننے پر آمادہ کرتی ہے۔(۳)

حضور ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر عفوودرگزر کی ایسی مثال قائم کی کہ رہتی دنیا تک ایسی مثال نہ مل سکے گی عفوودرگزر انسانی زندگی کا اہم پہلو ہے جس کے بغیر بقاء حیات اور استحکام اجتماع ممکن ہی نہیں عفوودرگزر انسانی شخصیت کی وسعت

---

(۱) دین انسانیت، مولانا وحید الدین خان، دار التذکیر، لاہور، س ن، ص ۶۱

(۲) صحیح بخاری، ۱۵۳

(۳) خلق عظیم، پروفیسر ڈاکٹر خالد علوی، الفیصل ناشران و تاجران، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۳۶

اور اس کی انسانیت کی توسیع ہے عفو ودر گزر نہ ہو تو انسانیت گھٹ کر مر جائے اور ہر طرف خونخواری اور حیوانیت کا دور دورہ ہو عفو ودر گزر لطافت ورحمت کا اظہار ہے جس سے انسانیت پہچانی جاتی ہے انسان کی اس اخلاقی صفت کا منبع ومصدر بھی صفت رب ہے۔[1]

اگر کوئی واقعتاً اللہ کی رضا کے لئے لوگوں کو پیغام حق پہنچاتا ہے تو اسے مصائب و آلام اور تکالیف و دکھوں سے عفوو در گزر کرنا درحقیقت اس کی سنجیدگی کا امتحان ہے حضور ﷺ کی حیات مقدسہ عفوودر گزر کا مثالی نمونہ ہے۔ مبلغ کا مزاج عفوو در گزر کا اعلیٰ نمونہ ہونا چاہیے عفوودر گزر کشادہ دلی اور وسعت نظری کی دلیل ہے ایک شخص جب دعوت الی اللہ کا علمبر دار بن کر کھڑا ہوتا ہے تو خود کو اللہ کی مقرر کردہ حدود و قیود میں بندھا محسوس کرتا ہے جبکہ مدعو ہر طریقے سے آزاد ہے جو طریقہ چاہے اپنی کامیابی کے لئے اختیار کرے داعی گھبراجائے یا بدلہ لینے پر آجائے تو یہ بات مشتبہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی دعوت میں سنجیدہ ہے۔ فتح مکہ کا واقعہ تاریخ انسانی کا سب سے بڑا پرامن انقلاب ہے لیکن جب مکہ فتح ہوا آپ ﷺ نے عفوودر گزر کو اس کی معراج تک پہنچایا اور فرمایا جاؤ" آج کے دن تم سے کوئی باز پرس نہیں تم سب آزاد ہو"۔

عفوودر گزر کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے۔

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾[2]

ترجمہ: ان کے قصور معاف کرو ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو اور دن کے کاموں میں ان کو شریک مشورہ رکھو۔

عفوودر گزر اسوہ پیغمبر ہے آج کل کے مبلغین عفوودر گزر کے پیغمبرانہ اسوہ کو چھوڑ دیا ہے اس لئے ان کی تبلیغ بے اثر ہو کر رہ گئی تقریر و خطابت میں غصے کا اظہار مخالف پر فقرے کرنا بڑا کمال جانا جاتا ہے جو مخالف کو اور زیادہ ضد کی طرف دھکیل دیتا

صفت قوت بیاں:

مخاطب اور دعوت کی بات پہنچانے میں طرز کلام کو خاص اہمیت ہے دعوت و تبلیغ کے ضمن میں کلام ایسے طریقے سے کیا جائے جس سے حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے لوگوں کو سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو اور اپنی بات نہایت خوبصورت طریقے پر کی جائے تاکہ لوگ دعوت کی طرف متوجہ ہوں اسے سنے اور قبول کریں۔

دین کی تبلیغ و دعوت میں دیگر وسائل کی نسبت تحریر و تقریر کو خاص اہمیت حاصل ہے خطابت اور بیان کے ذریعے انسان اپنے نقطہ نگاہ سے دوسروں کو آگاہ کرتا ہے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر انکی ضرورت ظاہر ہوتی ہے مثلاً حضرت

---

(۱) دعوت و تبلیغ کی محنت، ڈاکٹر ظفر اقبال، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ۲/ ۱۷۳

(۲) سورۃ آل عمران: ۳/ ۱۵۹

(۳) تبلیغ بالیقین کار نبوت ہے، مولانا حافظ فضل رحیم، ص ۴۱۵

موسیؑ نے اپنی زبان کی فصاحت و بیان کے لئے سوال کیا اور اپنے بھائی کے حق میں نبوت کے عظیم فرض کی سفارش اسی وجہ سے کی۔

﴿وَأَخِي هَارُونُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِي﴾[1]

میرے بھائی کو میرا مددگار بنادے وہ مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ کی فصاحت زبانی کو علت بنایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر اپنے احسانات جتلاتے ہوئے بیان کی صلاحیت کا ذکر کیا ہے۔

﴿الرَّحْمَٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ○ خَلَقَ الْإِنسَانَ ○ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾[2]

ترجمہ: رحمن نے قرآن کی تعلیم دی اس نے انسان کو پیدا کیا پھر اس کو قوت گویائی سکھائی۔

اچھی گفتگو کرنا اچھے طریقے سے اپنا مقصد بیان کرنا انسانوں کی ایک اعلیٰ خصوصیت ہے اور اس صفت کی اہمیت داعیان کرام کے لئے توبدرجہ اتم ہے کیونکہ دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں حسن افہام بھی ایک اہم حکمت عملی ہے کہ داعی حق اپنا پیغام اس خوبصورتی اور صفائی وضاحت کے ساتھ پیش کرے کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گفتگو نہ اتنی مختصر ہو کہ موضوع تشنہ رہ جائے اور نہ اتنی طویل ہو کہ سامع اکتا جائے، انداز مناسب دلائل ناقابل تردید ہوں مخاطب کے ذہنی سطح کے عین مطابق ہوں فصیح و بلیغ الفاظ پر مشتمل ہوں ان خصوصیات کی حامل گفتگو ہی داعی کا خصوصی وصف ہے قرآن مجید اس کی وضاحت کرتا ہے

﴿وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا﴾[3]

ترجمہ: اور ایسی بات کہو جو ان کے دل میں اتر جائے۔

حکمت تبلیغ کے لئے اہم بات جسے ہمیشہ داعی حضرات کو مد نظر رکھنا چاہیے وہ یہ کہ دعوت کا فریضہ ادا کرتے وقت مخاطب کی ذہنی سطح اور استعداد کے مطابق گفتگو کی جائے عام مخاطب کی ذہنی استعداد کو ملحوظ نہ رکھتے ہوئے منطقی استدلال اور فلسفیانہ بحث شروع کر دی جائے یا کسی دانشور سے گفتگو کرتے ہوئے بے رنگ اور بے ڈھب انداز گفتگو اختیار نہ کیا جائے بلکہ لوگوں سے ان کی ذہنی استعداد کے مطابق بات کی جائے۔

مفکر اسلام لکھتے ہیں:

---

(۱) سورۃ القصص: ۲۸/ ۳۴

(۲) سورۃ الرحمٰن: ۵۵/ ۱، ۴

(۳) سورۃ النساء: ۴/ ۶۳

دعوت کے کام میں حاضر کلامی اور حاضر دماغی دونوں کی اشد ضرورت ہے مزید یہ کہ دعوت تبلیغ کے مقدس عمل سے وابستہ افراد کو انسانی نفسیات کی واقفیت ہو تاکہ وہ جو اسلوب اختیار کرنا چاہے اور جس انداز میں دعوت دینی ہے اس کے حدود و ضوابط قوانین اور مرکزی خطوط سے واقف ہونا ضروری ہے۔[1]

یوں تو داعی کے اوصاف ان گنت ہیں اور ان کے کرنے والے کام اس بھی زیادہ ہیں مگر داعی کے اوصاف میں سب سے زیادہ مروج اور موثر تقاریر اور وعظ و نصیحت ہے جو حد درجہ سستا اور عوامی تقاضوں کا مظہر ہے۔

اپنی بات کسی کے دل میں اتارنے کا فن ایک داعی کو ضرور حاصل ہونا چاہیے کیونکہ اس کے ذریعے اپنے مدعا اور مقصد تک رسائی حاصل ہوتی ہے زبان و تحریر میں اعتدال شائستگی اور حقیقت پسندی ہو تو بڑے بڑے انقلاب رونما ہو جاتے ہیں سوئی ہوئی انسانیت جاگ جاتی ہے پژمردہ زندگی میں روح پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر ستم یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ میں تشدد کرختگی اور دینی انتہاپسندی شرعی مزاج اور منشاء کو مجروح کر کے رکھ دیتی ہے۔[2]

اعلیٰ سیرت و کردار:

حضرت علی ہجویری[3] فرماتے ہیں: جو شخص خدا کے احکامات کو مخلوق تک پہنچانے کا فرض اپنے ذمہ لے اسے سنت کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔[4]

اگر ہم نے بنی نوع انسان کو اس طرف مائل کرنا ہے کہ آخری نبی ﷺ کے لائے ہوئے دین کو مانیں تو پھر لازمی ہے کہ ہم خود اپنی زندگیوں کو اس عالی وقار نبی کریم ﷺ کی سنت کے مطابق ڈھالیں ورنہ ہماری تبلیغ بے اثر رہے گی سورۃ الصف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفۡعَلُونَ﴾[5]

اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو خدا کے نزدیک یہ بات بہت ناراضگی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔

---

(۱) تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب، ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد، کراچی، س ن، ص ۱۲

(۲) داعی اور دعوت کا انداز، عبدالمجید بھکروی، بیت الحکمت، لاہور، س ن، ص ۲۱۴

(۳) حضرت علی ہجویری کا نام علی تھا۔ ہجویر کے رہنے والے تھے۔ اس لیے ہجویری کہلائے۔ ۱۰۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ تمام زندگی دین اسلام کی تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ نے تصوف و طریقت پر کئی کتابیں لکھیں جن میں سے کشت الاسرار، کشف المحجوب اسلامی تصوف میں سند مانی جاتیں ہیں۔ ۱۰۷۲ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ (تاریخ اسلام، محمد عبداللہ صدیقی، ایور نیو بک پیلس، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۹۹)

(۴) داعی کے اوصاف، بنت اسلام، ص ۳۳

(۵) سورۃ الصف: ۶۱ / ۲

داعی حضرات چونکہ دوسروں کے لئے نمونہ عمل ہوتے ہیں لہذا ان میں اعلی اخلاقی اقدار کا ہونا ضروری ہے لازم ہے کہ راہ حق میں کام کرنے والے اپنے اخلاق میں برتاؤ میں معاشرت میں اور تمدن میں معشیت وسیاست میں غرض زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کی ہدایت کو حرف آخر تسلیم کر لیں اور ہر اس طریقے اور ضابطے کو رد کر دیں جو اللہ کی شریعت کے خلاف ہو اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کی ہدایت قرآن اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کو محبت کے طور پر تسلیم کریں اور جو اسکے خلاف ہو اسے ترک کر دیں اور جو مسئلہ بھی حل طلب ہو اسے حل کرنے کے لئے اسی سرچشمہ ہدایت کی طرف رجوع کریں۔ داعی کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو مکمل طور پر اسلام کے خدوخال کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔

اللہ کے دین کو سربلند کرنے اور اسلامی تحریک کو لے کر آگے بڑھنے والے وہ لوگ ہرگز نہیں ہو سکتے جو اپنی ذاتی اصلاح سے غافل ہوں اور اسے غیر ضروری سمجھتے ہوں اللہ کے سپاہی کو سب سے پہلے اپنی ٹریننگ کی فکر کرنی چاہیے۔[1]

دعوت الی اللہ کا سب سے مفید موثر اور پرکشش ذریعہ خود داعی حق کی شخصیت اس کے افعال اس کی سیرت عالیہ اور اسکے اخلاق حسنہ ہیں اور داعی کی ایسی عمدہ مثالی سیرت ہے جو لوگوں کے لئے نمونہ ہو اور کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہو جس سے لوگ اسلام کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔

عملیت سے مقصود یہ ہے کہ شارع دین اور بانی مذہب جس تعلیم کو پیش کر رہا ہو خود اس کا ذاتی عمل اس کی مثال اور نمونہ ہو اور خود اس کے عمل نے اس کی تعلیم کو قابل عمل ثابت کیا ہو خوش کن سے خوش کن فلسفہ دلچسپ نظریہ اور خوش آئندہ اقوال ہر شخص ہر وقت پیش کر سکتا ہے لیکن جو چیز ہر وقت نہیں پیش کر سکتا وہ عمل ہے انسانی سیرت کے بہتر اور کامل ہونے کی دلیل اس کے نیک اور معصوم اقوال وخیالات اخلاقی وفلسفی نظریات نہیں بلکہ اسکے اعمال اور کارنامے ہیں اگر یہ معیار قائم نہ کیا جائے تو اچھے اور برے کی تمیز اٹھ جائے اور دنیا صرف باتیں بنانے والوں کا مسکن رہ جائے۔[2]

علم نفسیات سے واقفیت:

مبلغ اعظم حضور ﷺ دعوت و تبلیغ میں اپنے مخاطبین کے مزاج اور نفسیات کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے جذبات کا بھی خیال رکھتے تھے اگر جذبات میں اشتعال محسوس کرتے تو کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالتے اور نہ عملاً کوئی ایسی روش اختیار کرتے جس سے جذبات بے قابو ہو جائیں بلکہ آپ ﷺ مخاطبین کے جذبات واحساسات اور عزت نفس کا اس قدر خیال رکھتے کہ ان میں سے ہر شخص یہ سمجھتا کہ حضور ﷺ سب سے زیادہ مجھ پر مہربان ہیں۔

---

(۱) دین کی خدمت، ابو سلیم محمد عبد الحی، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۱۲۱

(۲) خطبات مدراس، سید سلیمان ندوی، زمزمہ پبلشرز، لاہور، ص ۵۳

داعی حضرات کو علم نفسیات سے آگاہی ہونا چاہیے کہ وہ اپنے مخاطبین کی سمجھ اور عقل اور حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے دعوت کا فریضہ سر انجام دیں سکیں اولوالعزم انبیاء کی خدمات سے کچھ اہم نفسیاتی اصول اخذ کئے گئے ہیں اگر ایک داعی ان کو مد نظر رکھے گا تو بہت جلد اور وہ اپنے طریق دعوت کو انبیاء کے طریق دعوت سے متشابہ بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اہم اصول یہ ہیں:

۱۔ایک ہی چیز کے مختلف پہلو ہوا کرتے ہیں بعض اعتبار سے وہ آسان ہوتے ہیں اور بعض اعتبار سے مشکل داعی پہلے بات کے آسان پہلو کو پیش کرے۔

۲۔نفسیاتی نقطہ نظر سے دوسری اہم بات یہ ہے کہ داعی حضرات اپنی دعوت و تبلیغ میں کسی حال میں اپنے مخاطب کے اندر حمیت جاہلیت کے بھڑکنے کا موقع نہ پیدا ہونے دے اصلاح کا مناسب طریقہ اختیار کریں تعصب نہ پیدا ہونے دیں۔

۳۔ایک داعی حق کو اپنے گردو پیش کا پوری ہوشیاری اور متعدی سے جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ دعوت کے تخم ریزی کا کب کوئی موقع ہاتھ آتا ہے جیسا کہ قصہ یوسف میں اس اہم اصول کی نشان دہی کی گئی ہے۔[1]

﴿يَٰصَٰحِبَيِ ٱلسِّجۡنِ ءَأَرۡبَابٞ مُّتَفَرِّقُونَ خَيۡرٌ أَمِ ٱللَّهُ ٱلۡوَٰحِدُ ٱلۡقَهَّارُ﴾[2]

ترجمہ:اے میرے قید کے ساتھیو!ذرا سوچو کیا متفرق رب بہتر ہے یا ایک ہی اللہ جو سب پر غالب ہے۔

تیسر القرآن میں آیت مبارکہ کی تفسیر میں ہے:

۴۔ تبلیغ کا سب سے بہترین موقع وہ ہوتا ہے جب سننے والا خود بات سننے پر خواہش مند ہو یہ قیدی اپنے خواب کی تعبیر بہر حال سننا ہی چاہتے تھے سیدنا یوسف علیہ السلام اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور پہلے انہیں اصول دین سمجھانے شروع کئے اگر آپ علیہ السلام انہیں پہلے خواب کی تعبیر بتا دیتے تو وہ شاید آپ علیہ السلام کی بات سننے میں دلچسپی نہ لیتے حضرت یوسف علیہ السلام نے اس موقع کو جان کر فائدہ اٹھایا اور تبلیغ کا حق ادا کیا یہ دونوں قیدی چونکہ پہلے ملازم تھے اس لئے انہیں ان کے حسب حال دلیل پیش کی اور انہیں اس بات کی باخوبی سمجھ آسکتی تھی کہ بہت سے آقاؤں سے ایک آقا کی غلامی بہر حال بہتر ہوتی ہے بالخصوص اس صورت میں جب آقا بھی ایسا ہو جو سب سے بڑھ کر طاقت ور اور غالب ہو۔[3]

داعی حق کو چاہیے اگر مخاطب کے اندر عناد اور ہٹ دھرمی محسوس کرے تو اپنی طرف سے اسے ہرگز یہ موقع نہ دے کہ یہ مرض مزید ابھرے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب نمرود سے مناظرہ کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام علیہ السلام نے جو دلیل پیش کی کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے وہ معترض کے معارضہ سے ذرا بھی مجروح نہیں ہوتی تھی

---

(۱)دین کی خدمت، ص۱۲۸

(۲)سورہ یوسف:۱۲/ ۳۹

(۳)تیسر القران، مولانا عبد الرحمن کیلانی،، ص ۲/ ۳۹۳

وہ چاہتے تو اس پر بہت کچھ فرما سکتے تھے لیکن مخاطب کی نفسیات کو دیکھتے ہوئے اگر وہ اس پر مزید اصرار کرتے تو چیز اس طریقے کے خلاف ہوتی جس کی تلقین قرآن نے کی چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کی نفسیات کو دیکھتے ہوئے اس پر بات ختم کر دی۔

﴿قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ﴾ (۱)

ترجمہ: حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال کے دیکھا۔

جس پر وہ کافی حیران و پریشان رہ گیا کیونکہ آپ علیہ السلام نے انسانی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے پر اثر دلیل پیش کی جس نے کفر کو شرمندہ اور باطل کر دیا اور اہل دربار کے سوچنے کے لئے ایک نئی راہ کھول دی۔

جیسا کہ سورہ طہ میں حضرت موسیٰؑ کو ہدایت ہے۔

﴿اذْهَبَا إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَى ٥ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَيِّنًا لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَى﴾ (۲)

ترجمہ: تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ بے شک وہ بہت سرکش ہو گیا ہے پس اس کو نرمی سے دعوت دو شاید وہ یاد دہانی حاصل کرے۔

آیت مبارکہ کی تفسیر میں مفتی محمد شفیع رقمطراز ہیں فرعون خدائی کا دعویدار جبار اور ظالم ہے جو اپنی حفاظت کے لئے بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کا مجرم ہے اس کی طرف بھی اللہ نے اپنے خاص پیغمبروں کو بھیجا تو نرمی سے بات کرنے کی تاکید کی تاکہ اُسے غور و فکر کا موقع ملے۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ اپنی سرکشی اور گمراہی سے باز نہیں آنے والا مگر اپنے پیغمبر کو دعوت کے اس اہم اصول کا پابند کر دیا تھا کہ جس کے ذریعے خلق خدا سوچنے پر مجبور ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے خوف کی طرف آجائے کہ فرعون کو ہدایت ہو یا نہ ہو مگر اصول وہ ہونا چاہیے جو ہدایت و اصلاح کا ذریعہ ہو۔

آج کل جو بہت سے اہل علم حضرات اپنے اختلافات میں زبان درازی اور الزام تراشی کو اسلام کی خدمت سمجھ بیٹھے ہیں انہیں اس پر غور کرنا چاہیے۔ (۳)

داعی حضرات کوشش کریں کہ وہ مختلف علاقائی اور قومی زبانوں سے آگاہ ہوں تاکہ جس علاقے میں وہ دعوت کا کام کریں وہاں کے رہنے والوں کو مقامی زبان میں دعوت دیں کیونکہ انسانی نفسیات کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ انسان فطری طور پر اپنے ہم زبانوں سے زیادہ انسیت محسوس کرتا ہے نیز ان کی بات کو سن سکتا ہے اپنی بات سمجھا سکتا ہے اور ہم زبانوں کی طرف

---

(۱) سورہ البقرہ: ۲/ ۲۵۸

(۲) سورۃ طہ: ۲۰/ ۴۴،۴۳

(۳) معارف القرآن، مفتی محمد شفیع، ادارہ المعارف، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۱۰

دل متوجہ ہوتے ہیں اور اگر دل متوجہ ہو جائے تو پھر دعوت کی راہ میں کوئی مشکل حائل نہیں رہتی خود حضور ﷺ نے داعی صحابہ کو غیر ملکی زبانیں سیکھنی کی ترغیب دی تھی۔

جدید عصری علوم سے واقفیت:

دور حاضر میں دنیا گلوبل ویلج بن چکی ہے آج شیطان اور اس کے چیلے مختلف جدید ذرائع ابلاغ سے استفادہ کرتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کو صفہ ہستی سے مٹادینے کے درپے ہیں اور مسلمان جدید ذرائع کے استعمال کو اول تو گناہ مانتے ہیں اور اگر کچھ حضرات اس کو مانتے بھی ہیں تو انہیں ان کے استعمال سے واقفیت حاصل نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ عصری تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے موجودہ دور میں داعیان کرام کو چاہیے کہ وہ اپنی سوچ اور فکر نظر میں وسعت پیدا کریں اور جدید عصری علوم سے واقفیت حاصل کریں۔

اولو العزم انبیاء کرام کے طریق دعوت سے عیاں ہوتا ہے کہ آپ حضرات دعوت دین کے لئے اپنے عہد کے اعلی اور ترقی یافتہ ذرائع ووسائل استعمال کرتے یہ طریقے ہر عہد اور ہر دور کی ضرورت اور ماحول کے مطابق مختلف ہو سکتے ہیں۔

امین احسن اصلاحی کہتے ہیں:

دعوت کے فروغ کے لئے ضرورت ہے کہ سوسائٹی کے اندر آپس میں مل بیٹھنے باہم تبادلہ خیالات کرنے اپنے خیالات کو سنانے کسی امر کو اجتماعی طور پر طے کرنے کے جو طریقے رواج پاچکے ہیں اگر ان میں کوئی اخلاقی وشرعی قباحت نہیں ہے تو اہل حق ان کو اپنائیں اور تبلیغ حق میں ان سے کام لیں حضور ﷺ نے دعوت کے کام میں ان تمام طریقوں سے فائدہ اٹھایا جو اس عہد کی معاشرت اور اجتماعی زندگی میں نشوونما پاچکے تھے۔ (۱)

پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈر قمطراز ہیں۔

روئے زمین کے اس قدر وسیع حصے میں اسلام نے جو اشاعت پائی ہے اس کے کئی معاشرتی سیاسی اور مذہبی اسباب ہیں مگر سب قوی سبب اس عظیم الشان کامیابی کا یہ ہے کہ مسلمان مبلغین نے اس سلسلے میں بے انتہا کوشش کی ہیں رسول اکرم ﷺ کا اسوہ حسنہ ان کے سامنے تھا چنانچہ انہوں نے کفار اور مشرکین کو دائرہ اسلام میں لانے کے لئے اپنی قوتوں کو بے دریغ صرف کیا۔ (۲)

موجودہ وسائل اور تمدن کی ترقی سے انسان کے وسائل اور ذرائع معلومات میں جو اضافے ہورہے ہیں داعیان حق کا فرض ہے کہ وہ ان کو دعوت کے فروغ میں زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔

---

(۱) دعوت دین اور اس کا طریقہ کار، امین احسن اصلاحی، فاران پبلشرز، راولپنڈی، ص ۴۲

(۲) علی گڑھ کی تعلیمی خدمات ۹/۲۶

حضور ﷺ نے اعلانیہ دعوت کا آغاز کوہ صفا پر فرمایا کیونکہ اس زمانے میں رواج تھا کہ لوگوں کو کوئی اطلاع اسی طرح پہنچائی جاتی تھی اونچی جگہ پر جا کر با آواز بلند پکارنے کی۔

حضور ﷺ تبلیغ کے لئے میلوں ٹھیلوں میں قبرستان میں محفلوں میں ہر جگہ آواز حق بلند کی سربراہان ریاست کو خطوط تحریر فرمائے خطبہ جمعہ میں اونٹنی پر چڑھ کر خطبہ دیا حضرت زید بن ثابت کو حضور ﷺ نے سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا اور یوں ہر طریقے سے یعنی زبان و قلم تحریر اور رسائل جرائد اور کتب دعوت کے ساتھ ساتھ میڈیا جو اس دور کا انتہائی موثر ذریعہ ہے اسے کام میں لانا چاہیے اور دعوتی جدوجہد میں تمام عصری تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جدید علوم سے استفادہ ضروری ہے بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہو گا کہ موجودہ وسائل اور تمدن کی ترقی سے انسان کے وسائل اور ذرائع معلومات میں جو اضافے ہو رہے ہیں دعوت حق کے فروغ میں ان سے استفادہ کرنا موجودہ دور میں داعیان حق کا فرض ہے۔

تواضع وانکساری:

کسی انسان کا متکبر ہونا بہت بڑی حماقت ہے متکبر انسان اپنے لئے بھی جہنم خریدتا ہے اور دوسروں کو بھی دین اسلام سے متنفر کرتا ہے کیونکہ داعی اسلام کا نمائندہ ہوتا ہے اور اس کا متکبرانہ رویہ لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کا سبب بنتا ہے۔

تکبر ایک مہلک بیماری ہے جس کا علاج تواضع اختیار کرنا ہے تواضع تکبر کی ضد اور عرفان الٰہی کا ثمرہ اور عرفان ذات کا نتیجہ ہے جو شخص اپنے وجود کی حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے وہ کبھی متکبر نہیں ہوتا تواضع داعی کا پہلا وصف ہے۔[۱]

داعی حضرات کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے:

اسلام جہاں انسان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ وہ خود پسندی میں مبتلا ہو کر دوسروں کو اپنے سے حقیر جاننا شروع کر دے وہاں اسلام اس بات کی اجازت بھی نہیں دیتا کہ انسان اپنی عزت نفس کو کسی دوسرے انسان کے) سامنے پامال کرتا پھرے اور اپنے آپ کو ذلیل کرتا پھرے۔[۲]

داعی حضرات کو یاد رکھنا چاہیے کہ انسان کا حسن اکڑنے میں نہیں بلکہ جھک جانے میں ہے انسان کو فخر زیب نہیں دیتا بلکہ تواضع کی روش اسے سنوار دیتی ہے غرور اور متکبر انسان سے لوگ دور ہو جاتے ہیں اس کی بات سننا گوارہ نہیں کرتے جبکہ تواضع انسانیت کا زیور ہے جس سماج کے افراد میں تواضع کی صفت ہو اس میں دوسری خوبیاں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں پس داعی حضرات کو تواضع سے متصف ہونا ضروری ہے تاکہ اس کے ذریعے سے فضائل کے درجات کو پا سکیں کیونکہ متواضع داعی کے پاس لوگ دیوانہ وار جمع ہوں گے اس کے اخلاق و کردار کو پرکھیں گے نتیجہ کے طور پر وہ اس آفاقی دین کے داعی بن جائیں گے۔

---

(۱) اصول دعوت دین، عبدالکریم زیدان، ص ۹۱

(۲) اہل ایمان کی ذمہ داریاں، مولانا محمد ظفر اقبال، بیت العلوم، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۶۲

ایثار و قربانی

داعی ایک ایسا قائد ہوتا ہے جو لوگوں کی اصلاح کی خاطر اپنی جان و مال اپنی خوشیاں اپنا سکون قربان کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے جبکہ دوسروں کے لئے قربانی کی صفت انسانی نفس میں پیدا نہیں ہوتی تب تک یہ نفس انسانی حیوانیت سے ہی مشابہت رکھتا ہے۔

محمد فتح اللہ گولن لکھتے ہیں:

خدا کے دین کے داعی کو اپنے مادی وسائل سے بڑھ کر قربانی دینی پڑتی ہے نیز حتی امکان اپنے دین اور انسانی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے بعض اوقات اسے اس معاشرے کو بھی چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑتی ہے جس میں وہ پروان چڑھتا ہے یہ قربانی کا ایک اور پہلو ہے چنانچہ تمام انبیاء کرام اور صحابہ کرام نے دعوت و تبلیغ کے لئے وطن چھوڑنے کی قربانی دی یہاں تک کہ مکہ کے ہر مسلمان مرد اور عورت نے ہجرت کی آج کے مبلغ اور مرشد حضرات کے لئے قربانی کے اس تصور کی یاد تازہ کرنا ہوگی یہی قربانی انبیاء کی سنت ہے۔[1]

داعی حضرات کو ہر طرح کی قربانی کے لئے تیار رہنا چاہیے یہ قربانی وقت کی قربانی بھی ہے کیونکہ وقت انتہائی قیمتی شے ہے وقت ہی زندگی ہے مال کی قربانی خواہ کم ہو یا زیادہ تا کہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کی جا سکے اور فقر کی راہیں بند کی جا سکیں۔ تکلیف دہ چیزوں کو برداشت کرنے کی قربانی دی جا سکے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴾[2]

ترجمہ: (اے اہل ایمان) تمہارے مال و جان میں تمہاری آزمائش کی جائے گی۔ اور تم اہل کتاب سے اور ان لوگوں سے جو مشرک ہیں بہت سی ایذا کی باتیں سنو گے۔ اور تم اگر صبر اور پرہیز گاری کرتے رہو گے تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

متوقع نفع کی قربانی کیونکہ اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے جو نفع اور ضرر کا مالک ہے بندوں کا دل اس کے ہاتھ میں ہے اس لئے داعی کو کسی ایسی چیز کی حرص نہیں کرنی چاہیے جو فانی ہے اسے اپنی ساری توقعات کا مرکز اللہ کو بنانا چاہیے۔

---

(۱) اسالیب دعوت اور مبلغ کے اوصاف، محمد فتح اللہ گولن، ہارمنی پبلیشرز، ایف ٹین ٹو، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص۲۰۷

(۲) سورۃ آل عمران: ۳/۱۸۶

آخری قربانی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ شہادت کے جذبے سے سرشار رہے اور اللہ سے توقع رکھے کہ وہ اسے شہادت سے ہمکنار کرے گا یہ قربانی کی وہ مختلف اقسام ہیں جن کے لئے داعیان دین کو ہر وقت تیار رہنا چاہیے [۱]

اکرام مسلم:

داعی حضرات کے اوصاف سے ایک وصف اکرام مسلم بھی ہے ہمارے ہاں بالعموم دعوت کے کام میں اکرام مسلم اور خاکساری کا جذبہ نہ ہونے کی وجہ سے مذہبی حلقوں میں جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے وہ انتہائی تشویشناک ہے ہر کوئی دوسرے کو نیچا دکھانے کے چکر میں خود کو اپنے عقیدے کو صحیح ثابت کرنے کے لئے الزام تراشی اور بہتان بازی کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں اس صورت حال کی نشان دہی کرتے ہوئے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے کتنی عمدہ تصویر کشی کی "اس زمانے میں ایک بڑا فتنہ جو ہزاروں خرابیوں اور فسادات کا سرچشمہ ہے جس نے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کی خوبیوں سے محروم اور اسلام کو مسلمانوں کی مجموعی خوبیوں اور کمالات سے بہت کچھ محروم کر دیا ہے وہ مسلمانوں کی تحقیر ہے ہر مسلمان نے گویا ایک کلیہ کے طور پر طے کر رکھا ہے کہ اس کی ذات محاسن اور دوسرے مسلمانوں کی ذات مجموعہ مصائب ہے وہ خود لائق تسلیم و تعظیم اور دوسرا لائق تحقیر و تنقید ہے یہ طرز عمل ان تمام فتنوں کا اصلی سبب ہے جو مسلمانوں کی اجتماعی اور مذہبی زندگی میں رونما ہوئے اور جن سے آج مسلمان پریشان ہیں۔"[۲]

مبلغین کرام کو یاد رکھنا چاہیے کہ تبلیغ میں بسا اوقات تھوڑی سے بے احتیاطی سے نفع کے ساتھ نقصان بھی شامل ہو جاتا ہے اس لئے بہت ضروری ہے کہ احتیاط کا ہر پہلو سے خیال رکھا جائے بہت سے لوگ تبلیغ کے جوش میں اس بات کا خیال نہیں رکھتے کہ ایک مسلمان کی پردہ دری ہو رہی ہے جس کی وجہ سے الٹا لوگ ان سے متنفر ہو جاتے ہیں یہ وجہ ہے کہ مسلمانوں کی ابروریزی پر سخت سے سخت وعیدیں وارد ہوتی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ مبلغین کرام نہی عن المنکر میں اپنی طرف سے پردہ دری نہ کریں جو منکر مخفی طور پر معلوم ہو اس پر مخفی انکار ہو اور جو علانیہ کیا جائے اس پر علانیہ انکار ہونا چاہیے نیز انکار میں بھی اس کی آبرو کا حتی الوسع سخت اہتمام کیا جائے لیکن جس منکر کا کرنے والے کی طرف سے افشانہ ہو اس پر انکار کرنے میں اپنی طرف سے کوئی ایسی صورت اختیار نہ فرمائی جائے جس سے راز افشا ہو۔[۳]

امام احمد نے حضرت ابو امامہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ ایک نوجوان نے نبی ﷺ کے خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی۔

يَارَسُولَ اللهِ!اِئذَن لِّي فِي الزِّنَا

اے اللہ تعالیٰ کے رسول! مجھے زنا کی اجازت دیجیے ۔

---

(۱) ہم دعوت کا کام کیسے کریں، عبد البدیع صقر، مترجم جاوید احسن فلاحی، ہندوستان پبلیکشنز، دہلی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۱۴

(۲) حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، مولانا سید ابو لحسن ندوی، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۳۰

(۳) فضائل تبلیغ، مولانا محمد زکریا، مکتبہ البشرٰی، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۲۴۵

لوگ اس پر ٹوٹ پڑے انہوں نے اس کو ڈانٹا اور کہا

"مَه مَه"

چپ ہو جاؤ۔ چپ ہو جاؤ.

آنحضرت صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا

((ادنه))

قریب ہو جاؤ

تو وہ حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے قریب ہو گیا

راوی نے بیان کیا وہ بیٹھ گیا۔

حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے پوچھا

((اتحبه لا مک))

کیا تم اس کو اپنی ماں کے لئے پسند کرتے ہو

اس نے عرض کیا

لا واللہ اجعلنی اللہ فداءک

نہیں واللہ! اللہ تعالیٰ مجھے آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم پر قربان کر دے

حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا

((ولا الناس یحبونه لا مها تھم))

اور لوگ بھی اس کو اپنی ماؤں کے لئے پسند نہیں کرتے

پھر حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے دریافت کیا

((افتحبه لابنتک))

تو کیا تم اسکو اپنی بیٹی کے لئے پسند کرتے ہو؟

اس نے کہا

لا واللہ!یا رسول اللہ جعلنی اللہ فداءک

نہیں واللہ! اے اللہ کے رسول صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم مجھے اللہ تعالیٰ آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم پر فدا کر دیں

غرض اسی طرح حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے بہن خالہ پھوپھی کے بارے میں پوچھا اور اس کا جواب ہر دفعہ نہیں میں تھا تو آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے

اپنا دست مبارک اس کے سینے پر رکھا اور دعا دی۔[1]

اس حدیث شریف میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضور ﷺ زنا کی اجازت طلب کرنے والے نوجوان کو نہ ڈانٹتے ہیں نہ برا بھلا کہتے ہیں بلکہ اس کو اپنے قریب بیٹھاتے ہیں زنا کی قباحت اور برائی کو سوال و جواب سے اجاگر کرتے ہیں اور اس کے لئے دعا فرماتے ہیں۔

موجودہ دور کے داعیان کرام کے لئے بھی یہی طریقہ مشعل راہ ہے کہ اصلاح بغیر پردہ دری کے کی جائے تاکہ مخاطب کے دل کی گہرائیوں میں بات اتر جائے اور یہی سب سے بہترین وصف ہے۔

حرف آخر:

الغرض داعی کی صفات بیان سے باہر ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے داعی کو سورج سے تشبیہ دی اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں آپ ﷺ کو داعیاً الی اللہ فرما کر سراجاً منیرا سے تشبیہ دی اور یہی سراجاً کی صفت سورج کے لئے بھی استعمال فرمائی۔ داعی کا کام بھی دعوت کو پھیلانا اور روشنی کو عام کرنا ہے دعوت کا کام ہی داعی کے لئے اوڑھنا بچھونا ہے داعی دعوت کا کام ایمان کے تقاضے اور ضمیر کی خلش کے تحت انجام دیتا ہے اس لئے داعی کو تمام اعلیٰ ترین اخلاقی صفات سے متعصف ہونا چاہیے تاکہ وہ دوسروں کے لئے نمونہ قرار پائے دعوت کا کام انتہائی صبر آزما ہے داعی کو بلند حوصلہ ہونا چاہیے۔

بقول سید مودودی:

سید صاحب نے دعوت کے کام کو کاشت کار کے کام سے تشبیہ دی ہے کاشت کار کام محض زمین پر بیج پھینکنا نہیں ہوتا بلکہ حکمت عملی سے کام کرنا ہوتا ہے پہلے زمین کو وہ جھاڑ سے صاف کرتا ہے ہل چلاتا ہے بیج بوتا ہے پانی دیتا ہے پودوں کی نگرانی کرتا ہے مستقل مزاجی سے اس منصوبے پر عمل کرتا رہتا ہے تب جا کر وہ ایک دن فصل کاٹنے پر قادر ہوتا ہے اور اس کا گھر غلہ سے بھر جاتا ہے۔ دعوت و تبلیغ کے کام کو سرانجام دینے کے لئے اسی قدر محنت اور مستقل مزاجی سے کام کرنا ہوتا ہے۔[2]

الغرض ایک مخلص داعی دعوت دین اور اس کی اشاعت کے کام میں اولوالعزم انبیاء کے اسالیب دعوت اور ان کی دعوتی جدوجہد کو مدنظر رکھتے ہوئے راہ حق میں جدوجہد کرتا ہے وہ حالات کی ستم ظریفی کا کارونا نہیں روتا بلکہ ان کا عزم یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے ہماری تخلیق جب ان حالات اور پرفتن دور میں کی ہے تو اسلام اور شریعت کا نفاذ بھی ہمیں انہی حالات میں کرنا ہے اس طرح ملت اسلامیہ کو جب ہماری صحت و جوانی کی آج ضرورت ہے تو آج ہی ہمیں ہر طرح کے حالات کا سامنا کرتے ہوئے "لبیک" کہنا ہے ہمیں کل کا انتظار نہیں کرنا ہمیں شروع سے آخری سانس تک دعوت و تبلیغ کی ترویج اشاعت میں کام کرنا ہے۔

---

(۱) مسند احمد، امام احمد بن حنبل، الحدیث ۲۲۲۱۱، ۳/۳

(۲) دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات، سید مودودی، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ص ۳۱۹

فصل دوم

داعیان کرام کی ذمہ داریاں

کائنات کا وجود ہر لمحہ کسی نہ کسی تغیر کا شکار رہتا ہے ہر آنے والا دن ہمارے سامنے نئے تقاضے نئی ذمہ داریاں احکام و فرائض کی نئی صورتیں لیکر ہمارے سامنے آموجود ہوتا ہے اور ذمہ داری ایک ایسی آفاقی حقیقت ہے جس سے دنیا کے ہر شخص کو واسطہ پڑتا ہے۔ دنیا کے ہر گروہ کی ذمہ داریاں ان کے نصب العین اور نظریہ حیات سے وابستہ ہوتی ہیں امت مسلمہ کی ذمہ داریاں بھی اس کے نصب العین اور نظریہ حیات سے وابستہ ہیں۔

حقوق و فرائض اور ذمہ داری اپنے معنوں سے ہی ثابت کر رہے ہیں کہ یہ انسانی زندگی کی بقاء کے لئے کس قدر ضروری ہے اصل میں تو انسانی زندگی کا سارا حسن ہی ذمہ داریوں کے ساتھ ہے جنگل میں بسنے والے تنہا انسان پر ذمہ داری کیونکر عائد ہو سکتی ہے ایک انسان چونکہ اپنی ذاتی زندگی گزارنے کے لئے بھی دوسروں کا محتاج ہے یہاں تک یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک انسان کو دوسرے انسان کے وجود سے ہی پیدا فرمایا اس فطرت سے قانون قدرت اس کا تعلق ایک خاندان سے جوڑتا ہے یعنی ماں باپ پھر بہن بھائی اور اس طرح یکے بعد دیگرے افراد سے ایک ایسا تعلق قائم ہوتا ہے

انسانیت کی تکمیل غاروں اور خانقاہوں میں نہیں بلکہ معاشرہ میں ہوتی ہے اسلام نے خانقاہ نشینی کی اجازت نہیں دی بلکہ اس بات کا حکم دیا ہے کہ چاہے ہزار مصائب اٹھانے پڑیں انسان کو معاشرہ سے وابستہ رہنا چاہیے۔[1]

اب یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اسلام اجتماعی زندگی کی ذمہ داریوں کے حوالے سے کیا اصول پیش کرتا ہے مولانا مودودی قرآن و سنت کے حوالے سے ہماری رہنمائی فرماتے ہیں۔

۱۔ نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں تعاون کرو بدی و زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔

۲۔ تمہاری دوستی اور دشمنی خدا کی خاطر ہونی چاہیے جو کچھ دو اس لئے دو کہ خدا اس کو دینا پسند کرتا ہے اور جو کچھ روکو اس لئے روکو کہ خدا کو اس دینا پسند نہیں کرتا۔

۳۔ تم وہ بہترین امت ہو جسے دنیا والوں کی بھلائی کے لئے اٹھایا گیا ہے تمہارا کام نیکی کا حکم دینا اور بدی کو روکنا ہے۔

۴۔ آپس میں بدگمانی نہ کرو ایک دوسرے کے لئے معاملات کا تجسس نہ رکھو ایک کے خلاف دوسرے کو نہ اکساؤ آپس کے حسد اور بغض سے بچو ایک دوسرے کی کاٹ میں نہ پڑو اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بن کر رہو۔

۵۔ کسی ظالم کو ظالم جانتے ہوئے اس کا ساتھ نہ دو غیر حق میں اپنی قوم کی حمایت کرنا ایسا ہے جیسے تمہارا اونٹ کنوئیں میں گرنے لگے تو تم بھی اس کی دم پکڑ کر اسکے ساتھ ہی جا گرو۔

۶۔ دوسرے کے لئے وہی کچھ پسند کرو جو تم خود اپنے لئے پسند کرتے ہو۔[2]

---

(۱) اسلامی نظام حیات و تاریخ اسلام، شیخ محمد اقبال، علمی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۵۸۵

(۲) اسلام کا نظام حیات، ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۳۰

قرآن مجید دین کے علماء کو اس بات کا مکلف ٹھہراتا ہے کہ اپنے استعداد اور صلاحیت کے مطابق امت کے اندر ایسی دعوت کو ہمیشہ زندہ رکھیں وہ ہر سطح پر ہر طریقے سے دین کی شرح وضاحت کریں کیونکہ "اسلام مجاہدوں، غازیوں، شہیدوں اور داعیوں کا دین ہے یہ راہبوں جوگیوں اور صرف اپنی ذات کے گرد گھومنے والے زاہدوں کا دین نہیں ہے اس میں انفرادی اصلاح اجتماعی اصلاح اور معاشرتی اصلاح ساتھ ساتھ جاری رہتی ہے۔ (۱)

لہٰذا داعیان کرام کو چاہیے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں انہیں اپنی اصلاح اپنے عزیز واقارب کی اصلاح یہاں تک کہ پوری امت کی اصلاح کے لئے مامور کیا گیا ہے اور اس سے آخرت میں اس بابت سوال کیا جائے گا کیونکہ دعوت دین معبودیت کی معراج ہے۔

حفاظت ایمان:

ایک داعی کی پہلی ذمہ داری حفاظت ایمان ہے۔

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ ءَامِنُواْ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَٱلۡكِتَـٰبِ ٱلَّذِى نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ وَٱلۡكِتَـٰبِ ٱلَّذِىٓ أَنزَلَ مِن قَبۡلُ ﴾ (۲)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ اور اپنے ایمان کی حفاظت کرو اور اس کتاب کی جو تدریجاً اپنے پیغمبر پر نازل کی اور ان کتابوں پر ایمان لاؤ جو اس سے پہلے نازل کیں۔

داعی جب تک خود ایمان پر قائم اور مضبوط نہ ہو اس وقت تک وہ دوسروں کو ایمان پر قائم رہنے کو نہیں کہہ سکتا نہ ان کی اصلاح کر سکتا ہے۔

ایمان کا دوسرا درجہ: یہ ہے کہ رسولوں پر بھی کامل یقین رکھے حضرت آدمؑ سے لیکر نبی آخر الزمان تک جتنے پیغمبر و رسول اس دنیا میں تشریف لائے وہ سب اللہ کا پیغام لیکر دنیا میں آئے تمام پیغمبر گناہوں سے پاک تھے اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق ہر زمانے کے نبی کی تعلیمات واجب العمل تھیں۔

ایمان کا تیسرا درجہ: یہ ہے کہ داعیان کرام مرنے کے بعد والی زندگی پر بھی کامل یقین رکھتے ہیں اور ہر چیز پر زوال ہے کیونکہ یہی زندگی سب کچھ نہیں ہے دنیا کی زندگی دار العمل اور آخرت دار الجزاء ہے ہمیں اپنے ایک ایک لفظ کے لئے جواب دہ ہونا ہے۔

---

(۱) ماہنامہ دعوۃ، قرآن مجید اور دعوت تبلیغ، مولانا امیر الدین مہر، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۱۰

(۲) سورۃ النساء: ۴/ ۱۳۶

ایمان کا چوتھا درجہ: یہ ہے کہ داعیان کرام قرآن سے اور اس سے پہلے نازل ہونے والی تمام الہامی کتابوں پر کامل ایمان رکھے یہ کتابیں جنہیں ہم نے اللہ کی مرضی پر مبنی آسمانی تعلیمات سے تعبیر کیا ہے جیسے فی زمانہ قرآن کریم پر عمل کرنا ہی ذریعہ نجات ہے یہ سب کتابیں برحق تھیں ان میں سے بعض کا انکار اور بعض کو تسلیم کرنا بھی قطعاً غلط ہے۔

۲- دوسری ذمہ داری: نیابت رسول ﷺ

نیابت رسول داعیان کرام کی دوسری اہم ترین ذمہ داری ہے چونکہ حضور ﷺ آخری نبی ہیں اب دنیا کی ہدایت ورہنمائی کے لئے کوئی دوسرا نبی نہیں آنے والا لہذا اب یہ ذمہ داری تمام امت محمدیہ اور بلخصوص داعیان کرام کی ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ نبوت اور رسالت محمد ﷺ پر اختتام کو پہنچی اور کمال و اتمام کو بھی اب کار رسالت کی ذمہ داری امت محمدیہ ﷺ عائد کی گئی ہے:

﴿ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا۟ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ وَيَكُونَ ٱلرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ﴾(1)

ترجمہ: اور اس طرح ہم نے تمہیں امت وسط بنایا تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔

سید مودودی فرماتے ہیں:

امت وسطہ سے مراد یہ ہے کہ جب آخرت میں پوری بنی نوع انسان کا حساب لیا جائے گا اس وقت رسول ﷺ ہمارے ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گے کہ فکر صحیح اور عمل صالح کی تعلیم تم کو پہنچادی گئی اور عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھایا اس کے بعد رسول ﷺ کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اٹھنا ہوگا یہ جہاں فضیلت و سرفرازی ہے وہاں ذمہ داری کا بار بھی ہے۔

مزید فرماتے ہیں کہ خدا کی ہدایت ہم تک پہنچانے کی ذمہ داری بڑی سخت تھی حتی کہ ذرا سی کوتاہی پر نبی ﷺ خدا کے ہاں ماخوذ ہوتے تھے تو اسی طرح دنیا کے تمام انسانوں تک ہدایت پہنچانے کی ہماری ذمہ داری بھی نہایت سخت ہے۔(2)

کار رسالت کی ذمہ داری یعنی بنی نوع انسانی پر اپنے قول و عمل سے حق کی شہادت دینا جیسے حضور ﷺ نے امت پر دی امت محمدیہ ﷺ کے کاندھوں پر عائد کر دی گئی۔ گویا اب امت محمدیہ ﷺ کا ہر فرد رسول ہے۔(3)

---

(۱) سورۃ البقرۃ: ۲/۱۴۳

(۲) تفہیم لقرآن ۱/۱۱۹-۱۲۰

(۳) اللہ کا پیغام انسانیت کے نام، خطبات اسرار احمد، قاسم شہزاد پرنٹرز، لاہور، ص ۱۰۴

۳۔ ختم نبوت کا تحفظ:

ایک داعی دنیا میں دین کا علمبر دار ہے وہ حضور ﷺ کا جانشین ہے نبوت و رسالت کا جو سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع ہوا تھا وہ نبی ﷺ پر اپنے اختتام کو پہنچا رب العزت نے اپنے آخری نبی کو تخت ختم نبوت پر بٹھا کر آپ ﷺ کے سر اقدس پر تاج ختم نبوت سجا کر اور کائنات کی فضاؤں میں لا نبی بعدی کا پرچم لہرا کر آپ ﷺ کی ختم نبوت کا اعلان یوں کیا:

﴿مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ ٱللَّهِ وَخَاتَمَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ ۗ وَكَانَ ٱللَّهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيمًا﴾ [۱]

ترجمہ: محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں بلکہ خدا کے پیغمبر اور نبیوں (کی نبوت) کی مہر (یعنی اس کو ختم کر دینے والے) ہیں اور خدا ہر چیز سے واقف ہے

عقیدہ ختم نبوت کے بارے میں مولانا امین احسن اصلاحی تدبر قرآن میں فرماتے ہیں:

حضور ﷺ تک تمام انبیاء کی یہ روایت رہی ہے کہ ہر نبی نے اپنے بعد آنے والے نبی کی بشارت دی ہے لیکن حضور ﷺ پر آکر یہ روایت بلکل ختم ہو جاتی ہے نہایت واضح الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو خاتم النبین قرار دیا اور حضور ﷺ نے بھی کسی نئے نبی کی بشارت نہیں دی بلکہ قطعی طور پر اعلان فرمایا کہ آپ ﷺ آخری نبی ہیں اب ہر معقول آدمی جان سکتا ہے کہ اگر آپ ﷺ کے بعد کسی نئے نبی کے آنے کی ادنیٰ سی گنجائش بھی ہوتی تو سابق انبیاء کی روایت کے مطابق حضور ﷺ اس کی پیشن گوئی فرماتے یا اگر پیش گوئی نہ فرماتے تو اس شدت کے ساتھ اس دروازے کو بند تو نہ کرتے کہ جو اس کو کھولنے کی جسارت کرے وہ نقب زن کہلائے۔ [۲]

ایک داعی کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ ختم نبوت کے تحفظ کو یقینی بنائے اور اس کیلئے کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کرے وہ اپنی دعوت و تبلیغ میں تحفظ ختم نبوت کو واضح کریں اس سلسلے میں لوگوں کے دلوں میں جو شکوک و شبہات ہیں ان کو دور کریں۔

کیونکہ ایک کلمہ گو مسلمان کے اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نام ناموس رسالت کی حفاظت اپنی جان کی حفاضت سے بڑھ کر فریضہ سمجھے کہ اگر پیغمبر اسلام مسلمانوں کو کوئی کام کرنے کا حکم دیں تو مسلمانوں کو اس کی تعمیل و تکمیل نہ کرنے کا اختیار نہیں رہتا۔ جو قرآن نے یوں بیان کیا:

---

(۱) سورۃ الاحزاب: ۳۳/۴۰

(۲) تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی ۶/۲۴۵

﴿ ٱلنَّبِيُّ أَوۡلَىٰ بِٱلۡمُؤۡمِنِينَ مِنۡ أَنفُسِهِمۡۖ وَأَزۡوَٰجُهُۥٓ أُمَّهَٰتُهُمۡۗ ﴾ (۱)

ترجمہ: نبی مکرم ﷺ کو مسلمانوں کی جانوں پر مسلمانوں سے بھی زیادہ حق ہے اور نبی ﷺ کی ازواج مطہرات امت کی مائیں ہیں۔

اور یہ ختم نبوت ورسالت کا ایک لازمی وابدی تقاضا ہے کہ جو فرائض منصبی حضور ﷺ کے تھے آپ ﷺ کے بعد اب وہ سب کے سب آپ ﷺ کی امت کے ذمہ ہیں خواہ وہ دعوت وتبلیغ ہو انداز وتبشیر تعلیم وتربیت اور اصلاح ہو تزکیہ ہو تبشیر ہو خواہ وہ وہ اعلاء کلمتہ اللہ شہادت علی الناس اقامت دین ہو۔ (۲)

یہ ساری ذمہ داریاں اب ان کی ہیں جو اب اس دین کے داعیان کرام ہیں کیونکہ یہ عقیدہ نبوت کا تقاضا ہے داعیان کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ کریں اور اس کی اشاعت کے لئے درج ذیل اقدام کریں۔

۱۔ کوشش کریں کہ ختم نبوت کے تحفظ کے لئے اپنی کوششوں کو منظم کریں ہر سال ختم نبوت کے ڈائری اور ختم نبوت کیلنڈر شائع کریں۔

۲۔ سکولوں اور کالجوں میں انا خاتم النبیین لا نبی بعدی کے چارٹ لگوائے جائیں تاکہ بچوں اور نوجوانوں میں اس ایمان کو راسخ کیا جاسکے۔

۳۔ اخبارات ورسائل میں عقیدہ ختم نبوت کے بارے میں مضامین لکھے جائیں تاکہ لوگوں کی ذہنی اصلاح ہوسکے۔

۴۔ داعی حضرات قادیانیت کے خلاف جہاد کا اعلان کریں۔

۵۔ قادیانی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا جائے۔

۶۔ عوام اور سادہ لوح مسلمانوں کو قادیانیوں کی سازشوں اور ان کے عزائم سے آگاہ کیا جائے۔

داعی حضرات کی ذمہ داری ہے کہ وہ عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کے لئے اپنی تمام تر کوششیں صرف کردیں تاکہ قادیانیت کا سدباب ممکن ہوسکے۔

اوامر پر عمل اور نواہی سے گریز:

داعی امت محمدیہ کا وہ فرد ہے جس نے دوسروں کو راہ ہدایت سکھانی ہے جسے دوسروں کے لئے روشن چراغ بننا ہے اور ایسا چراغ جس پر خود گرد وغبار کی تہہ پڑی ہو اس کی روشنی بھی دھندلی رہتی ہے داعی تمام عبادات اور اوامر پر خود بھی عمل کریں اور دوسروں کو بھی اس کی ہدایت دے اوامر وہ تمام کام ہیں جن کے کرنے کا شریعت نے حکم دیا جیسے نماز روزہ حج زکوۃ عدل و انصاف والدین کے ساتھ حسن سلوک یتیموں مسکینوں اور بیواؤں کی خیر گیری پڑوسیوں سے تعلقات، مسافروں کی

(۱) الاحزاب: ۶/۳۳

(۲) اللہ کا پیغام انسانیت کے نام، اسرار احمد، ص ۱۰۷

رہنمائی، قرض وامانت کی ادائیگی، حسن اخلاق، صبر وشکر، توکل وقناعت، تواضع وانکساری غرض ان تمام امور پر عمل پیرا ہونا جو شریعت سے ثابت ہیں اور عبادات ان سب پر عمل کرنا داعیان کرام کی ذاتی ذمہ داریاں ہیں۔

نواہی سے اجتناب:

دعوت وتبلیغ کی کامیابی کی ضمانت اس بات میں بھی پوشیدہ ہے کہ دعوت دینے والا خود بھی خلاف شرع کاموں سے اجتناب کریں کیونکہ اہل ایمان کی اہم ذمہ داری جس کا قرآن ان سے مطالبہ کرتا ہے وہ اوامر پر عمل کے ساتھ نواہی سے اجتناب بھی ہے داعی حضرات کو چاہیے کہ وہ

۱۔ شرک وبت پرستی سے اجتناب کریں۔

۲۔ خود پسندی اور تکبر سے دور رہیں۔

۳۔ فرائض کے ادا کرنے میں غفلت سے بچے۔

۴۔ فتنہ وفساد اور دہشت گردی بڑا گناہ ہے اس فتنے کا یا کسی بھی قسم کے شرک کا حصہ بننے سے دور رہیں۔

۵۔ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اسلام مومنین کو غیر مسلموں سے قلبی لگاؤ رکھنے کی اجازت نہیں دیتا اور ایک داعی کے لئے لازم ہے کہ وہ غیر مسلموں سے دوستی یا تعلق یا کسی بھی قسم کا لگاؤ نہ رکھیں۔

۶۔ ایک سچے داعی کی یہ بھی ذمہ داری ہے وہ معاشرتی سکون کو ممکن بنائے جھوٹ، رشوت، ناپ تول میں کمی حرام حصول رزق، زنا، غیبت، بہتان جیسے امراض سے دور رہے ان نواہی کے عوامل کے اجتناب سے بچے تاکہ معاشرہ میں امن وسکون ہو۔

امر بالمعروف ونھی عن المنکر:

شریعت میں جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے انہیں معروف کہا جاتا ہے اور جن سے روکا گیا ہے انہیں نھی عن المنکر کہتے ہیں اور شریعت محمدی ﷺ کی یہ آفاقیت ہے کہ اس نے علم کو چھپانا ایک انتہائی نفرت آمیز حرام قرار دیا ہے۔

لوگوں کو اچھی بات کی تلقین کرنا اور بری باتوں سے روکنا انبیاء کا فرض منصبی تھا اور انہیں دیگر ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس ذمہ داری کا پابند بنایا جاتا ہے تاکہ لوگوں کے لئے نیکی کی شاہراہ واضح ہو جائے۔

اسلام نے اہل ایمان کے ہر فرد کی بھی یہ ذمہ داری قرار دی ہے اور قرآن نے اس کو مؤمنین کی صفت کے طور پر اور فرض کے طور پر بھی ذکر کیا ہے کہ وہ دوسروں کو اچھائی کا حکم دیتے تھے اور نیکیوں پر ابھارتے تھے اور برائیوں سے منع کرتے تھے اور اجتماعی طور پر بھی پوری امت مسلمہ کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ وہ نیکیوں کا حکم دیں مسلمان اگر صاحب اقتدار ہوں اور ان کی حیثیت حکمران کی ہو تو پھر بھی ان کے لئے یہی حکم ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔

﴿ ٱلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّٰهُمۡ فِي ٱلۡأَرۡضِ أَقَامُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُاْ ٱلزَّكَوٰةَ وَأَمَرُواْ بِٱلۡمَعۡرُوفِ وَنَهَوۡاْ عَنِ ٱلۡمُنكَرِۗ وَلِلَّهِ عَٰقِبَةُ ٱلۡأُمُورِ ﴾(۱)

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلام کی دعوت و تبلیغ اور امت مسلمہ کے قیام کی خشت اول ہے ہر مرد مومن کی یہ صفت ہے

اس کی جتنی قدرت ہو وہ یہ فریضہ انجام دے اور کوئی مومن خواہ اس کا حلقہ اثر محدود ہو اس ذمہ داری سے بچ نہیں سکتا۔(۲)

داعیان کرام کی زندگی کا مقصد و محور ہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہونا چاہیے یہ فریضہ اکثر زبان سے بھی ادا کیا جاتا ہے اور کبھی قلم و تحریر بھی اس کا ذریعہ بنتے ہیں اور امر و نہی کی ان اقسام کے لئے داعی کا مخاطب فرد واحد بھی ہو سکتا ہے اور ایک جماعت بھی لہذا داعی کو چاہیے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام اصولوں سے آگاہ ہو تا کہ دعوت کامیابی سے ہمکنار ہو ایک داعی کا اہم فرض اور اس کی اہم ترین ذمہ داری ہی امر بالمعروف ہے لہذا اس امر بالمعروف کے لئے درج ذیل اصول مد نظر رکھیں۔

داعی کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا مکمل علم حاصل ہو کیونکہ جس طرح حکیم یا طبیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ مریض کے مرض سے بخوبی واقف ہو اسی طرح مرض کی دوا کا بھی علم ہو قرآن کریم کی یہ آیت اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ یہاں بصیرت کے لفظ میں علم و فہم داخل ہے۔

﴿قُلۡ هَٰذِهِۦ سَبِيلِيٓ أَدۡعُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا۠ وَمَنِ ٱتَّبَعَنِيۖ﴾(۳)

تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی۔

داعی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری نرمی سے ادا کرے۔

---

(۱)سورہ الحج:۲۲/۴۱

(۲)مرد مومن، ڈاکٹر محمد میاں صدیقی، پروگیسیو بکس، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص۱۳۶

(۳)سورہ یوسف:۱۲/۱۰۸

داعی امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں مصالح اور مفاسد پر پوری نظر رکھتا ہو اس امر کا اسے مکمل ادراک ہو کہ کس امر پر وہ قادر ہے اور کس پر قادر نہیں ہے اور کس مسئلہ میں مصالح زیادہ اور کس میں مفاسد کا پہلو زیادہ ہے اگر اوامر و نہی پر مصالح زیادہ ہوں تو اس پر امر و نہی فرض ہے اور اگر مفاسد زیادہ ہوں تو اس پر امر و نہی حرام ہے۔

داعی کی ذمہ داری ہے وہ معروف کی مطلقاً دعوت دے اور اسی طرح منکر کی عموماً ممانعت کرے اور اگر کسی معاشرے میں معروف و منکر ملے جلے ہوں تو لوگ یا تو سب کو قبول کریں گے یا سب کو ترک کریں گے تو داعی کے لئے ضروری ہے کہ اگر معروف میں مصلحت زیادہ ہو اور وہ راجح ہو تو اس کا حکم دے اگرچہ اس میں تھوڑا منکر بھی ملا ہو اگر داعی پر معاملہ مشتبہ ہو تو توقف اختیار کرے تاکہ اس کے سامنے صورت حال واضح ہو جائے اور وہ علم و اخلاص کے ساتھ قدم اٹھائے۔[۱]

داعی حق ازالہ منکر اس وقت کریں جب اس کے پاس اس کی مناسب قدرت موجود ہو اگر داعی منکر کے مٹانے پر قدرت نہ رکھتا ہو کہ اس سے کوئی برا فساد پیدا ہوتا ہو مثلاً یہی نقصان ہو کہ وہ دعوتی کام جاری نہ رکھ سکے گا تو ایسی صورت میں وہ اسے صرف دل سے برا سمجھنے پر عمل کرے۔

داعیان کرام کی یہ وہ اہم ترین ذمہ داری ہے جس کا مطالبہ قرآن اُن سے کرتا ہے اسی پر امت مسلمہ کی بقاء کا انحصار ہے اور اسی سے آخروی نجات ممکن ہے داعیان کرام کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ متشددانہ طریقہ نہ اختیار کریں کیونکہ جہاں بھی کسی معاملے میں تشدد پیدا ہوتا ہے وہاں تفرد لازمی جنم لیتا ہے اور تفرد کا لازمی نتیجہ تنفر ہے اور یہ تنفر ہی ہے جو لوگوں کو اسلام سے متنفر کر دیتا ہے۔

امام غزالی [۲] فرماتے ہیں۔ الغرض امر بالمعروف مسلّمہ ہے، واجب ہے۔ اس کو بلا عذر ترک کرنے والا گناہ گار ہے۔[۳]

داعی کی ذمہ داری:

صرف "ابلاغ"

داعی کے ذمہ داری صرف حق کا پہنچا دینا ہے اولین محرک جو ہمہ وقت داعی کو تبلیغ کے لئے تڑپاتا رہتا ہے وہ اپنے فریضہ کا شدید احساس ہے آپ ﷺ کے غیر معمولی اضطراب و فکر کو دیکھ کر خدا بار بار آپ ﷺ کو تسلی دیتا ہے اے رسول ﷺ!

---

(۱) اصول دعوت دین، عبد الکریم زیدان، ص ۳۰۰

(۲) امام غزالی: آپ کا نام محمد، کنیت ابو حامد اور خطاب حجۃ الاسلام ہے۔ آپ ۱۰۵۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپ مدرسہ نظامیہ میں معلم کے عہدہ پر فائز رہے۔ آپ کی مشہور تصانیف کیمیائے سعادت، احیاء العلوم وغیرہ ہیں۔ آپ اپنے دور کے زبردست ماہر تعلیم اور فلاسفر تھے۔ فقیہ مدرسہ اور مدرس بھی رہے۔ آپ نے ۱۱۱۱ء میں وفات پائی۔

(۳) تبلیغ بالیقین کار نبوت ہے، مولانا فضل الرحیم، سید نفیس شاہ، ص ۳۶۰

آپ پر یہ ذمہ داری ہرگز نہیں کہ آپ ﷺ کسی کے دل میں ہدایت ڈال دیں آپ ﷺ پر جو کچھ ذمہ داری ہے وہ صرف یہ ہے کہ آپ ﷺ حق کی دعوت پہنچادیں۔

﴿ وَمَا عَلَى ٱلرَّسُولِ إِلَّا ٱلْبَلَٰغُ ٱلْمُبِينُ ﴾[1]

اے نبی ﷺ! آپؐ کے ذمہ تو صرف دین کو پہنچا دینا ہے۔

داعی حق ہو یا داعی ضلالت دونوں میں سے کسی کو بھی اللہ تعالیٰ نے دعوت اور ترغیب سے زیادہ کسی چیز کا اختیار نہیں بخشا ہے نہ پیغمبروں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی شخص کے دل میں ہدایت ڈال دیں اور نہ شیطان ہی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی شخص کو گمراہی کی راہ پر لگادے ان میں سے ہر ایک کو بس یہ اختیار حاصل ہے کہ یہ اپنی اپنی راہ کی طرف خلق خدا کو بلا سکتے ہیں

ہدایت یا ضلالت کا اختیار کرنا اختیار کرنے والے کی اپنی پسند اور اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق پر منحصر ہے۔[2]

داعی حق کے ذمہ صرف یہ حق ہے کہ وہ اس دعوت کو لوگوں تک پہنچادے اب اگر کوئی اس دعوت کو قبول کرتا ہے تو ان کے لئے دنیا و آخرت کی فلاح کے دروازے کھل جائیں گے اور یہ ادائے فرض داعی کے لئے اجر و ثواب ہے اور اگر کوئی بھی اس دعوت کو قبول نہ کریں تو بھی داعی اللہ کے ہاں اس ذمہ داری سے سبکدوش قرار دیا جائیگا۔

اصل میں داعی کی کامیابی کا تعلق ہرگز اس بات سے نہیں ہے کہ اس کی کوشش کے کیا نتائج نکلے بلکہ اس بات سے ہے کہ اس نے اپنی ذمہ داری پوری کی یا نہیں مسلم پر اس کی دعوت فرض ہے خواہ دنیا اس کو قبول کرے یا رد کرے خواہ اس کے نتیجے میں وہ غالب ہو یا اس کے غلبہ کے امکانات ختم ہو جائیں۔ یہ ذمہ داری محض صرف اس وجہ سے ساقط نہیں ہوتی کہ لوگ دین کے مخالف ہیں اور اس کی بات سننا نہیں چاہتے پس انسان کے پاس جو حق ہے اور دنیا جو اس سے غافل ہے ان تک پہنچادے۔[3]

اکثر داعیان کرام اپنی ذمہ داری کے حدود متعین کرنے میں افراط و تفریط سے کام لئے جاتے ہیں یا وہ یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ وہ اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ لوگوں سے زبردستی حق قبول کروائے یا پھر وہ یہ سمجھتے کہ ہمارے ذمہ صرف ابلاغ ہے جس سے اس کے اندر بے پروائی اور سہل نگاری پیدا ہو جاتی ہے داعیان کرام کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ سے متعلق ہے کہ وہ کسے ہدایت دے اور کسے گمراہ کر دے لیکن ہدایت کی طرف دعوت دینا یعنی موثر ابلاغ داعیان کرام کی ذمہ داری ہے۔

---

(۱) سورہ نور: ۲۴/ ۵۴

(۲) دعوت دین اور اس کا طریقہ کار، امین احسن اصلاحی، ص ۱۶۷

(۳) اسلام کی دعوت، سید جلال الدین عمری، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ص ۹۱

داعیان کرام کی ذمہ داری

۸۔ "دعوت الیٰ اللہ غیر مسلموں کے لئے"

داعی حضرات کا صرف یہ کام نہیں کہ وہ بار بار مسلمانوں کو ہی تبلیغ کریں اور اسلام کو صرف مسلمانوں تک ہی محدود رکھیں اسلام آفاقی مذہب ہے۔

سید مودودی فرماتے ہیں:

اسلام کسی کی آبائی جائیداد نہیں یہ تو اسی کا ہے جو اس پر چلے پاکستان یا ہندوستان کے لوگ اس پر چلیں تو ان کا ہے عرب والے اس پر چلیں تو ان کا ہے اور یورپ کے لوگ اسے اختیار کر لیں تو ان کا ہے حد تو یہ ہے کہ کسی کافر کا بیٹا اسے اختیار کر لے تو خدا کا دوست بن جائے گا اور نبی کا بیٹا اس پر چلنا چھوڑ دے تو وہ کفار اور مشرکین میں شمار ہو گا اور طوفان نوح میں غرق ہونے والوں کے ساتھ ڈبو دیا جائے گا۔ (۱)

مشرک کافر یہود و نصاری لا دین سب کو اللہ کا پیغام پہنچانا داعی کی ذمہ داری ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے تبلیغ کا کام کرتے ہوئے جن لوگوں تک دعوت پہنچائی وہ تمام کے تمام غیر مسلم تھے اسی طرح صحابہ کرام، دعاۃ عظام اور ابتدائی مبلغین نے بھی زیادہ تر دعوت و تبلیغ کا کام غیر مسلموں میں ہی کیا بر صغیر کے صوفیا مبلغین اور داعی حضرات نے بھی اپنا کام غیر مسلموں میں کیا خواجہ معین الدین اجمیری، سید علی ہمدانی، مجدد الف ثانی، علی ہجویری، بہاء الدین زکریا اور سینکڑوں داعیوں نے لاکھوں لوگوں کو حلقہ بگوش اسلام کیا آج مبلغین بھی زیادہ ہیں وسائل بھی زیادہ ہیں مگر غیر مسلم اس طرح اسلام کی طرف نہیں آرہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم مسلک کی جزئیات اور مختلف مسائل میں ایسے الجھے ہیں کہ الٹا غیر مسلموں میں دین کے بارے میں غلط فہمیاں بڑھ گئی ہیں۔ (۲)

اپنے اخلاق اپنی سیرت کو ایک باعمل اور سچے مسلمان کی حیثیت سے ثابت کریں تاکہ غیر مسلم آپ کے اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر دین کی طرف آئے نہ کہ آپ سے متنفر ہو کر دین سے ہی متنفر ہو جائے۔

اسلام قبول کرنا ایسا ہے جو غیر مسلموں کو نازک حالات میں ڈال دے گا وہ آپ کے بہترین تعاون کے حق دار ہیں خدا کے دین سے تعلق اور محبت کا تقاضا ہے کہ آپ نہیں بے یارو مددگار نہ چھوڑے اور اس میں اجنبیت کا احساس نہ پیدا ہونے

---

(۱) دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات، سید ابو اعلیٰ مودودی، ص ۱۵۳

(۲) ماہنامہ دعوۃ، قرآن مجید اور دعوت و تبلیغ، مولانا امیر الدین مہر، جون ۱۹۹۵ء جلد ۶ شمارہ ۱۰، ص ۲۳

دے خدا کے دین کے لئے اگر اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تو آپ اپنا سب کچھ نہ سہی ایک حصہ تو بخوشی پیش کریں تو اس کا ساتھ دیں۔[1]

غیر مسلموں کو دعوت دینے کے سلسلے میں تالیف قلب کا بڑا کردار ہے کوئی مسلم اگر کسی ظلم و جبر کا شکار غیر مسلم کی اس ظلم سے نجات دلانے میں مدد کرتا ہے تو یہ احسن قدم ہے اسلامی تاریخ ایسے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے کہ مسلمان جب غیر مسلموں کے علاقوں میں فاتحانہ داخل ہوئے اور اپنے اعلیٰ اخلاق کا اظہار کیا تو لوگوں نے ان سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا محمد بن قاسم نے فتح سندھ کے بعد یہاں کی ہندو آبادی میں اپنے اخلاق و کردار کا مظاہرہ کیا اور اسلامی مساوات کا عملی نمونہ پیش کیا تو یہ لوگ اس کے دلدادہ ہوگئے اور اسلام قبول کر لیا۔

دعوت دینے کے لئے اگر مشترکہ نکات سے مخاطب سے بات شروع کی جائے تو اس سے اس کے اندر جو ضد اور ہٹ دھرمی ہوتی ہے وہ کم ہو جاتی ہے گویا بغض اور عناد کی آگ پر پانی پڑ جاتا ہے اور دل بات سننے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ رابطہ عالم اسلامی کے شائع ہونے والے جریدہ اسلامی رپورٹ کے مطابق گزشتہ چار مہینوں کے درمیان جمہوریہ بانین کے سات ہزار سات سو چوبیس غیر مسلم افراد نے اسلام قبول کیا یہ سب حکیمانہ دعوت و تبلیغ کے تحت ہوا۔[2]

اس کے کچھ مزید ذمہ داریاں بھی ہیں داعیان کرام کی جو درج ذیل ہیں۔

۹۔ داعی کی ذمہ داری "انذار":

خادمین رسول ﷺ پر جو اہم ذمہ داری قرآن نے عائد کی ہے وہ قرآن ہی کی تعبیر کے مطابق انذار ہے کیونکہ دین کا علم حاصل کرنے اور اسے پھیلانے کا مقصد ہی یہ ہونا چاہیے کہ آدمی اپنی قوم کے لوگوں کو آخرت میں اللہ کی پکڑ سے بچانے کی کوشش کرے یعنی انہیں محتاط کر دے کہ ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں دین کے جو مطالبات ہیں ان سے غفلت اور تساہل ان کے لئے دنیا اور آخرت میں ہلاکت کا باعث نہ بن جائے اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھی جانے کے قابل ہے کہ تلقین و نصیحت سے آگے بڑھ کر معروف کو فی الواقع قائم کر دینے اور منکر کو قوت سے مٹا دینے کا حق اللہ تعالیٰ نے کسی داعی کو نہیں دیا۔[3]

---

(۱) اسلام کی دعوت، جلال الدین عمری، ص ۴۶

(۲) دنیا میں اسلام کی روشنی، ارسلان بن اختر، مکتبہ ارسلان، کراچی، ۱۴۲۵ھ، ص ۳۵۳

(۳) ہم دعوت کا کام کیسے کریں، عبد البدیع صقر، ہندوستان پبلیکیشنز، دہلی، ۱۹۸۲ء، ص ۵۴۶

۱۰۔ داعی کی ذمہ داری "اتفاق واتحاد قائم کرنا"

اللہ کے دین کی دعوت دینے والوں کی ایک اہم ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو جوڑ کر رکھیں ان سے نفرت حسد اور بغض کو نکال دیں انہیں باہمی اتحاد و اتفاق کی طرف لے جائیں کیونکہ اسلام کے پیش نظر ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں تمام انسان باہمی نفاق وتعصبات کو ختم کر کے اخوت وبھائی چارہ اور امن وامان کی فضاء قائم کریں بقول اقبال:

"مسلمانوں کی زندگی کا راز اتحاد میں مضمر ہے میں نے برسوں مطالعہ کیا راتیں غور وفکر میں گزاریں تاکہ وہ حقیقت معلوم کر سکوں کہ کس پر کاربند ہو کر حضور ﷺ کائنات کی صحبت میں تیس سال کے اندر دنیا کے امام بن گئے وہ حقیقت اتحاد و اتفاق میں ہے۔ جو ہر شخص کے لبوں پر ہر وقت جاری رہتی ہے کاش ہر مسلمان کے دل میں یہ بات اتر جائے نسلی اور اعتقادی اختلافات میں تنگ نظری اور تعصب نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا مسلمانو! میں تمہیں کہتا ہوں کہ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو متحد ہو جاؤ اختلافات بھی کرو تو اپنے آباء کی طرح تنگ نظری چھوڑ دو اس سے سب اختلافات مٹ سکتے ہیں"۔ [۱]

داعیان کرام کو اپنی گفتگو میں کوئی ایسا جملہ استعمال نہیں کرنا چاہیے جس سے کسی کی دل آزاری ہو یا کوئی مذہبی تعصب پیدا ہو آپ کا کام فرقہ ورانہ تصادم کو کم کرنا اور امت محمدیہ ﷺ کو جوڑنا ہے۔

بے دینی، اخلاقی بے راہ روی اور ہوس زر نے پہلے ہی معاشرے کو مضطرب کر رکھا تھا اب دہشت گردی اور انتہا پسندی نے اس کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے کسی جماعت یا فرد کو کافر قرار دینے کا حق بھی کسی داعی حق کو حاصل نہیں ہے مشرک کا لفظ قرآن میں صرف ان لوگوں کے لئے استعمال ہوا ہے جو شرک پر قائم ہوں۔

مبلغین اسلام کی ذمہ داری ہے وہ لوگوں کی جانی ومالی ہر لحظ سے مدد کریں اپنے اندر سے ہوس دولت کو ختم کریں اور اپنے مال کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دین کی اشاعت وتبلیغ کے لئے وقف کر دیں۔

۱۱۔ داعی کی ذمہ داری جدید طریقوں کا استعمال:

داعی حضرات کی ذمہ داری ہے کہ وہ دعوت کے لئے مختلف طریقے استعمال کریں تاکہ اپنی بات کو زیادہ بہتر طریقے سے لوگوں تک پہنچا سکیں اور دعوت کا وقار بھی قائم رہے دعوت دینے کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس میں دین واخلاق کے لحاظ سے کوئی قباحت ہو اور نہ ہی ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جس سے دعوت کی شان مجروح ہو دعوت دینے کے لئے جدید طریقے بھی استعمال کئے جائیں صرف لکیر کے فقیر بن کے نہ رہ جائیں۔

استاذ امام فرماتے ہیں:

---

(۱) گفتار اقبال، محمد رفیق افضل، ادارہ تحقیقات اسلامی، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۸

بعض دینی حلقوں میں خدا جانے یہ خیال کہاں سے پھیل گیا ہے کہ تبلیغ کا معیاری اور پیغمبرانہ طریقہ یہ ہے کہ آدمی ہاتھ میں تھوڑے سے چنے لے لے اور تبلیغ کے لئے نکل کھڑا ہو نہ پاؤں میں جوتی ہو نہ سر پر ٹوپی گاؤں پھرے کوئی سنے نہ سنے اس پر تبلیغ شروع کر دے جہاں چار آدمی نظر آئیں وہاں تقریر کے لئے کھڑا ہو جائے جہاں بھیڑ دیکھے وہاں وعظ شروع کر دے ہر مجلس میں جا گھسے ہر پلیٹ فارم پر جائے سننے والے تھک جائیں لیکن وہ نہ تھکے لوگ اس کے سوال و جواب سے چھپتے پھریں مگر وہ اپنا کام جاری رکھے۔ جہاں وعظ کی فرمائش ہو تو وعظ کہہ دے جہاں میلاد کا کہا جائے تو میلاد شروع کر دے جہاں مخالفین کو دیکھے وہاں خم ٹھونک کر میدان مناظرہ میں اتر آئے۔ (۱)

یہ ہے تبلیغ کا طریقہ جو ہمارے بہت سے دین دار لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے تبلیغ و تعلیم کے موجودہ ترقی یافتہ اور سائنٹیفک طریقوں کے خلاف ہے جس کو ان کے خیال میں انبیاء نے اختیار فرمایا۔ ہمارے نزدیک اس طریقے کو انبیاء کا طریقہ کہنا کچھ تو انبیاء کے اسالیبِ دعوت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے اور کچھ ان حضرات کی اپنی اس خواہش کا بھی عمل دخل ہے کہ ان کا اپنایا ہوا طریقہ مقدس و محترم ثابت ہو جائے۔

جہاں تک انبیاء کرام علیہم السلام کے طریقۂ تعلیم کا ہم نے مطالعہ کیا اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے تبلیغ کے جو طریقے اختیار کئے ہیں وہ ان کے زمانوں کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ و ترقی یافتہ تھے اور یہ طریقے حالات اور تمدنی ترقیوں کے ساتھ بدلتے بھی رہے ہیں۔

جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس معاملہ میں کسی ایک ہی طریق پر اصرار صحیح نہیں کیا ہے بلکہ داعیان حق کو چاہیے کہ وہ ہر زمانے میں تبلیغ و تعلیم کے لئے وہ اختیار کریں جو ان کے زمانوں میں پیدا ہو چکے ہیں اور جن کو اختیار کر کے وہ اپنی کوششوں اور قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ مفید اور پختہ چیز بنا سکتے ہوں۔ (۲)

پس داعیان حق کی ذمہ داری ہے کہ اس کار عظیم میں تمام جدید طریقوں کا استعمال کریں کیونکہ دعوت کا طریقہ جس قدر سائنٹفیک نقطہ نظر سے اعلیٰ ہو گا اسی طرح پوری قوت کے ساتھ باطل کا مقابلہ کیا جا سکے گا اگر اہل حق یہ سوچ کر جدید طریقوں کے استعمال سے گریز کریں کہ انبیاء نے اپنی دعوت میں ان طریقوں کا استعمال نہیں کیا بلکہ ایک ایک شخص کے پاس پہنچ کر اس پر تبلیغ کی ہے اس وجہ سے ہمارے لئے بھی اولیٰ یہی ہے کہ ہم ان چیزوں کو ہاتھ نہ لگائیں بلکہ گھر گھر پہنچ کر ہی لوگوں کو تبلیغ کریں تو یہ انبیا کے طریقہ کی پیروی نہیں ہو گی بلکہ شیطان کا یہ بہت بڑا دھوکہ ہو گا۔

حضور ﷺ نے بھی دعوت و تبلیغ میں اس زمانے کے تمام مروجہ طریقے استعمال کئے کبھی دعوت پر مدعو کر کے دعوت دین دی کبھی خود جا کر دین اسلام کی طرف بلایا کبھی مختلف ممالک کے فرمانرواؤں کو خطوط تحریر کئے کبھی کوہ صفاء پر چڑھ

---

(۱) دنیا میں اسلام کی روشنی، ارسلان بن اختر، ص ۳۵۳

(۲) ماہنامہ اشراق، قانون دعوت، جاوید احمد غامدی، ۳ مارچ ۱۹۹۷ء، جلد ۹، شمارہ ۳، ص ۴۵

کر قریشی بھائیوں کو پکارتے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں کوہ صفا ہمارے جدید ذرائع ابلاغ کا متبادل تھا ایام حج میں مکہ میں آئے ہوئے حجاج کو حضور ﷺ دعوت دین پیش کرتے اور یہی وہ یثرب کے لوگ تھے جن کو مدینہ آنے کی دعوت حضور ﷺ نے حج کے موقع پر دی تھی اور داعی حضرات کی ذمہ داری ہے کہ وہ تصنیف و تالیف کے کام میں خصوصی دلچسپی لیں اس میں شک نہیں کہ دینی موضوعات پر مشتمل تحریکی کتابوں کا جو خلا ہے اس کا پر ہونا کوئی آسان کام نہیں اس خلاء کو پر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ داعیان کرام دین میں گہری بصیرت حاصل کریں بہترین مواد اکٹھا کریں اور اس پر علماء کرام کی رائے بھی لیں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہم تصنیف و تالیف میں ایسا مواد اکٹھا کریں جو دعوتی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے سلسلے میں معاون ثابت ہو اس کے ساتھ عام فہم ہو معلومات سے پر ہو فہم و تدبر کی صلاحیت پیدا کر سکیں۔

الغرض دعوت دین مکمل حکمت اور بصیرت کے ساتھ دینا امت محمدیہ ﷺ کی اولین ذمہ داری اور فرض عین ہے۔

فصل سوم

دور حاضر میں داعیان کرام کو درپیش مسائل اور ان کا حل

دور حاضر میں داعیان کرام کو درپیش مسائل اور ان کا حل

آج کے دور میں امت مسلمہ ان گنت مسائل کا شکار ہے مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق اور قیادت کا فقدان ہے کیونکہ مسلمان آج اپنے دین سے دور ہو گیا ہے اگر وہ اس آفاقی دین سے جڑا رہتا تو دنیا میں ہمیشہ سر بلند اور سر فراز رہتا لیکن آج ایک طرف تو دنیائے کفر مسلمانوں کو مٹانے کے در پے ہیں اور اس کے لئے ان پر دہشت گردی کا بھیانک الزام لگایا جارہا ہے تو دوسری طرف یہ حال ہے کہ ہم داخلی طور پر بھی کمزور ہو چکے ہیں مسلکی اور فقہی اختلاف کا ایک طوفان ہے جو ہمیں لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ہم میں محبت بھائی چارہ امن ختم ہو چکا ہے ہم اپنے ہی بھائیوں کو اپنے ہاتھوں خون میں نہلا رہے ہیں ان کی زندگیاں جہنم بنا رہے ہیں۔ نائن الیون کے بعد جتنا زہریلا پروپیگنڈہ دینی مدارس علمائے دین یا داعی حضرات کے خلاف ہو رہا ہے اتنا کسی اور طبقہ کے بارے میں نہیں ہوا دین کا کام کرنے والوں پر آنکھ بند کر کے دہشت گرد ہونے کا الزام لگا دیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں داعی حضرات کی دعوتی سر گرمیاں محدود ہو کر رہ جاتی ہیں جس کی وجہ سے وہ یکسوئی کے ساتھ اس فرض کو ادا نہیں کر سکتے عصر حاضر میں داعی حضرات کو بے شمار مسائل کا سامنا ہے جن کا مختصراً ذکر کیا جائے گا۔

فرقہ واریت کا طوفان:

موجودہ دور کے داعی حضرات کے لئے سب سے بڑا مسئلہ تعصب یا فرقہ واریت ہے ہمارے ملک میں فرقہ واریت کا ایک طوفان برپا ہے کوئی کسی کی بات سننے پر آمادہ نہیں اصلاح اور دعوت دینے کا کام بہت دور رہ جاتا ہے ہر شخص اپنے مسلک کا داعی ہے جبکہ ہر شخص بھولا ہوا ہے کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کیا ہیں اور وہ سب کے لئے یکساں ہیں فقہی مسائل میں اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن بنیادی تعلیمات میں نہیں۔

پاکستان کے علما اور دانشوروں کو چاہیے کہ مسلمانوں میں شیعہ سنی کے نام سے برادر کشی کو روکیں مسلمانوں سے کہیں وہ ایک دوسرے کی بات پر امن رہ کر سنیں اور مشترکہ اصولوں پر متحد رہیں ہمیں چند اعتقادی یا عملی مسائل کو اختلاف کا سبب بنا کر شیعہ سنی کے نام پر باہم دست و گریبان نہیں ہونا بلکہ اسلام کے اساسی اصولوں پر متحد ہونا چاہیے۔[1]

دعوت تبلیغ کے فروغ کے لئے امت مسلمہ کے فرقہ وارانہ اختلافات پر سختی سے کنٹرول کیا جائے ہمارے دینی اداروں، مبلغین اور دینی ذرائع ابلاغ کی دعوتی سر گرمیوں کے اثرات میں کمی ہونے کی اہم ترین وجہ فرقہ واریت ہے دعوت و تبلیغ کی بجائے زیادہ توجہ مخالف فرقے کے اختلافی مسائل کو نیچا دکھانے پر ہے لہٰذا حکومت کو چاہیے کہ فرقہ واریت پھیلانے کو جرم قرار دیا جائے ہر سرکاری سطح پر کسی بھی شخص کو محض اس کے فرقے کے حوالے سے پروٹوکول نہ دیا جائے ذرائع ابلاغ پر

(۱) اتحاد ملت اسلامیہ، سید خورشید علی وارثی، وارثی پبلیکیشنز، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۴۳

فرقہ وارانہ گفتگو پر سخت پابندی لگائی جائے۔ داعی حضرات کو چاہیے کہ وہ دعوتی و دین کے کام میں مسلکی گفتگو سے پرہیز کریں کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے کسی فرقہ کی دل شکنی ہو آپ کا کام دلوں کا جوڑنا ہے توڑنا نہیں۔

دعوتی اداروں کا قیام:

ہمارے ملک میں دعوتی ادارے یا تو نہ ہونے کے برابر ہیں یا جو ہیں انہیں مکمل سہولتیں فراہم نہیں ہیں جس کی وجہ سے داعی حضرات کو بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔(۱)

۱- پاکستان میں وفاقی سطح پر دعوۃ فاؤنڈیشن کو مکمل طور پر خود مختار بنایا جائے اس کو چلانے والے اہل علم اہل تقوی ہوں جنہیں تبلیغ دین اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عملی تجربہ ہو۔

۲- دعوۃ فاؤنڈیشن کے ذریعے فوجیوں، مزدوروں، کاشتکاروں اور خواتین غرض ہر طبقے کے لوگوں کو ایسے ریفریشر کورسز کروائیں جائیں جن کے ذریعے ان افراد کی دینی تربیت کی جائے اور انہیں اپنی پیشہ ورانہ زندگی کو اسلام کے سنہری اصولوں کے مطابق گزارنے میں رہنمائی مل سکے۔

دعوۃ فاؤنڈیشن مرکزی اور صوبائی سطح پر اپنے خصوصی تربیتی ادارے قائم کرے جہاں مختلف شعبوں میں کام کرنے وارلے افراد کی دعوتی سرگرمیوں کو کنٹرول اور منظم کیا جاسکے اور بیرون ملک ملازمت کے لئے جانے والے لوگوں کو دعوت و تبلیغ کی تربیت دی جاسکے۔(۲)

اسلامی ریاست امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری قبول کرے اور اس مقصد کے لئے مستقل با اختیار وزارت کا قیام عمل میں لایا جائے جس طرح حکومت سعودیہ نے دعوت و ارشاد کا مستقل محکمہ قائم کر رکھا ہے جس کے تحت دعوتی سرگرمیوں کو منضبط کیا جاتا ہے اور دعوتی لٹریچر تیار کیا جاتا ہے اسی طرز پر ایک مستقل محکمہ یا مستقل وزارت مرکز اور صوبوں کی سطح پر قائم کی جائیں۔

علماء کرام جدید علوم سے واقفیت نہیں رکھتے :

ہمارے داعی حضرات دینی علم بھی رکھتے ہیں اور با عمل بھی ہیں تاہم ان کی اکثریت دنیاوی علوم کے بارے میں خصوصاً جدید علوم کے بارے میں آگاہ نہیں ہیں ہمارے ہاں ایسے علمائے کرام کی اکثریت ہے جو جدید ذرائع کے استعمال سے واقفیت نہیں رکھتے جس کی وجہ سے وہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت بڑے پیانے پر نہیں کر سکتے نہ نو مسلموں کے دلوں میں موجود شکوک و شبہات کو دور کر سکتے ہیں۔

---

(۱) تبلیغ بالیقین کار نبوت ہے، مولانا فضل الرحیم، ص ۷۱ ۴

(۲) دعوت تبلیغ اسلام، محمد برکت علی، دارالاحسان، فیصل آباد، ۱۳۹۵ھ، ۳/ ۲۱۲

علمائے کرام دعوت و تبلیغ میں تمام جدید طریقوں سے استفادہ کریں اور ان کا استعمال سیکھیں اس طرح دعوت و تبلیغ کی ترویج و اشاعت کے لئے ریڈیو ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کا طریقہ بھی ہے کیونکہ یہ وہ فائدے اپنے اندر رکھتے ہیں جو آڈیو ٹیپ اور ویڈیو ٹیپ میں پائے جاتے ہیں موجودہ زمانے میں بہت سے مشن ریڈیو، ٹی وی اور انٹرنیٹ کو اپنے مقاصد کے لئے موثر طور پر استعمال کر رہے ہیں اسلام کے داعی بھی ان جدید ذرائع ابلاغ کو شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے دعوتی مشن کو پھیلانے کے لئے استعمال کریں۔(۱)

قدیم زمانے میں ایک انسان اپنی آواز صرف اپنے قریبی ماحول تک پہنچا سکتا تھا آج دنیا گلوبل ویلیج بن گئی ہے مواصلات اور کمیونیکیشن کے جدید ذرائع نے اس بات کو ممکن بنادیا ہے کہ ایک آدمی پوری دنیا میں سرعت کے ساتھ اپنے پیغام کو پہنچا سکتا ہے اسی طرح ایک کتاب کے کروڑوں ایڈیشن تیار کئے جاسکتے ہیں آڈیو کیسٹ بھی نہایت قیمتی دعوتی ذریعے ہیں لہٰذا حکومت پاکستان داعی حضرات کو ان تمام جدید ذرائع کا استعمال سکھائے اور اس کے استعمال کے لئے متعلقہ سہولتیں فراہم کریں انٹرنیٹ کے ذریعے اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت کا بندوبست کیا جائے عصر حاضر میں جس طرح Peace ٹی وی چینل دین اسلام کے بارے میں پروگرام نشر کر رہا ہے اسی طرح ایک خصوصی ٹی وی چینل ہونا چاہیے جو صرف اور صرف دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے مخصوص ہو ان پروگراموں میں ایسے لوگوں کو مدعو کیا جائے جو خود بھی با عمل ہوں اور دینی علوم پر بھی دسترس رکھتے ہوں اور دعوت و تبلیغ کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے حکمت مواعظ حسنہ اور احسن طریقے مجادلہ کو اصول بنا کر مبلغین کو کام کرنا چاہیے۔

معاشی مسائل:

داعی حضرات اپنی دعوتی سرگرمیوں کو مکمل وقت نہیں دے پاتے کیونکہ انہیں اپنی ملازمت اور دیگر مسائل میں مصروف ہونا ہوتا ہے حکومت اگر دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرنے والوں کی سرپرستی کرے تو یہ لوگ معاش کی فکر سے آزاد رہ کر یہ کام کریں تو اس کے نتائج زیادہ دور اثر ہوں گے۔

حکومت دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دینے والوں کے لئے باقاعدہ وظائف مقرر کرے جیسا کہ حضرت عمر بن عبد العزیز (۲) نے ۱۰۰ دینار مقرر کر رکھے تھے تاکہ داعیان کرام اپنے معاشی اور خانگی مسائل سے بھی عہدہ بر آں ہو سکیں اور پوری یکسوئی

---

(۱) دعوت حق، مولانا وحید الدین خان، دار التذکیر، لاہور، س ن، ص ۱۳۷

(۲) حضرت عمر بن عبد العزیز: آپ ۶۱ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے عدل و انصاف کی وجہ سے پانچویں خلیفہ کہلائے۔ آپ کے دور میں لوگ کثرت سے مسلمان ہوئے۔ آپکی دینی خدمات میں بدعت کا خاتمہ، تقدیر پر تبادلہ خیال سے منع کرنا، احادیث رسول ﷺ کو جمع کرنا اور دینی علوم کا فروغ شامل ہے۔ آپ نے ۱۰۱ھ میں وفات پائی۔ (تاریخ اسلام، بشیر احمد تمنا، ص ۲۱۳)

کے ساتھ دعوت کا کام کریں تا کہ وہ فکر معاش میں مصروف نہ رہیں۔ [1]

ذرائع ابلاغ کا منفی کردار :

دور حاضر میں داعی حضرات کی تبلیغی سرگرمیوں کے ادا کرنے میں اور ان کے مثبت اثرات کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ دور حاضر کا میڈیا ہے یہ میڈیا جس طرح اخلاق سوز فلمیں اور گانے دیکھا دیکھا کر ہماری نوجوان نسل کو تباہ کر رہا ہے اور مغربی تہذیب کا دل دادا بنا رہا ہے یہ بظاہر تفریحی اور ثقافتی پروگرام در حقیقت اپنی بساط میں ایسا میٹھا زہر ہے جو اتنی مہارت سے حملہ آور ہوتا ہے کہ محدود وسائل رکھنے والی دعوتی شخصیات اور تنظیمی جماعتیں ان کا توڑ کرنے کے لئے اپنی مختصر عددی ٹیم کے ساتھ سخت دباؤ کا شکار رہتے ہیں۔ [2]

جہاں تک دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں ذرائع ابلاغ کے استعمال کا تعلق ہے تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ میڈیا مالکان کو ہدایت جاری کرے کہ وہ ثقافتی اور تفریحی پروگراموں کے ساتھ ساتھ اپنے دیگر پروگراموں میں عقیدہ توحید فکر آخرت سیرت النبی ﷺ اور صحابہ کرام و بزرگان دین کے حالات زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں عوام الناس کو شیطان کے پر فریب چالوں اور جمالیاتی فکر و فریب سے آگاہ کیا جائے۔ [3]

آج امت مسلمہ جس عظیم قوت سے محروم ہے وہ میڈیا کی طاقت ہے جبکہ مغرب نے اس کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ایک تو ہماری نسلوں کو گمراہ کر رہا ہے دوسرا وہ مسلمانوں کو کبھی دہشت گرد کبھی مذہبی انتہا پسندی کے القابات سے نواز کر اقوام عالم کو ہم سے متنفر کر رہا ہے۔

میڈیا کی طاقت آج مسلمہ ہے اگر آج مسلمان اسلام دشمن طاقتوں کے جھوٹے پروپیگنڈے کا توڑ کرنے اور اپنے دعوتی دینی مقاصد کے حصول کے لئے عالمی سطح پر اپنا ایک طاقتور میڈیا قائم نہیں کر سکتے وہ ان کی کم نگاہی ہے۔ [4]

ملازمتوں کا حصول:

ہمارے دینی مدارس سے فارغ التحصیل طلباء اور داعی حضرات جب عملی زندگی میں آتے ہیں تو انہیں ملازمتیں نہیں ملتیں جس کی وجہ سے وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں اور بعض دفعہ خلاف توقع سرگرمیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں حکومت پاکستان کو چاہیے کہ وہ دینی مدارس کو اپنی سرپرستی میں لے اور وفاق المدارس کی سند رکھنے والے اہل حضرات کو بھی ملازمتوں میں حصہ دیا جائے۔

---

(۱) دعوت دین اور تقاضے، جبار دہلوی، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۸۶۱

(۲) دعوت و اشاعت، محمد عین الحق، ص ۶۷۳

(۳) ذرائع ابلاغ اور اسلام، محمد وسیم اکبر، ،مکہ پبلی کیشنز لمیٹڈ، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۵

(۴) مسلم نشاۃ ثانیہ، ڈاکٹر محمد امین، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۳۵۵

سعودی عرب میں چونکہ دینی تعلیم کو بھی حکومتی سرپرستی حاصل ہے اس لئے وہاں ملازمت کے سلسلے میں وہ پریشانیاں نہیں پائی جاتیں جو ہمارے مدارس کے فارغ التحصیل طلباء کو پیش آتی ہیں وہاں کے عدالتی نظام (قضا) میں بھی مدارس کے طلباء کی ایک کثیر تعداد کھپ جاتی ہے۔[1]

خواتین مبلغین کی حوصلہ شکنی اور سہولیات کی عدم فراہمی:

دور جدید میں دعوت کا کام کرنے والے ہمارے داعی حضرات کو ہی صرف مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا بلکہ ہماری خواتین جو دعوت و اصلاح کا نظریہ لے کر میدان عمل میں آتی ہیں انہیں بھی بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے چنانچہ خواتین مبلغین کو ہر طرح سے ستایا جاتا ہے حالانکہ یہی خواتین اگر سیاست اور سٹیج پر آجائیں تو حوصلہ افزائی کرنے والوں کا ایک جہاں امڈ آتا ہے اسلام کی تاریخ گواہ کہ ہماری امہات المومنین نے دعوت اسلام میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں ہماری صحابیات بھی دعوت و تبلیغ کے معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی نے اسلام ہی اپنی بہن سے تلاوت قرآن سن کر قبول کیا۔

حکومت پاکستان کو چاہیے کہ وہ خواتین مبلغین کی حوصلہ افزائی کریں اس سلسلے میں باقاعدہ میڈیا پر خواتین کے دعوتی پروگرام نشر کئے جائیں۔ خواتین کے الگ تعلیمی ادارے قائم کئے جائیں نیز خواتین کے اداروں میں موجود نصاب میں اسلام کی مبلغین خواتین امہات المومنین اور صحابیات کی زندگی کی مبلغانہ سرگرمیوں کو شامل نصاب کیا جائے۔

حضور ﷺ دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں عورتوں کی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دیتے تھے رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ پہنچ کر تعلیم کا جو منصوبہ شروع کیا اس میں تین سکیموں پر عمل درآمد فوری طور پر شروع کیا بچوں کے لئے ابتدائی تعلیم، جوانوں کے لئے تعلیم بالغاں اور خواتین کے لئے تعلیم نسواں۔[2]

حضور ﷺ حضرت بلالؓ کی معیت میں خواتین کے اجتماع میں تشریف لے جاتے اور عورتوں کو وعظ و نصیحت فرماتے۔ اصل میں اصلاح نسواں دراصل اصلاح انسانیت ہے سماجی تہذیب و شائستگی کی بنیاد ہے کیونکہ نسل انسانی عورت کی گود میں تربیت پاتی ہے اسی لئے ماں کی گود کو اولین درس گاہ قرار دیا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں بھی دعوت و تبلیغ کی اشاعت کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ دی جائے ملک میں خواتین کے لئے الگ سے تعلیمی درس گاہیں قائم کی جائیں۔

دعوتی مقاصد کے لئے مساجد کے استعمال کی ممانعت:

داعی حضرات کا ایک بڑا اہم مسئلہ یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ کے لئے انہیں مساجد کے استعمال کی اجازت نہیں ہوتی مساجد کو

---

(۱) دینی مدارس کا نظام تعلیم، مولانا عبدالغفار حسن، انسٹیٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۰

(۲) زادِ راہ، مولانا جلیل احسن ندوی، مکتبہ الہدیٰ، ص ۲۲

نماز کے بعد تالے لگا دیئے جاتے ہیں انہیں صرف نماز کے اوقات میں کھولا جاتا ہے اور مساجد کو صرف نماز کی جگہ خیال کیا جاتا ہے حالانکہ دعوتی مقاصد کے لئے مساجد کے استعمال کی عہد نبوی میں ہزارہا مثالیں موجود ہیں۔

عصر حاضر میں ضرورت ہے کہ آج مساجد کا وہی مقام بحال کیا جائے جو کہ عہد نبوی ﷺ عہد خلفائے راشدین میں تھا اسلام کا ایک اہم ستون مسجد ہے آپ ﷺ نے مسجد کو فوج کا صدر مقام ہیڈ کواٹر بنا کر مہاجرین اور انصار کی تربیت کا آغاز کر دیا آپ ﷺ کی تربیت یافتہ فوج میں عمدہ تیاری اعلیٰ اخلاق بہترین تربیت و ایمان کامل اور اطاعت و فرمانبرداری جیسے عمدہ اوصاف پائے جاتے تھے یہی سے دعوت و تبلیغ کے لئے جماعتیں روانہ کی جاتیں۔(۱)

آج ہم نے دنیاوی رخ سے مساجد کو استعمال کرنا چھوڑ دیا ہے ہم انہیں اس طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح غیر مذاہب کے لوگ اپنی عبادت گاہوں کو کرتے ہیں۔ آج عصری تقاضے یہ ہیں کہ ہمیں مساجد کو بہت جلد دینی بنیادوں پر منظم کر لینا چاہیے آج اگر ہم اپنی مساجد کو دینی بنیادوں پر منظم کر لیں تو کوئی مسلمان چار پانچ گھنٹے سے زیادہ تکلیف میں مبتلا نہیں رہ سکتا اور کوئی جماعتی مسئلہ ایک دن سے زیادہ حل طلب نہیں رہے گا۔ اسی طرح حکومت پاکستان مساجد کو دعوتی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی اجازت دے نیز مساجد میں داعیان کرام کی رہائش و طعام کا بندوبست کیا جائے۔ اور مساجد کا وہی مقام بحال کیا جائے جو کہ عہد نبوی اور عہد خلفائے راشدین میں تھا تاکہ مساجد کا تقدس بھی برقرار رہے اور مساجد کو دعوتی سرگرمیوں کے فروغ کے لئے مرکز کے طور پر استعمال کیا جائے۔

تربیتی اداروں کا فقدان :

ہمارے داعی حضرات کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ تربیت یافتہ نہیں ہوتے جس کی وجہ سے دعوت کے کام کو منظم بنیادوں پر نہیں چلا سکتے دعوت دین کی ترویج و اشاعت کے لئے مثالی مبلغین کا کردار بنیادی اہمیت رکھتا ہے تبلیغ کا فریضہ اناڑی اور کم علم لوگوں کے سپرد نہیں کیا جا سکتا پاکستان میں ڈاکٹرز، انجینئرز، ٹیچرز، افواج پاکستان، نرسنگ غرض ہر شعبے کے افراد کے لئے تربیتی ادارے موجود ہیں لیکن جنہوں نے ملک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کرنی ہے دین اسلام کی اشاعت و تبلیغ کرنی ہے ان کے لئے ادارے موجود نہیں۔

اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ ایسے ادارے قائم کرے جہاں مثالی مبلغین تیار کئے جائیں اور ان مبلغین کو میدان عمل میں بھیجنے کے بعد ان کی سرگرمیوں پر بھی نظر رکھیں۔ دور نبوی ﷺ میں ایسے ادارے موجود تھے درس گاہ صفہ اسی مقصد کے لئے بنائی گئی تھی

(۱) نور سرمدی، محمد فتح اللہ گولن، ترجمہ محمد اسلام، ہارمنی پبلیشرز، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۱۶۷

یہ اصحاب صفہ اسلام کی دعوت کے لئے بھیجے جاتے نو مسلموں کو تعلیم دیتے یہ ان داعیوں اور قاصدوں کی پکار تھی جس نے یمن یمامہ بہرین شام مصر ہر جگہ اسلام کا پیغام پہنچادیا۔[1]

کتب سیرت اس بات سے بھری پڑی ہیں کہ عرب میں بھیجے جانے والے مبغلین اسلامدعوۃ اور سفراء کرام اس علمی درس گاہ کے تربیت یافتہ تھے جو حضرت ارقم نے مکہ مکرمہ میں تبلیغی اور اجتماعی ضروریات اور داعیان کی تربیت کے لئے حادی امام محمد ﷺ کی نظر کر دیا تھا۔[2]

مکی اور مدنی دونوں دور میں اس طرح کے تربیتی ادارے باکثرت موجود تھے جو صحابہ کی تربیت کا فریضہ سرانجام دیتے صحابہ کرام جن کی صداقت اور لیاقت کی ایک دنیا گواہ ہے ان کے لئے دعوتی اور تربیتی ادارے موجود تھے تو آج کے پر فتن دور میں داعی حضرات کے لئے اس کی اہمیت بدرجہ اتم موجود ہے تاکہ وہ دعوت کے کام کو منظم بنیادوں پر چلا سکیں۔

بین الاقوامی زبانوں اور تقابل ادیان سے واقفیت نہ ہونا :

دور حاضر میں ہمارے داعیان کرام کو درپیش مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے داعی حضرات انگلش اور دوسری بین الاقوامی زبانوں میں مہارت رکھنا تو دور کی بات بنیادی لغت سے بھی آگاہ نہیں ہیں اور حال یہ ہے کہ عربی زبان میں بھی بول چال کی مہارت نہیں رکھتے کیونکہ مدارس میں عربی کے نام پر اصول و قواعد ایک کتاب رٹوائی جاتی ہے عملی مشق نہیں کروائی جاتی اور انگریزی اور دوسری زبانوں کو پڑھانا تو گناہ خیال کیا جاتا ہے نتیجتاً یہ لوگ غیر مسلموں میں تبلیغ نہیں کر سکتے بلکہ غیر مسلموں کی طرف سے لگائے گئے الزامات کا جواب بھی نہیں دے سکتے نہ ہی ان مدارس میں تقابل ادیان کا مضمون پڑھایا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ سند تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن ان کی معلومات اور زبان ادب اور مذاہب عالم کے معاملے میں صفر ہوتی ہیں ساری زندگی احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں اول تو تبلیغ کا فریضہ ادا نہیں کرتے کریں تو زبان و بیان کی کمزوری اور مذاہب عالم سے لاعلمی آڑے آتی ہے۔

دور حاضر کا تقاضا ہے کہ داعی حضرات بین الاقوامی زبانوں میں مہارت تامہ رکھتے ہوں تاکہ وہ دنیا میں اسلام کی تعلیمات کو پھیلا سکیں حکومت پاکستان مدارس کو پابند کرے کہ وہ اپنے مدارس کے نصاب میں انگریزی کو لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل کریں اور تقابل ادیان کا مضمون لازمی پڑھایا جائے تاکہ وہ تقابلی طور پر مذاہب کا مطالعہ کریں اور دین اسلام کی حقانیت غیر مسلموں پر واضح کر سکیں اور یوں اسلام کے داعی بن کر خشکی اور تری میں پھیل جائیں جس طرح دور اول کے مسلمان پھیل گئے تھے۔[3]

---

(۱) عہد نبوی ﷺ میں ریاست کا منشور وارتقاء، ڈاکٹر نثار احمد، سنگ میل پبلیشرز، لاہور، ص ۳۳۶

(۲) سیرت کبریٰ، ابوالقاسم دلاوری، زمزمہ پبلیشرز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۲۵

(۳) مسلم نشاۃ ثانیہ اساس اور لائحہ عمل، ڈاکٹر محمد امین، ص ۳۴۱

آج کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ بڑے پیمانے پر ایک تبلیغی درسگاہ قائم کی جائے اس میں مسلم نوجوانوں کو تعلیم و تربیت کے ذریعے اس کار علم کے لئے تیار کیا جائے اس درس گاہ میں داعی حضرات کو عالمی زبانوں میں لکھنے اور بولنے کی صلاحیت سکھائی جائے یہاں وہ ملکوں اور قوموں کی تاریخ پڑھیں۔

اس طرح کی تبلیغی درس گاہ میں اپنے ذہین بیٹوں کو داخل کرنا بلاشبہ والدین کے لئے ایک قربانی ہے مگر آج سنت ابراہیمیؑ کو زندہ کرنے کیلئے اسی قربانی کی ضرورت ہے۔[1]

(کیونکہ عموماً والدین اپنے ذہن بچوں کو سکول میں داخل کرواتے ہیں اور تھوڑے نالائق بچوں کو مدارس میں بھیج دیا جاتا ہے)۔

اگرچہ عصر حاضر میں داعیان کرام کو بے شمار مسائل درپیش ہیں تاہم ان کا مختصراً جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے اگرچہ دور جدید میں یہ مسائل دن بدن بڑھ رہے ہیں اور لامحدود ہیں کیونکہ مغرب پسندی اور مغربی تعلیمات کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھ رہا ہے نتیجتاً وہ اسلام سے دور ہوتے جارہے ہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جتنی اس دین کی مخالفت کی جارہی ہے اتنی ہی اس کی ترویج اور اشاعت میں ترقی ہو رہی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آج فاصلے سمٹ گئے ہیں جدید علم و ٹیکنالوجی کی وجہ سے آج لوگوں کو متعصب لوگ گمراہ نہیں کرسکتے یہ لوگ خود جب اسلام کے متعلق تحقیق کرتے ہیں تو سچائی ان پر واضح ہو جاتی ہے اور وہ اسلام کو سادہ پر امن اور انسانی فطرت کے عین مطابق پاتے ہیں۔

---

(۱) داعی اور دعوت کا کام، محمد موسیٰ بھٹو، سندھ نیشنل اکیڈمی، ص ۲۰

نتائج:

اس مقالہ کی تیاری کے دوران توفیق الٰہی سے متعدد باتیں اجاگر ہوئیں ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔

۱۔ دعوت تبلیغ ایک ایسا کار عظیم ہے جس کی ابتدا خود اللہ کریم کی ذات سے ہوئی۔

۲۔ الوالعزم انبیا کی حیات مبارکہ اور دعوتی زندگی تمام انسانوں کے لیے مشعل راہ ہیں اور داعیان دین کے لیے الوالعزم انبیا کے اسالیب دعوت روشنی کے وہ مینار ہیں جن کی روشنی میں وہ اپنے لیے راہ عمل متعین کر سکتے ہیں۔

۳۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تک مشرک قوم کو دعوت توحید دی نتیجے میں ۲۷ یا ۸۲ لوگ آپ پر ایمان لائے تاہم اتنی طویل جدوجہد کے بعد بھی آپ دل برداشتہ نہ ہوئے۔ ان کی زندگی سے داعیان توحید کو ایک نیا عزم یقین محکم اور تازہ ولولہ نصیب ہوتا ہے۔

۴۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوتی زندگی کا آغاز ہی جابر حکمران کے سامنے کلمہ حق بلند کرنے سے ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ الوالعزم انبیا کرام نے اپنی دعوت کو صرف عوام تک محدود نہیں رکھا بلکہ خواص کو بھی دعوت دی ہے اور عقیدہ توحید انسان کا وہ مضبوط سہارا ہے جس کے بعد کوئی خوف داعی کی راہ میں روڑے نہیں اٹکا سکتا۔

۵۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تین بڑے مذاہب مسلمان، یہودی عیسائی اللہ کا عظیم اور الوالعزم نبی مانتے ہیں لہٰذا غیر مسلموں میں تبلیغ دعوت کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسالیب دعوت ہماری رہنمائی کریں گے۔

۶۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعوت و تبلیغ کو اس کی معراج تک پہنچایا لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اب دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عائد ہوتی ہے۔

۷۔ الوالعزم انبیا کے دعوتی اصولوں کی روشنی میں داعی کے اوصاف ترتیب پاتے ہیں لہٰذا داعی حق کو نہ صرف ان اوصاف کا حامل ہونا چاہیے بلکہ عملی طور پر اپنی دعوتی ذمہ داریوں کو بھی سرانجام دینا چاہیے۔

۸۔ تمام انبیا کرام خصوصاً الوالعزم انبیا کرام کی دعوت مشترکہ نکات توحید رد شرک خوف آخرت اور حلال و حرام تک رہی جس کی وجہ سے کسی قسم کا مسلکی تعصب یا فرقہ واریت نہیں پیدا ہو سکتی لہٰذا داعیان کرام کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی دعوت میں اسلام کی مشترکہ بنیادی تعلیمات تک محدود رہے اور مسلکی یا فرقہ ورانہ گفتگو سے پرہیز کریں۔

۹۔ الوالعزم انبیا کی یہ روش رہی ہے کہ وہ جدل و مخاصمت کی منطقیانہ راہوں پر نہیں چلتے بلکہ ان کا مجادلہ رفق نرمی، درگزر اور سامنے والے کی عقل و دانش کے مطابق حکمت و دانائی سے ہوتا ہے اور اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔

۱۰۔ الوالعزم انبیا کی دعوت میں جہاں توحید کا درس ہے وہاں وہ انسانی معاشرے کو بھی عدل پر قائم کرتے ہیں۔

۱۱۔ سید مودودی کے ہاں انبیا کی دعوت و اصلاح کا تعلق نظام کی تبدیلی سے ہے یہ ایک وسیع فکری و عملی پروگرام ہے جس میں اقتدار کی تبدیلی یا کم از کم اقدار کی اصلاح شامل ہے جبکہ امین احسن اصلاحی کے ہاں دعوت و اصلاح میں صرف "انداز" کا پہلو غالب ہے اور داعی حق سیاسی اقتدار کا حریف نہیں ہوتا۔

۱۲۔ دعوت الی اللہ کا سب سے مفید اور پر کشش ذریعہ خود داعی حق کی شخصیت ہے اس کے افعال حمیدہ، اس کی سیرت عالیہ اور اخلاق حسنہ ہے۔لہٰذا داعی حق کو علم و عمل میں دوسروں کے نمونہ ہونا چاہیے کیونکہ عمل کی تاثیر کلام کی تاثیر سے گہری اور زیادہ بلیغ ہے۔

۱۳۔ دعوت و تبلیغ کی کامیابی کے لیے "ہجرت اور نصرت" دونوں ضروری ہیں۔

۱۴۔ جب داعی الحق لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اس راہ میں جتنی بھی مشکلات در پیش ہوا سکے قدم اپنے مقصد سے بلکل نہیں ہٹتے جیسا کہ کوئی بھی آزمائش الوالعزم انبیا حضرت نوح علیہ السلام، حضرت موسی علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے راستے سے نہ ہٹا سکی۔

۱۵۔ تفسیر تفہیم القرآن اور تفسیر تدبر قرآن دونوں داعیانہ انداز تفسیر رکھتی ہیں جن کے مطالعے سے داعی کو انبیا کے اسالیب دعوت جاننے میں مدد ملتی ہے

دور حاضر میں دعوت و تبلیغ کی اشاعت کے لئے تجاویز

۱- تمام خلفائے راشدین مساجد میں خطبہ دیا کرتے تھے اور امامت کرواتے تھے لہٰذا حکومت دعوت و تبلیغ کی ترویج و اشاعت کے لئے یہ اہتمام کریں کہ مرکزی سطح پر صدر اور وزیر اعظم جبکہ صوبائی سطح پر گورنر اور وزیر اعلیٰ جامع مساجد میں کم از کم مہینے میں ایک دفعہ دعوت دین پر لیکچر دیں اور اسے آن لائن دکھایا جائے تاکہ اسلام کے دشمنوں پر اسلام اور مسلمان کی ہیبت قائم ہو جائے کیونکہ دین میں مسجد ہی ایوان اقتدار ہے مسلمان جسے اپنی سیاست کا امام بنائے وہی ان کا دینی امام بھی ہو گا۔

۲- دینی مدارس میں جو نصاب پڑھایا جارہا ہے حکومت اس کا خود خیال رکھے نیز مدارس میں حکومت دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم کا بندوبست کرے اور دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی پیشہ ورانہ تربیت کا اہتمام بھی کیا جائے نیز حکومت ان مدارس میں اصلاحات نافذ کرے ان دینی مدارس میں اہل اور متقی لوگوں کو اساتذہ رکھا جائے جو بچوں کی کرداری تربیت کر سکیں۔

۳- حکومت تبلیغی وفود دوسرے ممالک میں روانہ کریں اور ان وفود کے لئے پاسپورٹ ویزہ اور رہائش کا مناسب انتظام فراہم کریں۔

۴- یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اسلامیات کے نصاب میں اس طرح تبدیلی کی جائے کہ اس کے نتیجے میں جہاں ماہر فقہ مفسرین و محدثین پیدا ہوں وہاں تربیت یافتہ عصر حاضر کے تقاضوں سے باخبر بیرونی زبانیں جاننے والے اور دور جدید کے چیلنجز کا سامنا کرنے والے داعیان و مبلغین بھی تیار ہو سکیں۔

۵- مساجد کے امام اور قاری حضرات کے لئے بھی باقاعدہ ریفریشر کورسز کا اہتمام کیا جائے جہاں ان کو اپنے علاقے میں دعوت دین کی ذمہ داریاں سونپی جائیں یہ کام لاہور میں محکمہ اوقاف کی اکیڈمی میں ہونا چاہیے۔

۶۔ عیسائیوں کے گرجاگھر اور تعلیمی ادارے زیادہ تر اکھٹے ہوتے ہیں نیز عیسائی اپنے تعلیمی اداروں اور ہسپتالوں میں دن کا آغاز ہی اپنے مذہب کی تبلیغ سے کرتے ہیں یوں وہ اپنی مذہبی اور دنیاوی تعلیم کو اکھٹا رکھتے ہیں چنانچہ حکومت پاکستان بھی دینی اور دنیاوی تعلیم کی تفریق کو ختم کریں۔

۷۔ داعیان کرام کو چاہیے کہ اولوالعزم کے اسالیب دعوت کی روشنی میں دعوتی سرگرمیاں سرانجام دیں اور انبیا کے اسالیب دعوت کو سمجھنے کے لیے تفسیر تفہیم القرآن اور تدبر قرآن کا خصوصی مطالعہ کریں کیوں یہ تفاسیر دعوتی اسالیب میں انبیا کے اسالیب دعوت کو خوبصورت، جامع اور منظم انداز میں بیان کرتی ہیں اور دور حاضر کے تحت ان اسالیب کو جدید دور سے ہم آہنگ کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

۸- حکومت پاکستان سرکاری سطح پر علماء کرام کی تربیت کے اہتمام کریں علماء کا صرف یہ کام نہیں ہے کہ وہ مسجدوں اور مدرسوں تک محدود رہے یا صرف کفر کے فتوے لگاتے رہے بلکہ آج علمائے دین کو جدید سائنسی تعلیم حاصل کرنا ہو گی اور اس پر گہری دسترس اور مہارت حاصل کرنا ہو گی پھر تنقیدی نگاہوں سے ان کا مطالعہ کر کے مفید اجزاء ان میں سے چھانٹنا ہو نگے اور خرافات و قیاس پر مبنی باتوں کو چھوڑنا ہو گا اور دنیا میں اسلام کا مثبت پہلو اجاگر کرنا ہے ہم علمائے دین سے انتہائی خلوص سے دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ انہیں مسجدوں اور خانقاہوں کی محفوظ پناہ گاہوں میں سے نکلنا ہو گا خدا کی پناہ میں آکر خدا کی ساری زمین کو مسجد بنانے کی فکر کریں آپ لوگ مسلمانوں کے دین کے چراغ ہیں آپ سے صرف دینی معاملات میں روشنی کیوں ملے دین کی روشنی میں دنیاوی معاملات میں بھی رہنمائی آپ کیوں نہ دے یہ وقت علمائے کرام کے جاگنے کا ہے اور وقت کے اس اہم تقاضے کو سمجھنے کا ہے۔

۹- اختلافی مسائل خصوصی مسلکی اختلافات پر رائے دینے کے لئے ضابطہ اخلاق مرتب کر کے فوری طور پر نافذ العمل کیا جائے۔

۱۰- رواداری کو فروغ دیا جائے اور مختلف مکاتب فکر کے علماء اور مشائخ کو مسلسل مل بیٹھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ علماء اور سکالر کا ایسا بورڈ تشکیل دیا جائے جو پاکستان میں شائع ہونے والی ہر کتاب کا جائزہ لے اگر کسی کتاب میں اسلام قرآن اور پیغمبر اسلام کے خلاف کوئی مواد ہو یا کسی عقیدہ اور شخصیت کے خلاف کوئی مواد ہو اس کی جانچ پڑتال کی جائے اور طباعت میں متفقہ لٹریچر سامنے لایا جائے۔

۱۱- ذرائع ابلاغ عامہ کے اداروں میں کام کرنے والے افراد کے لئے ایسے تربیتی پروگراموں کا بندوبست کیا جائے جو ان میں خدا ترسی باہمی ہمدردی احترام آدمیت اور انصاف پسندی کی قدروں کو اسلامی بنیادوں پر استوار کریں۔ بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کے مطابق دعوت و تبلیغ کے عمل کی پالیسی مستقل زیر غور رکھی جائے اور اس فرض کی ادائیگی کے لئے طویل المیعاد اور قلیل المیعاد منصوبے بنائے جائیں۔

۱۲- سرکاری دفاتر اور تعلیمی اداروں میں دن کا آغاز قرآن و سنت و تعلیم سے ہونا چاہیے نیز ہسپتالوں اور دیگر تمام اداروں میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے اور ملازمین کو ظہر کی نماز کی ادائیگی کے لئے وقت اور سہولیات فراہم کی جانی چاہئیں۔ امت محمدیہؐ امت دعوت ہے لہٰذا دعوت کی کامیابی اور اشاعت کے لئے تمام ممکنہ تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں کیونکہ آج کا عہد بے شمار آسانیوں کے باوجود سادگی کا دور نہیں سائنسی اور فنی انقلاب نے بے شمار ذرائع و وسائل کو جنم دیا ہے لہٰذا مبلغ اور داعی کو بھی ان تمام سائنسی اور فنی ذرائع و وسائل سے کماحقہ آگاہی ہونی چاہیے اور ان سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے ان میں اسلامی دعوت کے نقطہ نظر سے سب سے اہم جدید ذرائع مواصلات پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر، موبائل، انٹرنیٹ، تحریر و تقریر کی آزادی وغیرہ اور اس طرح مختلف قسم کی تیز رفتار سواریاں یہ چیز اسلام کے حق میں عظیم نعمتیں ہیں ان کو استعمال کر کے اسلامی دعوت کو عالمی سطح تک پھیلایا جاسکتا ہے۔

۱۳-دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والے ادارے آپس میں تعاون کریں بلکہ نسبتاً زیادہ تجربہ کار ادارے کو اپنی رہنمائی کے لئے منتخب کر لیں جدید وسائل و ذرائع سے استفادہ کریں تا کہ علمی صلاحیت پیدا ہو جائے نیز ان اداروں میں ایسے افراد کو بطور مدرس لیا جائے جو کسی مخصوص مسلک کے پیروکار نہ ہوں بلکہ ان کا انتخاب تقویٰ اور کارکردگی کی بنیاد پر ہو انہیں اس دعوت کے کام سے دلی وابستگی ہو تا کہ وہ اپنے طلبہ کے اندر وہی خصوصیات پیدا کر سکیں جو صدر اول کے بزرگوں کا طرہ امتیاز تھیں نیز کبھی ان اداروں کے طلبہ کا اجتماعی تفریحی پروگرام بھی رکھنا چاہیے تا کہ انہیں اس ملک کے طول و عرض کا کچھ اندازہ ہو سکے اور دعوت کے کام کرنے کی تربیت بھی ہو سکے۔[1]

(۱) اسلام کا معاشرتی نظام، ڈاکٹر خالد علوی، الفیصل ناشران و تاجران کتب، ص ۳۹۷

حرف آخر

آج امت مسلمہ نازک ترین دور سے گزر رہی ہے ایک طرف تو اغیار کی سازشیں ہیں جو ہماری نوجوان نسل کو تباہ کر رہی ہیں تو دوسری طرف مسلکی تعصب اور فرقہ پرستی کا وہ طوفان ہے جس نے ہمیں بری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے آج اگر ہم اپنی اور اپنی آنے والی نسلوں کی اصلاح چاہتے ہیں اور اپنی زندگیوں کو امن و سکون کا گہوارہ بنانا چاہتے ہیں تو اس کا واحد راستہ دین اسلام کی دعوت و تبلیغ ہے اور یہی وہ شاہراہ ہے جو امن و آشتی کی ضامن ہے۔ آج اگر ہم نے دعوت و تبلیغ کی طرف کماحقہ توجہ کرلی تو انشاءاللہ یہ ملک بہت جلد صحیح معنوں میں اسلام کا گہوارہ بن جائے گا۔

موجودہ حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ آج ایک مرتبہ پھر دعوت و تبلیغ کا کام کو اسی حکمت عملی سے انجام دیا جائے جس طرح قرون اولیٰ میں انجام دیا گیا اس سلسلے میں ہمارے پاس اولوالعزم انبیاء کے اسالیب دعوت مشعل راہ کی صورت میں موجود ہیں بات صرف اتنی سی ہے کہ ہمیں مسلکی تعصب فرقہ واریت عناد اور باہمی بغض کے بتوں کو پاش پاش کرنا ہو گا دین اسلام کو شدت پسندی کا محور بنانے والوں کا احتساب کرنا ہو گا افراط و تفریط کا راستہ چھوڑ کر اعتدال کا راستہ اختیار کرنا ہو گا اور امت مسلمہ کو درپیش مسائل کا ادراک رکھتے ہوئے اپنی دینی اور ملی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ہے اور خود کو بہترین امت ثابت کرتے ہوئے تمام دنیا کو دین اسلامی کے پرچم تلے اکھٹا کرنا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی ایک طریقہ ہے جو گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی کر سکتا ہے کیونکہ ہر انسان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ خود بھی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے اور دسروں کے دلوں کو بھی معرفت خداوندی سے منور کرے۔

(اللہ پاک ہمیں عمل کی توفیق نصیب فرمائے)

فہرست آیات قرآنی

نمبر شمار	آیت	آیت نمبر	صفحہ نمبر
۱.	﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَأَنذَرۡتَهُمۡ أَمۡ لَمۡ تُنذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُونَ ﴾	سورۃالبقرۃ:۲/ ۶	۲۲۴
۲.	﴿ وَٱدۡعُواْ شُهَدَآءَكُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ ﴾	سورۃالبقرۃ:۲/۲۳	۰۳
۳.	رَبَّنَا وَٱبۡعَثۡ فِيهِمۡ رَسُولٗا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُواْ عَلَيۡهِمۡ ءَايَٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلۡكِتَٰبَ وَٱلۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيهِمۡۖ------ ﴾	سورۃالبقرۃ:۲/ ۱۲۷، ۱۲۸،۱۲۶،۱۲۹	۱۰۰
۴.	﴿ إِذۡ قَالَ لَهُۥ رَبُّهُۥٓ أَسۡلِمۡۖ قَالَ أَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴾	سورۃالبقرۃ:۲/ ۱۳۱	۱۲۷
۵.	﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱسۡتَعِينُواْ بِٱلصَّبۡرِ وَٱلصَّلَوٰةِۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴾	سورۃالبقرۃ:۲/ ۱۵۳	۲۳۹
۶.	﴿ يُرِيدُ ٱللَّهُ بِكُمُ ٱلۡيُسۡرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ ٱلۡعُسۡرَ ﴾	سورۃالبقرۃ:۲/ ۱۸۵	۲۲۸
۷.	﴿ لَآ إِكۡرَاهَ فِي ٱلدِّينِۖ قَد تَّبَيَّنَ ٱلرُّشۡدُ مِنَ ٱلۡغَيِّۚ ﴾	سورۃالبقرۃ:۲/ ۲۵۶	۲۲۵
۸.	فَبُهِتَ ٱلَّذِي كَفَرَۗ وَٱللَّهُ لَا يَهۡدِي ٱلۡقَوۡمَ ٱلظَّٰلِمِينَ------﴾	سورۃالبقرۃ:۲/۲۵۸ ۲۵۸	۱۳۶
۹.	أَنَا۠ أُحۡيِۦ وَأُمِيتُۖ قَالَ إِبۡرَٰهِـۧمُ فَإِنَّ ٱللَّهَ يَأۡتِي بِٱلشَّمۡسِ مِنَ ٱلۡمَشۡرِقِ فَأۡتِ بِهَا مِنَ ٱلۡمَغۡرِبِ ﴾	سورۃالبقرۃ:۲/۲۵۸	۲۶۸
۱۰.	﴿ قُلۡ إِن كُنتُمۡ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِي يُحۡبِبۡكُمُ ٱللَّهُ. ﴾	سورۃ آل عمران:۳/ ۳۱	۱۱
۱۱.	﴿ كُنتُمۡ خَيۡرَ أُمَّةٍ أُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَأۡمُرُونَ بِٱلۡمَعۡرُوفِ ﴾	سورۃ آل عمران:۳/ ۱۱۰	۱۳
۱۲.	فَٱعۡفُ عَنۡهُمۡ وَٱسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَشَاوِرۡهُمۡ فِي ٱلۡأَمۡرِۖ ﴾	سورۃ آل عمران:۳/ ۱۵۹	۲۵۷
۱۳.	﴿ لَقَدۡ مَنَّ ٱللَّهُ عَلَى ٱلۡمُؤۡمِنِينَ إِذۡ بَعَثَ فِيهِمۡ رَسُولٗا مِّنۡ أَنفُسِهِمۡ ﴾	سورۃ آل عمران:۳/ ۱۶۴	۲۳
۱۴.	﴿ ٱلَّذِينَ قَالُوٓاْ إِنَّ ٱللَّهَ عَهِدَ إِلَيۡنَآ أَلَّا نُؤۡمِنَ	سورۃ آل عمران:۳/ ۱۸۳	۵۲

	لِرَسُولٍ حَتَّىٰ يَأْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ ٱلنَّارُ ۗ﴾		
۱۵.	﴿ لَتُبْلَوُنَّ فِىٓ أَمْوَٰلِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ مِن قَبْلِكُمْ ﴾	سورۃ آل عمران:۳/ ۱۸۶	۲۷۱
۱۶.	﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱصْبِرُوا۟ وَصَابِرُوا۟ وَرَابِطُوا۟ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴾	سورۃ آل عمران:۳/ ۲۰۰	۱۶۲
۱۷.	﴿ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِى ٱلْكِتَٰبِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ ءَايَٰتِ ٱللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا۟ مَعَهُمْ ﴾	سورۃ النساء:۴/ ۱۴۰	۲۱۹
۱۸.	﴿ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُۥٓ ﴾	سورۃ المائدہ:۵/ ۵۴	۲۵۴
۱۹.	﴿ مَّا عَلَى ٱلرَّسُولِ إِلَّا ٱلْبَلَٰغُ ۗ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ﴾	سورۃ المائدہ:۵/ ۹۹	۲۲۵
۲۰.	﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا ٱهْتَدَيْتُمْ ۚ ﴾	سورۃ المائدہ:۵/ ۱۰۵	۲۲۵
۲۱.	﴿ ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ وَجَعَلَ ٱلظُّلُمَٰتِ وَٱلنُّورَ ۖ ﴾	سورۃ الانعام:۶/۱	۰۶
۲۲.	﴿ وَإِذَا رَأَيْتَ ٱلَّذِينَ يَخُوضُونَ فِىٓ ءَايَٰتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا۟ فِى حَدِيثٍ غَيْرِهِۦ ۚ ﴾	سورۃ الانعام:۶/ ۶۸	۲۲۸
۲۳.	﴿ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ ٱلَّيْلُ رَءَا كَوْكَبًا ۖ قَالَ هَٰذَا رَبِّى ۖ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَآ أُحِبُّ ٱلْءَافِلِينَ ﴾	سورۃ الانعام:۶/ ۷۶	۱۲۵
۲۴.	﴿ فَلَمَّا رَءَا ٱلْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هَٰذَا رَبِّى ۖ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِى رَبِّى لَأَكُونَنَّ مِنَ ٱلْقَوْمِ ٱلضَّآلِّينَ ﴾	سورۃ الانعام:۶/ ۷۷	۱۲۵
۲۵.	﴿ فَلَمَّا رَءَا ٱلشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَٰذَا رَبِّى هَٰذَآ أَكْبَرُ ۖ ------﴾	سورۃ الانعام:۶/ ۷۸	۱۲۶
۲۶.	﴿إِنِّى وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِى فَطَرَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ	سورۃ الانعام:۶/ ۷۹	۱۰۶

	حَنِيفًا وَمَآ أَنَا۠ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ﴾		
۲۷.	﴿ وَلَوْ شَآءَ ٱللَّهُ مَآ أَشْرَكُوا۟ وَمَا جَعَلْنَٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا وَمَآ أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ ﴾	سورۃالانعام:۶/ ۱۰۷	۲۴۰
۲۸.	﴿ لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِۦ فَقَالَ يَٰقَوْمِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُۥٓ ﴾	سورۃالاعراف:۷/ ۵۹	۶۱،۸۰
۲۹.	﴿ قَالَ ٱلْمَلَأُ مِن قَوْمِهِۦٓ إِنَّا لَنَرَىٰكَ فِى ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ ﴾	سورۃالاعراف:۷/ ۶۰	۶۴،۸۶
۳۰.	﴿ أُبَلِّغُكُمْ رِسَٰلَٰتِ رَبِّى وَأَنصَحُ لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ ٱللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴾	سورۃالاعراف:۷/ ۶۱،۶۲	۸۵،۶۵،۷۰
۳۱.	﴿ أَوَعَجِبْتُمْ أَن جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوا۟ وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴾	سورۃالاعراف:۷/ ۶۳	۷۱،۷۶
۳۲.	﴿ قَالُوا۟ يَٰمُوسَىٰٓ إِمَّآ أَن تُلْقِىَ وَإِمَّآ أَن نَّكُونَ نَحْنُ ٱلْمُلْقِينَ ﴾	سورۃالاعراف:۷/ ۱۱۵	۱۰۸
۳۳.	﴿ ۞ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰٓ أَنْ أَلْقِ عَصَاكَ فَإِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ ﴾	سورۃالاعراف:۷/۱۱۷	۱۰۹
۳۴.	﴿ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ ٱسْتَعِينُوا۟ بِٱللَّهِ وَٱصْبِرُوٓا۟ إِنَّ ٱلْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهِۦ ﴾	سورۃالاعراف:۷/ ۱۲۸	۱۶۲
۳۵.	﴿ قَالَ رَبِّ ٱغْفِرْ لِى وَلِأَخِى وَأَدْخِلْنَا فِى رَحْمَتِكَ وَأَنتَ أَرْحَمُ ٱلرَّٰحِمِينَ ﴾	سورۃالاعراف:۷/ ۱۵۱	۱۶۷
۳۶.	﴿ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَٱلْأَغْلَٰلَ ٱلَّتِى كَانَتْ عَلَيْهِمْ ﴾	سورۃالاعراف:۷/ ۱۵۷	۲۲۸،۱۶۸
۳۷.	﴿ وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ٱللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ﴾	سورۃالاعراف:۷/ ۱۶۴	۲۰۹
۳۸.	﴿خُذِ ٱلْعَفْوَ وَأْمُرْ بِٱلْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ ٱلْجَٰهِلِينَ﴾	سورۃالاعراف:۷/ ۱۹۹	۲۳۶
۳۹.	﴿ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ ٱلْقَوْمِ ٱلْكَٰفِرِينَ------ ﴾	سورۃیونس: ۱۰/ ۸۴،۸۵،۸۶	۱۶۴

۴۰.	﴿ أَن لَّا تَعۡبُدُوٓاْ إِلَّا ٱللَّهَۖ إِنِّيٓ أَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ أَلِيمٖ ﴾	سورۃ ہود:۱۱/ ۲۶	۶۴
۴۱.	﴿ وَيَٰقَوۡمِ لَآ أَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مَالًاۖ إِنۡ أَجۡرِيَ إِلَّا عَلَى ٱللَّهِۚ وَمَآ أَنَا۠ بِطَارِدِ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْۚ ﴾	سورۃ ہود: ۱۱/ ۲۹	۷۶،۷۴
۴۲.	﴿ وَيَٰقَوۡمِ مَن يَنصُرُنِي مِنَ ٱللَّهِ إِن طَرَدتُّهُمۡۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴾	سورۃ ہود: ۱۱/ ۳۰	۷۷،۷۵
۴۳.	﴿قَالَ إِنَّمَا يَأۡتِيكُم بِهِ ٱللَّهُ إِن شَآءَ وَمَآ أَنتُم بِمُعۡجِزِينَ ﴾	سورۃ ہود:۱۱/ ۳۲،۳۳	۷۷،۶۷
۴۴.	﴿ وَلَا يَنفَعُكُمۡ نُصۡحِيٓ إِنۡ أَرَدتُّ أَنۡ أَنصَحَ لَكُمۡ إِن كَانَ ٱللَّهُ يُرِيدُ أَن يُغۡوِيَكُمۡۚ هُوَ رَبُّكُمۡ وَإِلَيۡهِ تُرۡجَعُونَ ﴾	سورۃ ہود: ۱۱/ ۳۴	۸۵
۴۵.	﴿ أَمۡ يَقُولُونَ ٱفۡتَرَىٰهُۖ قُلۡ إِنِ ٱفۡتَرَيۡتُهُۥ فَعَلَيَّ إِجۡرَامِي وَأَنَا۠ بَرِيٓءٞ مِّمَّا تُجۡرِمُونَ ﴾	سورۃ ہود: ۱۱/ ۳۵	۷۸،۶۸
۴۶.	﴿ وَٱصۡنَعِ ٱلۡفُلۡكَ بِأَعۡيُنِنَا وَوَحۡيِنَا وَلَا تُخَٰطِبۡنِي فِي ٱلَّذِينَ ظَلَمُوٓاْ إِنَّهُم مُّغۡرَقُونَ ﴾	سورۃ ہود:۱۱/ ۳۷	۶۹
۴۷.	﴿ وَيَٰقَوۡمِ ٱسۡتَغۡفِرُواْ رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوبُوٓاْ إِلَيۡهِ يُرۡسِلِ ٱلسَّمَآءَ عَلَيۡكُم مِّدۡرَارٗا﴾	سورۃ ہود: ۱۱/ ۵۲	۸۲
۴۸.	﴿ يَٰصَٰحِبَيِ ٱلسِّجۡنِ ءَأَرۡبَابٞ مُّتَفَرِّقُونَ خَيۡرٌ أَمِ ٱللَّهُ ٱلۡوَٰحِدُ ٱلۡقَهَّارُ﴾	سورۃ یوسف:۱۱/ ۳۹	۲۶۷
۴۹.	﴿ قُلۡ هَٰذِهِۦ سَبِيلِيٓ أَدۡعُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا۠ وَمَنِ ٱتَّبَعَنِيۖ وَسُبۡحَٰنَ ٱللَّهِ وَمَآ أَنَا۠ مِنَ ٱلۡمُشۡرِكِينَ ﴾	سورۃ یوسف:۱۲/ ۱۰۸	۲۸۲
۵۰.	﴿ فَٱصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَأَعۡرِضۡ عَنِ ٱلۡمُشۡرِكِينَ ﴾	سورۃ الحجر:۱۵/ ۹۴	۱۸۶
۵۱.	﴿ وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِي كُلِّ أُمَّةٖ رَّسُولًا أَنِ ٱعۡبُدُواْ	سورۃ النحل:۱۶/ ۳۶	۰۷

	ٱللَّهَ وَٱجۡتَنِبُواْ ٱلطَّٰغُوتَۖ ﴾		
۵۲.	﴿ بِٱلۡبَيِّنَٰتِ وَٱلزُّبُرِۗ وَأَنزَلۡنَآ إِلَيۡكَ ٱلذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُونَ ﴾	سورۃالنحل:۱۶/۴۴	۲۴،۲۳
۵۳.	﴿ ٱدۡعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِٱلۡحِكۡمَةِ وَٱلۡمَوۡعِظَةِ ٱلۡحَسَنَةِۖ وَجَٰدِلۡهُم بِٱلَّتِي هِيَ أَحۡسَنُۚ ﴾	سورۃالنحل:۱۶/ ۱۲۵	۲۱۶،۲۳۸،۱۹۸
۵۴.	﴿ وَلَا تَجۡعَلۡ يَدَكَ مَغۡلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبۡسُطۡهَا كُلَّ ٱلۡبَسۡطِ فَتَقۡعُدَ مَلُومٗا مَّحۡسُورًا ﴾	سورۃالاسراء:۱۷/۲۹	۲۸
۵۵.	﴿ وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُواْ ٱلَّتِي هِيَ أَحۡسَنُۚ إِنَّ ٱلشَّيۡطَٰنَ يَنزَغُ بَيۡنَهُمۡ ﴾	سورۃالاسراء:۱۷/۵۳	۱۹۹،۲۲۳
۵۶.	﴿ وَلَقَدۡ ءَاتَيۡنَا مُوسَىٰ تِسۡعَ ءَايَٰتِۭ بَيِّنَٰتٖ ﴾	سورۃالاسراء:۱۷/ ۱۰۱	۱۵۰
۵۷.	﴿ قَالَ ٱلَّذِينَ غَلَبُواْ عَلَىٰٓ أَمۡرِهِمۡ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيۡهِم مَّسۡجِدٗا ﴾	سورۃالکہف:۱۸/۲۱	۵۰
۵۸.	﴿ يَٰٓأَبَتِ إِنِّيٓ أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٞ مِّنَ ٱلرَّحۡمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيۡطَٰنِ وَلِيّٗا ------ ﴾	سورۃمریم:۱۹/ ۴۲،۴۳، ۴۵،۴۴	۱۲۸،۱۰۸
۵۹.	﴿ قَالَ سَلَٰمٌ عَلَيۡكَۖ سَأَسۡتَغۡفِرُ لَكَ رَبِّيٓۖ إِنَّهُۥ كَانَ بِي حَفِيّٗا ﴾	سورۃمریم:۱۹/۴۷	۱۳۰،۱۱۰
۶۰.	﴿ إِنَّنِيٓ أَنَا ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنَا۠ فَٱعۡبُدۡنِي وَأَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ لِذِكۡرِيٓ ﴾	سورۃطہ:۲۰/۱۴	۱۱
۶۱.	﴿ وَٱضۡمُمۡ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخۡرُجۡ بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوٓءٍ ءَايَةً أُخۡرَىٰ ﴾	سورۃطہ:۲۰/ ۲۲	۱۷۹
۶۲.	﴿ ٱذۡهَبۡ إِلَىٰ فِرۡعَوۡنَ إِنَّهُۥ طَغَىٰ ﴾	سورۃطہ:۲۰/ ۲۴	۱۵۰
۶۳.	﴿ قَالَ رَبِّ ٱشۡرَحۡ لِي صَدۡرِي ٥ وَيَسِّرۡ لِيٓ أَمۡرِي ٥ وَٱحۡلُلۡ عُقۡدَةٗ مِّن لِّسَانِي ٥ يَفۡقَهُواْ قَوۡلِي ------ ﴾	سورۃطہ:۲۰/ ۲۵،۲۶، ۲۸،۲۷	۱۷۶

۶۴.	﴿ إِنَّا قَدْ أُوحِىَ إِلَيْنَآ أَنَّ ٱلْعَذَابَ عَلَىٰ مَن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ------ ﴾	سورۃطہ:۲۰/ ۴۷،۴۸	۱۵۸
۶۵.	﴿ قَالَ فَمَن رَّبُّكُمَا يَٰمُوسَىٰ ﴾	سورۃطہ:۲۰ / ۴۹	۱۶۴
۶۶.	﴿ قَالَ رَبُّنَا ٱلَّذِىٓ أَعْطَىٰ كُلَّ شَىْءٍ خَلْقَهُۥ ثُمَّ هَدَىٰ ﴾	سورۃطہ:۲۰/ ۵۰	۱۶۵
۶۷.	﴿ قَالَ عِلْمُهَا عِندَ رَبِّى فِى كِتَٰبٍ ۖ لَّا يَضِلُّ رَبِّى وَلَا يَنسَى-- ﴾	سورۃطہ:۲۰/ ۴۹،۵۰،۵۱،۵۲	۱۶۷
۶۸.	﴿ قَالَ بَل رَّبُّكُمْ رَبُّ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ٱلَّذِى فَطَرَهُنَّ وَأَنَا۠ عَلَىٰ ذَٰلِكُم مِّنَ ٱلشَّٰهِدِينَ ﴾	سورۃالانبیاء:۲۱/۵۶	۱۱۶
۶۹.	﴿ وَتَٱللَّهِ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَٰمَكُم بَعْدَ أَن تُوَلُّوا۟ مُدْبِرِينَ ﴾	سورۃالانبیاء:۲۱/۵۷	۱۳۳
۷۰.	﴿ فَجَعَلَهُمْ جُذَٰذًا إِلَّا كَبِيرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ ﴾	سورۃالانبیاء:۲۱/۵۸	۱۳۴
۷۱.	﴿ قُلْنَا يَٰنَارُ كُونِى بَرْدًا وَسَلَٰمًا عَلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ ﴾	سورۃالانبیاء:۲۱/۶۹	۹۹
۷۲.	﴿ وَأَذِّن فِى ٱلنَّاسِ بِٱلْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ﴾	سورۃالحج:۲۲/۲۷	۱۰۱
۷۳.	﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى ٱلدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ﴾	سورۃالحج:۲۲/۷۸	۲۲۹
۷۴.	﴿ فَقَالَ ٱلْمَلَؤُا۟ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ مِن قَوْمِهِۦ مَا هَٰذَآ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَن يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ﴾	سورۃالمومنون:۲۳/۲۴	۸۷
۷۵.	﴿ أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا۟ ٱلْقَوْلَ أَمْ جَآءَهُم مَّا لَمْ يَأْتِ ءَابَآءَهُمُ ٱلْأَوَّلِينَ ﴾	سورۃالمومنون:۲۳/۶۸	۲۳
۷۶.	﴿ وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَٰكَ بِٱلْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ﴾	سورۃالفرقان:۲۵/۳۳	۲۳
۷۷.	﴿ أُو۟لَٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ ٱلْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا۟ وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَٰمًا ﴾	سورۃالفرقان:۲۵/۷۵	۲۴۳
۷۸.	﴿ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴾	سورۃالشعراء:۲۶/ ۲۳	۱۵۳
۷۹.	﴿ قَالَ رَبُّ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَآ ۖ إِن كُنتُم	سورۃالشعراء:۲۶/ ۲۴	۱۵۱

	مُّوقِنِينَ ﴾		
۸۰.	﴿ قَالَ إِنَّ رَسُولَكُمُ ٱلَّذِىٓ أُرۡسِلَ إِلَيۡكُمۡ لَمَجۡنُونٞ---- ﴾	سورۃالشعراء:۲۶/ ۲۵، ۲۷	۱۷۵
۸۱.	﴿ قَالَ فَأۡتِ بِهِۦٓ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ------﴾	سورۃالشعراء:۲۶/ ۳۰،۳۱	۱۷۸
۸۲.	﴿ فَأَلۡقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِىَ ثُعۡبَانٞ مُّبِينٞ ﴾	سورۃالشعراء:۲۶/ ۳۲	۱۷۹
۸۳.	﴿ وَنَزَعَ يَدَهُۥ فَإِذَا هِىَ بَيۡضَآءُ لِلنَّٰظِرِينَ ﴾	سورۃالشعراء:۲۶/ ۳۳	۱۷۹
۸۴.	﴿ فَأَوۡحَيۡنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰٓ أَنِ ٱضۡرِب بِّعَصَاكَ ٱلۡبَحۡرَۖ فَٱنفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرۡقٖ كَٱلطَّوۡدِ ٱلۡعَظِيمِ﴾	سورۃالشعراء:۲۶/ ۶۳	۱۵۴
۸۵.	﴿ وَٱتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَأَ إِبۡرَٰهِيمَ ﴾	سورۃالشعراء:۲۶/ ۶۹	۱۱۴
۸۶.	﴿ إِذۡ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوۡمِهِۦ مَا تَعۡبُدُونَ ﴾	سورۃالشعراء:۲۶/ ۷۰	۱۳۱
۸۷.	﴿ قَالُواْ نَعۡبُدُ أَصۡنَامٗا فَنَظَلُّ لَهَا عَٰكِفِينَ ﴾	سورۃالشعراء:۲۶/ ۷۱	۱۱۶
۸۸.	﴿ أَوۡ يَنفَعُونَكُمۡ أَوۡ يَضُرُّونَ ﴾	سورۃالشعراء:۲۶/ ۷۲،۷۳	۱۱۷
۸۹.	﴿ قَالُواْ بَلۡ وَجَدۡنَآ ءَابَآءَنَا كَذَٰلِكَ يَفۡعَلُونَ ﴾	سورۃالشعراء:۲۶/ ۷۴	۱۱۷
۹۰.	﴿ فَإِنَّهُمۡ عَدُوّٞ لِّيٓ إِلَّا رَبَّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴾	سورۃالشعراء:۲۶/ ۷۷	۱۳۳
۹۱.	﴿ رَبِّ هَبۡ لِي حُكۡمٗا وَأَلۡحِقۡنِي بِٱلصَّٰلِحِينَ وَٱجۡعَل لِّي لِسَانَ صِدۡقٖ فِي ٱلۡأٓخِرِينَ------﴾	سورۃالشعراء:۲۶/۸۴،۸۳	۱۱۹
۹۲.	﴿ إِذۡ قَالَ لَهُمۡ أَخُوهُمۡ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴾	سورۃالشعراء:۲۶/ ۱۰۶	۸۶
۹۳.	﴿ وَمَآ أَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ أَجۡرٍۖ إِنۡ أَجۡرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴾	سورۃالشعراء:۲۶/ ۱۴۵	۲۳۵
۹۴.	﴿ وَأَنذِرۡ عَشِيرَتَكَ ٱلۡأَقۡرَبِينَ ﴾	سورۃالشعراء:۲۶/ ۲۱۴	۱۸۶،۲۳۳
۹۵.	﴿ يَٰمُوسَىٰٓ إِنَّهُۥٓ أَنَا ٱللَّهُ ٱلۡعَزِيزُ ٱلۡحَكِيمُ ﴾	سورۃالنمل:۲۷/ ۹	۱۴۹
۹۶.	﴿فِي تِسۡعِ ءَايَٰتٍ إِلَىٰ فِرۡعَوۡنَ وَقَوۡمِهِۦٓۚ إِنَّهُمۡ كَانُواْ قَوۡمٗا فَٰسِقِينَ﴾	سورۃالنمل:۲۷/ ۱۲	۱۵۱
۹۷.	﴿ وَأَوۡحَيۡنَآ إِلَىٰٓ أُمِّ مُوسَىٰٓ أَنۡ أَرۡضِعِيهِۖ فَإِذَا خِفۡتِ	سورۃالقصص:۲۸/۷	۱۴۴

	عَلَيۡهِ فَأَلۡقِيهِ فِي ٱلۡيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحۡزَنِيٓۖ ﴾		
۹۸.	﴿ فَرَدَدۡنَٰهُ إِلَىٰٓ أُمِّهِۦ كَيۡ تَقَرَّ عَيۡنُهَا وَلَا تَحۡزَنَ وَلِتَعۡلَمَ أَنَّ وَعۡدَ ٱللَّهِ حَقّٞ ﴾	سورۃالقصص:۲۸/۱۳	۱۴۳
۹۹.	﴿ وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُۥ وَٱسۡتَوَىٰٓ ءَاتَيۡنَٰهُ حُكۡمٗا وَعِلۡمٗاۚ وَكَذَٰلِكَ نَجۡزِي ٱلۡمُحۡسِنِينَ ﴾	سورۃالقصص:۲۸/۱۴	۱۴۶
۱۰۰.	﴿ قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمۡتُ نَفۡسِي فَٱغۡفِرۡ لِي فَغَفَرَ لَهُۥٓۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلۡغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ﴾	سورۃالقصص:۲۸/۱۶	۱۶۷
۱۰۱.	﴿ قَالَ رَبِّ بِمَآ أَنۡعَمۡتَ عَلَيَّ فَلَنۡ أَكُونَ ظَهِيرٗا لِّلۡمُجۡرِمِينَ ﴾	سورۃالقصص:۲۸/۱۷	۱۶۷
۱۰۲.	﴿ إِنَّكَ لَغَوِيّٞ مُّبِينٞ ﴾	سورۃالقصص:۲۸/۱۸	۱۶۷
۱۰۳.	﴿ قَالَ يَٰمُوسَىٰٓ أَتُرِيدُ أَن تَقۡتُلَنِي كَمَا قَتَلۡتَ نَفۡسَۢا بِٱلۡأَمۡسِۖ ﴾	سورۃالقصص:۲۸/۱۹	۱۴۶
۱۰۴.	﴿ قَالَ يَٰمُوسَىٰٓ إِنَّ ٱلۡمَلَأَ يَأۡتَمِرُونَ بِكَ لِيَقۡتُلُوكَ فَٱخۡرُجۡ إِنِّي لَكَ مِنَ ٱلنَّٰصِحِينَ ﴾	سورۃالقصص:۲۸/۲۰	۱۵۳
۱۰۵.	﴿ وَمَآ أُرِيدُ أَنۡ أَشُقَّ عَلَيۡكَۚ سَتَجِدُنِيٓ إِن شَآءَ ٱللَّهُ مِنَ ٱلصَّٰلِحِينَ ﴾	سورۃالقصص:۲۸/۲۷	۱۴۷
۱۰۶.	﴿ يَٰمُوسَىٰٓ إِنِّيٓ أَنَا ٱللَّهُ رَبُّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴾	سورۃالقصص:۲۸/۳۰	۱۴۹
۱۰۷.	﴿ وَأَخِي هَٰرُونُ هُوَ أَفۡصَحُ مِنِّي لِسَانٗا فَأَرۡسِلۡهُ مَعِيَ رِدۡءٗا يُصَدِّقُنِيٓۖ إِنِّيٓ أَخَافُ أَن يُكَذِّبُونِ ﴾	سورۃالقصص:۲۸/۳۴	۱۷۳
۱۰۸.	﴿ وَلَقَدۡ أَرۡسَلۡنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوۡمِهِۦ فَلَبِثَ فِيهِمۡ أَلۡفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمۡسِينَ عَامٗا ﴾	سورۃالعنکبوت:۲۹/۱۴	۹۰

۱۰۹.	﴿ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِۦٓ إِلَّآ أَن قَالُوا۟ ٱقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ فَأَنجَىٰهُ ٱللَّهُ مِنَ ٱلنَّارِ ۚ ﴾	سورۃ العنکبوت:۲۹/۲۴	۱۳۵
۱۱۰.	﴿ ۞ وَلَا تُجَـٰدِلُوٓا۟ أَهْلَ ٱلْكِتَـٰبِ إِلَّا بِٱلَّتِى هِىَ أَحْسَنُ إِلَّا ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ مِنْهُمْ ۖ ﴾	سورۃ العنکبوت:۲۹/۴۶	۲۴۴
۱۱۱.	﴿ وَلَا تَسْتَوِى ٱلْحَسَنَةُ وَلَا ٱلسَّيِّئَةُ ۚ ٱدْفَعْ بِٱلَّتِى هِىَ أَحْسَنُ فَإِذَا ٱلَّذِى بَيْنَكَ وَبَيْنَهُۥ عَدَٰوَةٌ ﴾	سورۃ الصافات:۳۲/۳۴	۱۹۶
۱۱۲.	﴿ ٱلنَّبِىُّ أَوْلَىٰ بِٱلْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ ۖ وَأَزْوَٰجُهُۥٓ أُمَّهَـٰتُهُمْ ﴾	سورۃ الاحزاب:۳۳/ ۶	۲۵۳
۱۱۳.	﴿ وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ مِيثَـٰقَهُمْ وَمِنكَ وَمِن نُّوحٍ وَإِبْرَٰهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ٱبْنِ مَرْيَمَ ۖ ﴾	سورۃ الاحزاب:۳۳/ ۷	۰۸
۱۱۴.	﴿ وَمَآ أَرْسَلْنَـٰكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَـٰكِنَّ أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴾	سورۃ سبا:۳۴/۲۸	۲۲۳
۱۱۵.	﴿ قُلْ مَا سَأَلْتُكُم مِّنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۖ إِنْ أَجْرِىَ إِلَّا عَلَى ٱللَّهِ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ شَهِيدٌ ﴾	سورۃ سبا:۳۴/۴۷	۲۲۱
۱۱۶.	﴿ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ ٱلسَّعْىَ قَالَ يَـٰبُنَىَّ إِنِّىٓ أَرَىٰ فِى ٱلْمَنَامِ أَنِّىٓ أَذْبَحُكَ فَٱنظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۚ ﴾	سورۃ الصافات:۳۷/۱۰۲	۱۱۲
۱۱۷.	﴿ فَلَمَّآ أَسْلَمَا وَتَلَّهُۥ لِلْجَبِينِ ﴾	سورۃ الصافات:۳۷/۱۰۳	۱۱۲
۱۱۸.	﴿ قَدْ صَدَّقْتَ ٱلرُّءْيَآ ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِى ٱلْمُحْسِنِينَ --------﴾	سورۃ الصافات:۳۷/ ۱۰۴، ۱۰۵	۱۱۳
۱۱۹.	﴿ وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ ٱلْأُمُورِ ﴾	سورۃ الشوریٰ:۴۲/۴۳	۲۶۰
۱۲۰.	﴿ لِّتُنذِرَ أُمَّ ٱلْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾	سورۃ الشوریٰ:۴۲/۷	۱۸۶
۱۲۱.	﴿ فَٱصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُو۟لُوا۟ ٱلْعَزْمِ مِنَ ٱلرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ ۚ ﴾	سورۃ الاحقاف:۴۶/ ۳۵	۰۹

۱۲۲.	﴿ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ ٱلْقُرْءَانَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَآ ﴾	سورۃ محمد:۴۷/۲۴	۲۳
۱۲۳.	﴿ وَمِنَ ٱلَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَـٰرَ ٱلسُّجُودِ ﴾	سورۃ ق:۵۰/۳۹-۴۰	۲۵۰
۱۲۴.	﴿ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ أَنتَ بِمَلُومٍ o وَذَكِّرْ فَإِنَّ ٱلذِّكْرَىٰ تَنفَعُ ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴾	سورۃ الذریات: ۵۱/۵۴،۵۵	۲۴۱
۱۲۵.	﴿ ٱلرَّحْمَـٰنُ o عَلَّمَ ٱلْقُرْءَانَ خَلَقَ ٱلْإِنسَـٰنَ o عَلَّمَهُ ٱلْبَيَانَ --- ﴾	سورۃ الرحمن:۵۵/۱-۴	۲۴۴
۱۲۶.	﴿ لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا ٱلْمُطَهَّرُونَ ﴾	سورۃ الواقعہ:۵۶/۷۹	۵۱
۱۲۷.	﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ﴾	سورۃ الصف:۶۱/۲	۲۱۴
۱۲۸.	﴿ هُوَ ٱلَّذِى بَعَثَ فِى ٱلْأُمِّيِّـۧنَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا۟ عَلَيْهِمْ ءَايَـٰتِهِۦ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلْكِتَـٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ ﴾	سورۃ الجمعۃ:۶۲/ ۲	۱۵۵
۱۲۹.	﴿ وَلِلَّهِ ٱلْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِۦ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَـٰكِنَّ ٱلْمُنَـٰفِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴾	سورۃ المنافقون:۶۳/۸	۳۱
۱۳۰.	﴿ إِنَّآ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِۦٓ أَنْ أَنذِرْ قَوْمَكَ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾	سورۃ نوح:۷۱/۱	۷۲
۱۳۱.	﴿ يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ أَجَلَ ٱللَّهِ إِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۖ لَوْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ------ ﴾	سورۃ نوح:۷۱/ ۳،۴	۸۱
۱۳۲.	﴿ قَالَ رَبِّ إِنِّى دَعَوْتُ قَوْمِى لَيْلًا وَنَهَارًا ﴾	سورۃ نوح:۷۱/ ۵	۶۹
۱۳۳.	﴿ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِىٓ إِلَّا فِرَارًا ﴾	سورۃ نوح:۷۱/ ۶	۶۹
۱۳۴.	﴿ فَقُلْتُ ٱسْتَغْفِرُوا۟ رَبَّكُمْ إِنَّهُۥ كَانَ غَفَّارًا ﴾	سورۃ نوح:۷۱/ ۱۰	۸۲
۱۳۵.	﴿ وَجَعَلَ ٱلْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ ٱلشَّمْسَ سِرَاجًا ﴾	سورۃ نوح:۷۱/۱۶	۷۳
۱۳۶.	﴿ وَٱللَّهُ أَنۢبَتَكُم مِّنَ ٱلْأَرْضِ نَبَاتًا ﴾	سورۃ نوح:۷۱/ ۱۷	۸۹
۱۳۷.	﴿ وَٱللَّهُ جَعَلَ لَكُمُ ٱلْأَرْضَ بِسَاطًا ﴾	سورۃ نوح:۷۱/۱۹	۷۹
۱۳۸.	﴿ لِّتَسْلُكُوا۟ مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴾	سورۃ نوح:۷۱/ ۱۸-۲۰	۹۱

۱۳۹.	﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلۡمُدَّثِّرُ ٥ قُمۡ فَأَنذِرۡ ﴾	سورۃالمدثر:۷۴/۱-۲	۲۲۳
۱۴۰.	﴿ فَٱصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعۡ مِنۡهُمۡ ءَاثِمًا أَوۡ كَفُورٗا ------﴾	سورۃالدھر:۷۶/۲۴	۲۵۰
۱۴۱.	﴿ وَمِنَ ٱلَّيۡلِ فَٱسۡجُدۡ لَهُۥ وَسَبِّحۡهُ لَيۡلٗا طَوِيلًا ﴾	سورۃالدھر:۷۶/۲۵-۲۶	۲۵۱
۱۴۲.	﴿ هَلۡ أَتَىٰكَ حَدِيثُ مُوسَىٰٓ ٥ فَقُلۡ هَل لَّكَ إِلَىٰٓ أَن تَزَكَّىٰ ﴾	سورۃالنازعات:۷۹/ ۱۵،۱۶،۱۷،۱۸	۱۵۵
۱۴۳.	﴿ ٱذۡهَبۡ إِلَىٰ فِرۡعَوۡنَ إِنَّهُۥ طَغَىٰ ﴾	سورۃالنازعات:۷۹/۱۷	۱۷۱
۱۴۴.	﴿ عَبَسَ وَتَوَلَّىٰٓ فَأَنتَ عَنۡهُ تَلَهَّىٰ ------﴾	سورۃعبس:۸۰/۱-۱۰	۲۴۶
۱۴۵.	﴿سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنسَىٰٓ ﴾	سورۃالاعلیٰ:۸۳/۶	۲۰۵
۱۴۶.	﴿ وَنُيَسِّرُكَ لِلۡيُسۡرَىٰ ٥ فَذَكِّرۡ إِن نَّفَعَتِ ٱلذِّكۡرَىٰ ------﴾	سورۃالاعلیٰ:۸۷/۸،۹	۲۲۸
۱۴۷.	﴿ ٱقۡرَأۡ بِٱسۡمِ رَبِّكَ ٱلَّذِي خَلَقَ ٥ عَلَّمَ ٱلۡإِنسَٰنَ مَا لَمۡ يَعۡلَمۡ ------﴾	سورۃالعلق:۹۶/۱-۵	۲۰۵
۱۴۸.	﴿ إِذَا جَآءَ نَصۡرُ ٱللَّهِ وَٱلۡفَتۡحُ ٥ وَرَأَيۡتَ ٱلنَّاسَ يَدۡخُلُونَ فِي دِينِ ٱللَّهِ أَفۡوَاجٗا ٥ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَٱسۡتَغۡفِرۡهُۚ إِنَّهُۥ كَانَ تَوَّابَۢا ﴾	سورۃالنصر:۱۱۰/۱-۳	۲۱۱

فہرست احادیث

نمبر شمار	احادیث مبارکہ	کتب	صفحہ نمبر
۱	ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ"الصَّبْرُ عِنْدَ الْغَضَبِ وَالْعَفْوُ عِنْدَ الْإِسَاءَةِ فَإِذَا فَعَلُوهُ عَصَمَهُمْ اللَّهُ وَخَضَعَ لَهُمْ عَدُوُّهُمْ"كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ	صحیح بخاری	۲۶۲
۲	أَنَّ أَعْرَابِيًّا بَالَ فِي الْمَسْجِدِ فَقَامُوا إِلَيْهِ	صحیح بخاری	۲۷۵
۳	إِيَّاكُمْ وَالْجُلُوسَ فِي الطُّرُقَاتِ» قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ مَا لَنَا بُدٌّ مِنْ مَجَالِسِنَا نَتَحَدَّثُ فِيهَا، قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «فَإِذَا أَبَيْتُمْ ----	صحیح مسلم	۱۲
۴	آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلٰثٌ اِذَا حَدَثَ كَذِبَ وَ اِذَا وَعَدَ خَلَفَ وَ اِذَا أوتُمِنَ خَانَ	صحیح بخاری	۲۵۹
۵	بَشِّرُواوَلَا تُنَفِّرُواوَيَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُو	صحیح بخاری	۲۳۷
۶	ضَمَّنِي النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى صَدْرِهِ، وَقَالَ: «اللَّهُمَّ عَلِّمْهُ الحِكْمَةَ»	صحیح بخاری	۲۴
۷	قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «فِتْنَةُ الرَّجُلِ فِي أَهْلِهِ وَمَالِهِ وَجَارِهِ، تُكَفِّرُهَا الصَّلَاةُ، وَالصَّدَقَةُ، وَالأَمْرُ بِالْمَعْرُوفِ، وَالنَّهْيُ عَنِ المُنْكَرِ»	صحیح بخاری	۱۱
۸	لا تزرموةثم دعابدلومن ماءفصب عليه--------	صحیح بخاری	۲۵۷
۹	لعنة الله علیٰ اليهود والنصارىٰ اتخذو اقبور انبيائهم مساجد ---	صحیح بخاری	۵۰
۱۰	لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا، وَيُوَقِّرْ كَبِيرَنَا، وَيَأْمُرْ بِالمَعْرُوفِ وَيَنْهَ عَنِ المُنْكَرِ»: هَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ---	سنن ترمذی	۱۲
۱۱	مَثَلُ المُؤْمِنِ الَّذِي يَقْرَأُ القُرْآنَ كَمَثَلِ الأُتْرُجَّةِ، رِيحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا طَيِّبٌ، وَمَثَلُ المُؤْمِنِ الَّذِي لاَ يَقْرَأُ القُرْآنَ كَمَثَلِ التَّمْرَةِ، ------	صحیح بخاری	۲۵
۱۲	مَنْ دَلَّ عَلَى خَيْرٍ فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهِ	صحیح مسلم	۱۱
۱۳	وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ المُنْكَرِ أَوْ --	سنن ترمذی	۱۱
۱۴	وَيَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَلِينِي مَا شِئْتِ مِنْ مَالِي لَا أُغْنِي عَنْكِ -----	صحیح بخاری	۲۳۳

فہرست اعلام

نمبر شمار	اعلام	صفحہ نمبر
۱.	احمد غلوش	۴
۲.	تھامس واکر آرنلڈ	۴
۳.	حافظ ابن حجر	۲۴۷
۴.	راغب اصفہانی	۳
۵.	سلیمان ندوی	۱۹
۶.	شاہ ولی اللہ	۵۴
۷.	شبلی نعمانی	۲۰۷
۸.	شیخ علی محفوظ	۴
۹.	علامہ اقبال	۳۲۳
۱۰.	علی ہجویری	۲۶۵
۱۱.	غزالی	۲۸۳
۱۲.	فتح اللہ گولن	۲۷۱
۱۳.	فخر الدین رازی	۴۶
۱۴.	مائیکل ہارٹ	۲۱۴
۱۵.	مجدد الف ثانی	۷
۱۶.	محمد شفیع	۷۷
۱۷.	محمد کرم شاہ	۶۶

فہرست مصادر مراجع

القرآن الکریم

کتب تفاسیر:

- ابن کثیر، ابو الفداء عماد الدین، تفسیر ابن کثیر، نور محمد کارخانہ تجارت، آرام باغ کراچی، س۔ن
- اصلاحی، مولانا امین احسن تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن لاہور، پاکستان دسمبر، ۲۰۱۲ء
- الازہری، محمد کرم شاہ پیر، ضیاء القرآن، ضیا القرآن پبلی کیشنز لاہور مئی، ۲۰۱۱ء
- سعیدی، غلام رسول، علامہ تبیان القرآن، ادارہ دار العلوم نعیمیہ، کراچی، س،ن
- کیلانی، مولانا عبد الرحمن، تیسیر القرآن، مکتبہ السلام موہن پورہ، لاہور، ۱۴۳۵ھ
- محمد شفیع، مفتی، معارف القرآن، ادارۃ المعارف، کراچی، اکتوبر، ۱۹۹۱ء
- مودودی، سید ابو الاعلیٰ، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن پرائیویٹ، لاہور مارچ ۲۰۱۱ء

کتب احادیث :

- ابن ماجہ، محمد بن یزید القزونی، سنن ابن ماجہ، تحقیق وترجمہ، محمد فواد عبد الباقی، دار الفکر، بیروت، ۱۹۵۳ء
- بخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح بخاری، ابو عبد اللہ البخاری، دار ابن کثیر، بیروت، طبع چہارم ۱۶۰۸ھ
- ترمذی، محمد بن عیسیٰ ابو عیسیٰ ترمذی، سنن ترمذی، دار احیاء التراث العربی، بیروت
- مسلم، ابو الحسین مسلم بن حجاج القشیری النیشاپوری صحیح مسلم، دار القدس، ۱۶۳۲ھ

کتب لغات:

- ابراہیم مصطفی، المعجم الوسیط، مکتبہ رحمانیہ اقراسنز، اردو بازار، لاہور، س،ن
- ابن منظور، ابو الفضل جمال الدین افریقی مصری، محمد بن مکرم لسان العرب، دار مصادر بیروت، س،ن
- سرہندی، وارث، قاموس مترادفات، اردو سائنس بورڈ اپر مال، لاہور، اگست، ۱۹۸۶ء
- مولوی، الحاج مولوی فیروز دین، فیروز الغات، فیروز سنز لمیٹڈ، س،ن

دیگر کتب ورسائل:

- ابن تیمیہ، شیخ الاسلام احمد بن الحلیم ابن تمیمہ اصول تفسیر، المکتبہ السلفیہ، فروری، ۲۰۰۱ء
- ابن سعد، محمد بن سعد (مترجم علامہ عبد اللہ السماوی) طبقات ابن سعد، نفیس اکیڈمی روڈ، کراچی س۔ن
- ابن کثیر، ابو الفداء حافظ عماد الدین ابن کثیر دمشقی، (ترجمہ عطاءاللہ ساجد) قصص الانبیاء، دارالسلام، جدہ، ۱۹۸۹ء
- ابن کثیر، علامہ حافظ ابو الفداء عماد الدین بن کثیر، تاریخ ابن کثیر، نفیس اکیڈمی اردو بازار، کراچی، ۱۹۸۶ء
- ابن ہشام، ابو محمد جمال الدین عبد الملک بن محمد، (مترجم مولوی محمد انشاء اللہ خان) السیرۃ النبویہ، ابلاغ پبلشرز، لاہور ایڈیشن، ۲۰۰۳ء
- احمد خلیل جمعہ، نساء الانبیاء، نعمانی کتب خانہ سٹریٹ اردو بازار لاہور، ۲۰۰۱ء
- ارسلان بن اختر، دنیا میں اسلام کی روشنی، مکتبہ ارسلان، کراچی، ۱۳۶۵ھ
- اسرار احمد، ڈاکٹر، اللہ کا پیغام انسانیت کے نام، قاسم شہزاد، لاہور
- اسرار احمد، ڈاکٹر، منبع انقلاب نبویؐ، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور س۔ن

اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

- اصلاحی، امین احسن، حیات وافکار: ڈاکٹر اختر حسین عزمی زمزمہ، لاہور، ۱۹۸۶ء
- اصلاحی، امین احسن، دعوت دین اور اس کا طریقہ کار، فاران فاؤنڈیشن، لاہور ۲۰۰۸ء
- اصلاحی، امین احسن، مبادی تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن لاہور، اگست ۱۹۹۹ء
- اعظمی، فخر الاسلام، قرآن مجید کی تفسیریں چودہ سو برس میں، خدا بخش اور نیشنل پبلک لائبریری پٹنہ اشاعت ۱۹۹۵ء
- الازہری، محمد کرم شاہ، پیر، ضیاء النبی، ضیا القرآن، گنج بخش روڈ، لاہور س۔ن
- امیر علی، خان، حیات انبیاء کا انسائیکلوپیڈیا، مشتاق کارنر الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور ۱۹۹۰ء
- بلوچ، عبد العزیز، مفسرین عظام اور ان کی تفسیری خصوصیات، النور اکیڈمی سرگودھا، س۔ن
- بنت اسلام، داعی کے اوصاف، ادارہ بتول اکیڈمی سید پور روڈ، لاہور، ۱۹۹۳ء
- بھٹو، محمد موسیٰ، داعی اور دعوت کا کام، سندھ نیشنل اکیڈمی حیدر آباد، ۱۹۹۱ء
- بھٹی، ارشد ڈاکٹر، مطالعہ اسلامی تہذیب، مصباح آلاداب چوک، لاہور، س۔ن

- ٹی ڈبلیو ارنلڈ،(مترجم شیخ عنایت اللہ) دعوت اسلام، محکمہ مذہبی اوقاف پنجاب، ۲۰۰۳ء
- حافظ فضل الرحیم، مولانا، نوید حسین شاہ، سید، تبلیغ بالیقین کار نبوت ہے، مکتبہ الحسن، نوید پبلشرز اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۶ء
- حجازی، فخر الدین، تمدن انسانی پر انبیاء کے اثرات، مقبول اکیڈمی، شاہراہ قائداعظم، لاہور ۱۹۹۱ء
- حریری، غلام احمد، تاریخ تفسیر و مفسرین، ملک سنز پبلشرز، لاہور ۱۹۹۸ء
- خواجہ محمد سلام، قصص الانبیاء، اردو بازار، لاہور س۔ن ۱۸۷۶
- خورشید احمد، پروفیسر، خطبات مودودی، اسلامک پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۷۷ء
- دلاوری، ابو القاسم، سیرت کبریٰ، زمزمہ پبلیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء
- دہلوی، محمد عبد الحق محدث، مدارج نبوت، ممتاز اکیڈمی فضل الٰہی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
- زیدان، عبد الکریم، مترجم ساجد الرحمن کاندھلوی، اصول دعوت دین، شعبہ دعوت وارشاد ادارہ تحقیقات اسلام آباد س۔ن
- سبحانی، عنایت اللہ، محمد عربیؐ، مکتبہ ادب اسلامی لاہور، ۱۹۸۷ء
- سیوطی، علامہ جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، مطبعہ حجازی قاہرہ ۱۳۶۵ھ
- شازیہ رشید، تعلیمی نفسیات: جدران پبلی کیشنز، ٹاؤن شپ لاہور، ص ۱۳۱
- شاہ، سعید علی، قصص الانبیاء، شبیر برادرز، اردو بازار، لاہور
- شاہ، مظفر احمد، لطائف قرآنی، آکادمی بازیافت، مارچ، ۲۰۰۵ء
- شبلی، نعمانی، مولانا، سیرت النبیؐ، الفیصل ناشران و تاجران کتب، اردو بازار، لاہور ۱۹۹۱ء،ء
- شہاب، رفیع اللہ، پروفیسر، احکام القرآن میں تحریف کا ناقدانہ جائزہ، النور پرنٹرز اینڈ پبلیشرز، جولائی، ۱۹۹۱ء
- شوقی، ابو خلیل، ترجمہ حافظ محمد امین اطلس قرآن، تالیف، دار لسلام، جدہ، س۔ن
- صحافی، ابو مسلم، عصر حاضر اور اسلام، جمعیۃ المصنفین، لکشمی روڈ، لاہور، ۱۹۷۱ء
- صدیقی، نعیم، محسن انسانیت، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۴ء
- صدیقی، عبد القدیر، نصوص الحکم، ممتاز اکیڈمی، اردو بازار، لاہور، س۔ن

- عباسی، ابو الفضل محمد احسان اللہ عباسی الاسلام، نفیس اکیڈمی، کراچی
- عبد الرحمن، چوہدری، مفکر اسلام، سید ابو اعلیٰ مودودی،، ادارہ المعارف اسلامی، لاہور، ۱۹۹۱ء
- عبد البدیع صقر، (مترجم جاوید احسن فلاحی) ہم دعوت کا کام کیسے کریں، ہندوستان پبلی کیشنز دہلی، اپریل، ۱۹۸۲ء
- عبد الحی، ابو سلیم محمد دین کی خدمت، اسلامک پبلی کیشنز شاہ عالم مارکیٹ، لاہور، اپریل ۱۹۸۲ء
- عبد المجید، داعی اور دعوت کا انداز، بیت الحکمت لاہور، س۔ن
- عثمانی، مفتی تقی، اخلاقی خطبات، میمن اسلامک پبلیشرز لیاقت آباد، کراچی، ۱۹۹۸ء
- علوی، ڈاکٹر خالد، انسان کامل، الفیصل ناشران و تاجران، لاہور ۲۰۰۶ء
- علوی، ڈاکٹر خالد، خلق عظیم، الفیصل ناشران و تاجران لاہور، س-ن ۱۹۹۸ء
- علوی، ڈاکٹر خالد، اسلام کا معاشرتی نظام، مکتبہ قدوسیہ، لاہور، ۱۹۹۷ء
- عمری، سید جلال الدین، استدلال کی دعوت، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور
- عنصر صابری، محمدؐ کے غیر مسلم مداح و ثناخواں، دارالتذکیر، لاہور، ۲۰۰۱ء
- غلام رسول، چوہدری، سیرت سید البشرؐ، مکتبہ علم و عرفان لاہور، ۱۹۹۷ء
- غازی، محمد مشتاق، پروفیسر ڈاکٹر، پیارے رسولؐ کی پیاری سیرت، پبلشرز، کراچی
- فاروقی، برہان احمد، ڈاکٹر، قرآن مجید اور مسلمانوں کے زندہ مسائل، سروسز بک کلب، راولپنڈی، ۱۹۸۹ء
- فضل الٰہی، پروفیسر ڈاکٹر، دعوت دین کیسے دیں، قدسیہ اسلامک پریس اکتوبر، ۲۰۰۸ء
- فقیر محمد، اصول تفسیر و تاریخ تفسیر، ایور نیو بک پیلس، لاہور، ۱۹۸۹ء
- قادری، طاہر، پروفیسر ڈاکٹر، میثاق مدینہ کا آئینی تجزیہ، منہاج القرآن پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۱ء
- کاندھلوی، مولانا محمد زکریا، فضائل تبلیغ، مکتبہ البشریٰ، چودھری محمد علی پبلیشنرز، کراچی، ۱۹۸۶ء
- گل زادہ شیرپاؤ، فی فقہ الاولویات، (اردو ترجمہ) دین میں ترجیحات، لاہور، منشورات ۲۰۰۸ء
- گولن، محمد فتح اللہ، (مترجم محمد اسلام ہارمی) اسالیب دعوت اور مبلغ کے اوصاف پبلیشرز مین ڈبل روڈ ایف ٹین ٹو
- گوہر، خورشید عالم، علوم القرآن، فائن پبلیشنرز اردو بازار، لاہور، ۱۹۸۷ء
- گیلانی، ذوالفقار ارشد، تاریخ الانبیاء، علم دوست پبلشرز اردو بازار، لاہور، ۱۹۸۷ء

- گیلانی، سید اسد، مودودی بچپن جوانی بڑھاپا، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۰۶ء
- محمد امین، ڈاکٹر، مسلم نشاۃ ثانیہ،، بیت الحکمت لاہور ۲۰۰۳ء
- محمد جمیل احمد، انبیائے قرآن، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز
- محمد رفیق افضل، گفتار اقبال، ادارہ تحقیقات اسلامی، دانشگاہ پنجاب، لاہور جنوری ۱۹۶۹ء
- محمد زکریا، مولانا، فضائل اعمال، مکتبہ خلیل، لاہور، ۱۹۹۸ء
- محمد ظفر اقبال، مولانا، اہل ایمان کی ذمہ داریاں، بیت العلوم، انار کلی، لاہور، فروری ۲۰۰۹ء
- محمد عین الحق، دعوت وارشاد، ایورنیو بک پبلش اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۰ء
- محمد مسعود احمد، ڈاکٹر، گوشہ نشینی اور بعثت نبویؐ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
- محمد وسیم اکبر، ذرائع ابلاغ اور اسلام، پبلی کیشنز لمیٹڈ، کراچی، ۲۰۰۳ء
- مصری، عباس محمود العقاد، ابوالانبیاء حضرت ابراہیمؑ، نفیس اکیڈمی، اردو بازار، لاہور، ۱۹۸۶ء
- مفتی، مسعود، سفیران خدا اجل جلالہ،، خزینہ علم وادب مارکیٹ اردو بازار، لاہور، جنوری ۲۰۰۵ء
- منصور پوری، قاضی سلیمان رحمتہ اللعالمین، الفیصل ناشران تاجران کتب، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور ۱۹۹۱ء
- مودودی، ابوالاعلیٰ، اسلام کا نظام حیات، اسلامک پبلیشرز لاہور، ستمبر ۱۹۸۶ء
- مودودی، سید ابوالاعلیٰ، جماعت اسلامی کا مقصد تاریخ لائحہ عمل، شعبہ نشرواشاعت، جماعت اسلامی، لاہور، ۱۹۸۸ء
- مودودی، سید ابوالاعلیٰ، دعوت اسلامی اور اس مطالبات، اسلامک پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، منصورہ ملتان روڈ
- مودودی، سید ابوالاعلیٰ، سنت کی آئینی حیثیت،، لاہور، ۱۹۸۷ء
- نثار احمد، ڈاکٹر، عہد نبوی میں ریاست کا منشور وارتقاء، سنگ میل پبلیشنز، س۔ن
- النجار، محمد الطیب، ڈاکٹر، (ترجمہ رخسانہ جبین) سیرت سید المرسلین، مکتبہ تعمیر انسانیت غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور ۲۰۰۹ء
- ندوی، سید ابوالحسن، مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت، مجلس نشریات اسلام ناظم آباد کراچی، ۱۹۸۵ء
- ندوی، سید سلیمان، خطبات مدارس، زمزمہ پبلیکیشنز لاہور س۔ن
- ندوی، مولانا جلیل احسن، زادراہ، مکتبہ الھدیٰ کراچی، س۔ن

- ندوی، سید سلیمان، سیرت النبیؐ، مطبع اعظم گڑھ ۱۳۳۲ھ
- ندوی، شاہ معین الدین ندوی، تاریخ الاسلام، گلفراز احمد پبلشرز لاہور اپریل ۲۰۰۳ء
- نصیر احمد، ڈاکٹر، پیغمبر اعظم و آخر، فیروز سنز لمیٹڈ، راولپنڈی، ۱۹۸۸ء
- نیازی، ڈاکٹر لیاقت علی خان، جدید دور کے مسائل اور ان کے حل، سنگ میل پبلشرز لاہور
- وحید الدین، خان، مولانا، دین انسانیت، دارالتذکیر، لاہور، س۔ن
- وحید الدین، خان، مولانا، دعوت حق، دارالتذکیر، لاہور، ۱۹۹۰ء

رسائل و جرائد:

- ماہنامہ اشراق، تصنیفات اصلاحی کا اجمالی تعارف، محمد رفیع مفتی، جلد ۱۰ شمارہ ۲، جنوری، ۱۹۹۱ء
- ماہنامہ دعوۃ قرآن مجید اور دعوت تبلیغ، مولانا امیر الدین مہر جلد نمبر ۲، شماری اجون ۱۹۹۵ء دعوۃ اکیڈمی، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی پریس، اسلام آباد
- ماہنامہ دعوۃ، نوجوان نسل کو کیسے اسلام کے قریب لایا جائے، صفیہ سلطانہ صدیقی، شمارہ ۵ اکتوبر ۱۹۹۵ء، جلد نمبر ۵
- ماہنامہ اشتراق، تدبر قرآن، جاوید احمد غامدی، جنوری ۱۹۹۸ء
- ماہنامہ فکر و نظر، سید مودودی بحیثیت مفسر، ڈاکٹر خالد علوی، شمارہ ۵، اسلام آباد
- نقوش رسول نمبر، نبی بحیثیت مدبر اور ماہر سیاست دان، مولانا امین احسن اصلاحی، جلد سوم
- نقوش رسول نمبر، پیغمبر اسلام کا پیغام امن، زین العابدین، جلد سوم، اسلامک ریسرچ سنٹر، اسلام آباد

تحقیقی مقالہ جات:

دعوت و تبلیغ کی حکمت عملی، ڈاکٹر محمد سلیم دین، مقالات سیرت کانفرنس ۲۰۰۲ء شعبہ تحقیق مذہبی امور حکومت پاکستان، اسلام آباد